میرا گلگت و ہنزہ

سلمٰی اعوان

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

ان جذبوں کو سلام

جنہوں نے گلگت ایجنسی کو پاکستان کا ایک حصہ بنانے کا سوچا۔

سرفروشوں کے ان کارناموں کو سلام

جنہوں نے اس تصور کو عمل اور حقیقت کا روپ دیا۔

I vow to thee, my country ..
all earthly things above,
Entire and whole and perfect,
the service of my love,
The love that asks no question,
the love that stands the test,
that lays upon the altar the dearest and the best.

سلمیٰ اعوان کے فن میں ایک ایسا سحر ہے کوئی ایسا جادو ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے آخر دم تک جکڑے رکھتا ہے۔ سلمیٰ اعوان کے ہاں مشاہدے کی اتنی خوفناک گہرائی ہے کہ جو بھی کردار ان کے سامنے آتا ہے اس کے ظاہری خدوخال سے زیادہ وہ اس کے باطن کا ایسا ایکس رے لیتی ہیں کہ کوئی رگ، کوئی نس، کوئی ورید پوشیدہ نہیں رہتی۔ انسانی کرداروں کے علاوہ مناظر و ماحول کی تصویر کشی میں بھی مشاہدے کا یہ کمال ملتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی خوبی ہے جس کی ہمارے ادب میں صرف ایک مثال راجندر سنگھ بیدی ہی کی پیش کی جا سکتی ہے۔

سلمیٰ کا اسلوب رواں، پرکشش، شگفتگی اور اخلاص لیے ہوئے ہے۔ ان کے سفرنامے ''میرا گلگت و ہنزہ'' میں قدم قدم پر اپنایت و محبت کا جو اظہار تحریر کے ایک ایک لفظ سے چھلکا پڑتا ہے اس نے سفرنامے کو ادب پارہ بنا دیا ہے۔ یہ ادب پارہ اردو کی سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں مدتوں روشنی کے مینار کا کام کرتا رہے گا۔

احمد ندیم قاسمی

پیش لفظ

سفرنامہ نگاری میں تھامس جے کروممبسی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ادب کی اس صنف کواس نے اپنے منفرد اسلوب سے ایک نئی اور انوکھی جہت دی ہے۔ابن بطوطہ کو میں نے کروممبی کے حوالے سے پڑھا۔سچی بات ہے۔اس عظیم سیاح کی چوالیس ممالک پر پھیلی سیاحت نے مجھے سحرزدہ کردیا تھا۔

ایڈونچر سے معمور دونوں سیاحوں کی پر آشوب سیاحت دچودھویں اور بیسویں صدی کے تہذیبی موازنے قرون وسطٰی اوروسط ایشیا کے افسانوی شہروں کی داستانیں۔

میں دنوں نہیں مہینوں مضطرب رہی۔وسائل اور حالات کی کم مائیگی نے مجھے تڑپائے رکھا۔

اے کاش میں کروممبسی کی سفری ساتھی بن سکتی۔مردان خانوں سے آگے زنان خانوں کے دروازوں کے بند پٹ دھڑ سے کھول کراندر جا گھستی۔اس زندگی کی جھلک دیکھتی اوراس پر لکھتی کہ جس کے بغیر تہذیبی تاریخ ادھوری رہتی ہے۔

پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر لکھنے کے لئے میں گھروں کے بند دروازے کھول کر بہت اندر جا گھسی تھی۔

آج کا نقاد اگر سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو کتاب میں تہذیبی خوشبو کے ساتھ ساتھ ایک کٹھن اور ایڈونچر سے معمور سفر کی دستاویزی شہادت اسے ملے گی۔

ہاں مگر کل کا نقاد اس دور کی مخصوص مہک اور سچائی کی زیادہ بہتر طریقے سے گواہی دے گا۔

سلمٰی اعوان

باب:1

ذکر اُس پری وش یاسمین کا......
من اندر اِک آگ سی سلگے

سچ تو یہ تھا کہ اس شب میرے دل پر ایسی ہی چھری پڑی تھی جیسی سیمنٹ کی کسی دیوار پر تیز دھار کے چاقو چھری یا کسی چٹانی پہاڑ کے سینے پر الیکٹریکل ہلٹی سے پڑتی ہے۔

ایک اونچے فائیو سٹار ہوٹل کی رات کا وہ پہلا پہر کسی البیلی کشمیری حسینہ کی مانند جوان تھا۔جگمگاتی روشنیوں نے چہروں کا ایک ایک خم اور نقش واضح کر رکھا تھا۔ویٹنگ لاونج میں میرے دائیں ہاتھ بیٹھی تیں پینتیس کے چکر میں بل کھاتی ایک دل کش خاتون ''گیمبیا'' کے مشرقی حصے کے ''تا کی'' قبائل کے شادی بیاہ کی دلچسپ رسومات کا ذکر زور و شور سے کر رہی تھی۔بڑی کامیاب داستان گو نظر آتی تھی۔ہاتھوں اور آنکھوں کی حرکت سے ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ بارہ تیرہ کا ٹولہ پوری طرح اس کی گفتگو کے سحر میں جکڑا ہوا اپنی اپنی نشستوں پر سے گردنوں کو کندھوں سے آگے لڑھکائے افریقہ کے ملک ''گیمبیا'' کی داستان سن رہا تھا۔

بیان جاری تھا۔

''بالغ لڑکیوں کے گھر بسانے کے لئے ایک ایسی رات کا انتخاب کیا جاتا ہے جب آسمان پر نہ تو چاند ہو اور نہ ستارے،مطلع ابر آلود ہو،ہر سو خاموشی اور سکون ہو،کسی شخص کو آگ تک جلانے کی اجازت نہیں ہوتی''۔

جب اچانک ایک نوخیز لڑکی عقبی نشست سے اٹھ کر سامنے آئی۔شانوں پر لہراتے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے وہ جھکی۔سچی بات ہے وہ من وعین امریکی

فلم سٹار ''جوڈی فوسٹر'' کی مانند نظر آئی تھی ۔ وہی ناگن ''جوڈی فوسٹر'' جس کے عاشق صادق ''رچرڈسن'' نے صرف اسے متوجہ کرنے اور اپنی طرف مائل کرنے کے لئے صدر ''ریگن'' پر قاتلانہ حملہ کرڈالا تھا۔

اور میں نے بے اختیار اپنے آپ سے کہا تھا:''ارے صدر ریگن تو رہا ایک طرف ایسی لڑکی کے لئے تو لاکھوں قتل کئے جا سکتے ہیں''۔وہ آگے بڑھی ۔کمان جیسے ابروؤں کو اس نے ادائے ناز سے جنبش دی اور بولی ۔

''بھئی ہمارے تو اپنے ملک کے رسوم و رواج اتنے دلچسپ اور خوبصورت ہیں کہ آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے ۔وادی یاسین میں ''بو پھاؤ'' کا تہوار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''وادی یاسین''

ایک ماڈرن سی خاتون نے زیر لب کہا۔اس کی آنکھوں سے چھلکتی حیرت اس کی لاعلمی کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتا رہی تھی کہ وہ جاننا چاہتی ہے کہ یہ علاقہ کہاں واقع ہے؟

''کمال ہے ان پڑھی لکھی فیشن ایبل عورتوں پر ۔یہ اپنے ملک کے علاقوں سے بھی ناواقف ہیں''۔

پھر اُس نے لانبی گردن اوپر اٹھائی۔ کومل سی ناک کے نتھنے پھلاتے ہوئے بولی۔

''ہمارے لوگ بھی عجیب ہیں ۔حُسن فطرت اور سیاحت کے لئے یورپ اور امریکہ بھاگے جاتے ہیں اور نہیں جانتے ہیں کہ ان کے اپنے ملک میں ایسی خوبصورت اور دل آویز جگہیں ہیں ۔جنہیں غیر ملکی سیاحوں نے جنت نظیر کہا ہے ۔گلگت کی وادیاں اشکومن' یسین و نگر' ہنزہ' چٹور کھنڈ اور دیامر کی وادیاں' داریل اور تانگیر ۔خدا گواہ ہے انسان ان کے حسن کو دیکھ کر گنگ رہ جاتا ہے۔

وہ پل بھر کے لیئے رکی ۔چہرے پر یاس اور دکھ کے رنگ بکھیرتے ہوئے سلسلہ

کلام دوبارہ جوڑا۔

ان کی غربت اور مسائل جان کر بندہ بے اختیار سوچتا ہے کہ یہ ایک ترقی پذیر ملک کے علاقے ہیں۔ ''ملکہ ذہنی'' جیسے حسن کی مالک عورتیں اور ''سمیسن'' جیسے جری جوانوں کے اجسام کو لنڈے کے کپڑے بھی میسر نہیں۔ خواتین کی تنظیموں' سیاسی پارٹیوں' مذہبی راہنماؤں اور لکھاریوں کو ان علاقوں میں جانے اور وہاں کے بارے میں جاننے کی توفیق نصیب نہیں۔ اس لئے کہ انہیں تصویریں اتروانے اور چھپوانے' بیانات جاری کرنے اور پبلیسٹی حاصل کرنے کے نت نئے طریقوں کو پلان کرنے سے فرصت ہو تب نا۔

وہ دل کش اور خوبرو لڑکی جو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک جدیدیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اپنی سوچوں میں کس قدر محبِ وطن تھی۔ اس وقت ولیم ٹیل بنی ہاتھ میں کمان پکڑے طنز کے تیر پر تیر چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے تیروں کی بوچھاڑ سے کوئی اور زخمی ہوا یا نہیں یہ میں نہیں جانتی تھی پر میں چھلنی چھلنی ہوگئی تھی۔

اس چلبلی لڑکی نے میرے اندر کے مہم جو ادیب کو جگا ڈالا تھا۔ جو سالہا سال سے مصلحتوں کے تحت دل کے کسی گوشے میں سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ دراصل اٹھائیس سال تک پڑھنے اور ڈگریاں حاصل کرنے اور من موجی زندگی گزارنے کے بعد گھر بسانے کا فطری احساس ان سب جذبوں پر غالب آ گیا تھا۔ جس میں شہرت اور ناموری حاصل کرنے اور اپنے آپ کو ایک اچھے ادیب کے طور پر منوانے کے عزائم شامل تھے۔ میں عورت کی فطری جبلت کے ہاتھوں بے بس ہوگئی تھی اور عمر کی اس حد پر پہنچ کر یہ احساس بھی قوی ہوگیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب بقیہ عمر کنوارپنے کی نذر ہو جائے۔

اماں کے وظیفوں اور دعاؤں نے جس کے لڑ لگایا وہ بلاشبہ پیار کرنے کے قابل تھا۔ شیر افگن جیسا۔ پر گھر کی راجدھانی کے ظلِ سبحانی مہابلی کے سامنے پورا پورا گیدڑ تھا۔

ظلِ سبحانی دراصل پکے پکے لارڈ کلائیو تھے۔ وہی چہرہ مہرہ۔ ویسا ہی رنگ و روپ'

وہی انداز، وہی دبدبہ۔ مجھ جیسی اڑتی چڑیا پنجرے میں قید ہوگئی تھی۔ سسرال نے ناک میں نتھ نہیں نکیل ڈال دی تھی۔ جس نے ناک کے نتھنے چھوڑ پر اچھیں بھی چیر دی تھیں۔ سارے عزائم اور خواب چولھے پر پکتی ہنڈیا سے نکلتی بھاپ کی مانند فضا میں تحلیل ہوگئے تھے۔ عیار لومڑی کی طرح لمبے چوڑے گھر کے ایک کھڈے لگی اس کٹھن وقت کو جس میں ازدواجی زندگی کے تحفظ کا پڑہ ہو سکتا تھا، بچاتی دبا، پاؤں اندر ہی اندر مضبوط کرتی ماہ و سال اپنے اوپر سے گزارتی چلی جاتی تھی۔

''پری کلاس'' کی یہ پڑھی لکھی عورت جس کے اندر اپنے آپ کو منوانے اور شہرت حاصل کرنے کے جراثیم کو کڑے حالات کی اینٹی بائیوٹک دواؤں سے نڈھال ضرور ہوگئے تھے۔ پر ابھی مرے نہیں تھے اب دوبارہ زندہ ہو رہے تھے۔ وہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح ترقی پذیر کا ٹھپہ ماتھے سے پونچھ کر اسے ترقی یافتہ جیسے خوش رنگ جھومر سے سجانا چاہتی تھی۔

پر مصیبت تو یہ تھی کہ لڑ لگنے والا ایسا امن پسند تھا کہ زندگی کی رواں دواں ندی میں اُسے طغیانی چھوڑ ہلکے سے بھنور بھی پسند نہ تھے۔

ایک بار دورے پر کوئٹہ جا رہا تھا۔ میں نے بریف کیس تیار کیا۔ اسے پکڑایا اور کہا ''مجھے بھی ساتھ لے چلتے کوئٹہ نہیں دیکھا۔ دیکھ لیتی اسی بہانے''۔ اپنے اپ پر کلون کی بارش کرتے ہوئے لڑ لگنے والے نے گھوم کر یوں دیکھا جیسے میں پاگل ہوگئی ہوں۔

''تو تمہیں کہاں گھسیٹتا پھروں گا۔ میں تو وہاں کام بھی ڈھنگ سے نہ کر سکوں گا۔ دھیان تم میں ہی اٹکا رہے گا کہ کہیں کوئی رکشہ، ٹیکسی والا ہیر پھیر نہ کر جائے''۔

میں نے دھیرے سے کہا۔

''میں انجانی جگہوں، انجانے شہروں، ناواقف راستوں اور اجنبی لوگوں سے کبھی نہیں گھبراتی۔ ہمیشہ راستے نکال لیتی ہوں اور میرے ساتھ کبھی کوئی ہیرا پھیری نہیں ہوئی''۔

اور بریف کیس کو زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اس نے طنزاً کہا۔

''عجیب عورت ہو۔ یہاں اجنبی جگہ پر سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں دوروں سے جان بچاتا پھرتا ہوں مار سارا سکون غارت ہو جاتا ہے''۔

تب میں نے ہونٹوں کو بڑی گھوروئی سے نہیں سیا دھوئی سے سیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹوپے لگائے۔ اس لئے کہ میرے تلووں کے نیچے جو زمین تھی وہ ریتلی تھی اور میرے پاؤں سرک سرک جاتے تھے۔

اور جب ریتلی زمین موزائق کے فرش میں بدلی۔ اس وقت زندگی کے ازدواجی پہلو گلے گلے تک سیرابی پا چکے تھے۔ گھر کا سکون ڈسنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہواؤں میں اڑتی ابابیلوں کی طرح انجانے دیسوں کی طرف نکل جاؤں ''رائیڈر ہیگرڈ'' کے ''میکومیزن'' اور ''ہنسیں'' کا روپ دھارلوں۔ نئی جگہوں کے اسرار جانوں۔ ''ڈورتھی ڈکس'' بن جاؤں اور خوب خوب لکھوں۔

اب اندر اور باہر زوردار جنگ کا آغاز ہوا۔ ممتا اور گھرداری ٹانگوں کو اندر کی جانب گھسیٹ رہی تھی۔ اور کچھ بننے بنانے، لکھنے لکھانے کی آندھی پٹخ پٹخ کر دروازے کے باہر پھینکتی تھی۔

پھر اس شب میرے دل پر اس شوخ کنیا کی باتوں کے ہتھیار سے وہ چھری پڑی تھی۔ جس نے مجھے عملی قدم اٹھانے پر مجبور کردیا۔

شمالی علاقہ جات پر لکھنے کا منصوبہ ذہن نے بنایا۔ تو وہاں جانا شرط ٹھہرا۔ میرے تخیل کے گھوڑے ایسے کمزور، مریل اور لاغر سے ہیں کہ بیچارے مشاہدے اور تجربے کی خوراک کھائے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اپنے آپ کو تجربات میں سے گزارے بغیر میرے لئے کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے ماں دردوں کے بغیر بچہ جن دے۔

تب ایک دن میں نے اپنا پرانا اعتماد بحال کرتے ہوئے لڑ لگنے والے سے کہا۔

''میں شمالی علاقوں کی سیاحت کے لئے جانا چاہتی ہوں۔مجھے کچھ لکھنا ہے۔''
میاں کے ہونٹوں اور آنکھوں میں طنزیہ ہنسی ابھری تھی۔

''مشرقی پاکستان پر لکھنے کے لئے وہاں گئیں تو اسے بنگلہ دیش بنا دیا۔اب شمالی علاقہ جات کی شامت آگئی ہے۔خدا کے لئے رحم کھاؤ اس پر۔گھرہستن عورت بنو۔فضول میں کوڈون اسٹن، ڈریو اور منگمری جیسے مہم جوؤں اور کوہ پیماؤں کی روحوں کو شرمندہ کرتی پھرتی ہو''۔

ڈھیٹ بن کر مدعا پھر گوش گزار کیا۔اس بار لہجے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی جھلاہٹ تھی۔

''عجیب عورت سے واسطہ پڑا ہے۔ٹک کر رہنا دوبھر ہے۔کوئی پوچھے بھلا تم نے وہاں جا کر خشک اور بنجر پہاڑوں سے کون سے راز و نیاز کرنے ہیں''۔

سچی بات ہے، بھینس کے آگے بین بجانے والے محاورے کا صحیح اور عملی مفہوم اس دن میری سمجھ میں آیا تھا۔

باب:2

میچی لن اور اسکا بیڑہ ۔ جلکوٹ اور جلکوٹیے
شاہراہ ریشم اور اُس کا حسن و جمال

اس وقت جب صبح کا نور زمین اور آسمان پر ایک ملکوتی سی بارش کر رہا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ایک دوسرے سے جوڑے انہیں ناک کی پھننگی سے لگائے آنکھیں بند کئے اس سے راز و نیاز میں مصروف تھی جو مشرق و مغرب کا رب ہے۔ میری آنکھوں سے دو گرم گرم قطرے نکلے تھے اور انہوں نے ہاتھوں کی اندرونی جلد کو گرمی کا خفیف سا احساس دلایا تھا۔

میرے سر پر اس وقت اسلام آباد کے آسمان کی چھت تھی۔ میرے پیٹ میں اضطراب دبے چینی اور اندیشوں کے گولے ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ میں ابھی کل بچوں کے ساتھ اسلام آباد پہنچی تھی اور آج ایک بجے تن تنہا شمالی علاقوں کی سیاحت کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔

قصہ کچھ یوں تھا

ہماری راجباڑی کے ایک حصے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ماشاءاللہ سے دیور دیورانیوں اور ان کے بچوں سے بھرا پڑا کنبہ جب تین کمروں میں بمعہ سامان کے سمٹا اور اکلوتے باتھ روم کے سامنے قطاریں لگ گئیں تب میں نے مسکینی سے کہا۔

''تیرہ سال ہو گئے ہیں تمہارے پلے سے بندھے ہوئے۔ میری حالت تالاب میں ٹھہرے ہوئے کائی زدہ پانی جیسی ہے جو اب سڑاند مارنے لگا ہے۔ میکہ بھی کم بخت بالشت بھر کے فاصلے پر ہے۔ کہیں دور ہوتا تو چلو بندہ دس پندرہ دن ہی گزار آتا۔ تو ے پر

پڑی کواسی روٹی بھی جل جاتی ہے اگر اسے پرتا نہ دیا جائے۔ مجھے اسلام آباد چھوٹی خالہ کے ہاں جانا ہے۔

مگر......

میں نے اُسے لفظ ''مگر'' سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ میں جانتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ یہی کہ وہ میرے اور بچوں کے بغیر اداس ہو جائے گا۔

میرے سسرالی خاندان کے مردوں کا بیویوں کے بغیر ایک دن بھی گزارنا گویا قید با مشقت کی چکی پیسنا ہے۔ پر جہاں کہیں کوئی ملک عدم کی مسافر ہوئی۔ وہ دل کی مسند سے یوں اتری جیسے بدقسمت وزیر وزارتوں کی کرسیوں سے اترتے ہیں۔ بے چاری کا چہلم ابھی بیچ میں ہی اٹکا ہوتا ہے کہ نئی کو کھوجنے اور گھر لانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہو جاتی ہے۔

تین جولائی کو اسلام آباد پہنچی۔ بھاگ دوڑ کرنے سے پتہ چلا کہ گلگت' ہنزہ ہائی روڈ جانے کے لئے نیٹکو بس سروس سے سفر کرنا ہوگا۔ پہلی بس صبح چار بجے اور دوسری دن کے ڈیڑھ بجے روانہ ہوتی ہے۔

میرا پہلا پڑاؤ چلاس تھا۔ دوسری بس سے اگر سفر کیا جاتا تب پو پھٹے میں چلاس پہنچ جاتی۔

چھوٹی خالہ بہت جز بز ہو رہی تھیں۔

''کمبخت ابھی تو آئی ہو اور ابھی نئے محاذ پر نکل رہی ہو۔ وہ بھی تن تنہا' کوئی چھری تلے گردن آئی ہے تیری۔ کوئی بازو بیلنے میں آ گیا ہے۔

میں ہنسی۔

''بازو ہی تو بیلنے میں آ گیا ہے۔ ارے کیا کروں چھوٹی خالہ؟ ایک تو اس جذبہ حب الوطنی نے مار ڈالا۔ دوسرے خودنمائی اور منفرد بننے کے جذبات نچلا نہیں بیٹھنے دیتے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا والی بات ہو رہی ہے۔ رہی بات تنہا گھومنے پھرنے کی۔ ان

پڑھ والدین کا یہی فائدہ ہوا تو ہے مجھے کہ اپنی ذات پر اعتماد سیکھا۔اپنے کام خود کرنے کی عادت ڈالی ۔سہارے ڈھونڈنے اور ان کی محتاجی سے نفرت کی۔

ارے پڑھے لکھے والدین تو عذاب ہوتے ہیں۔اپنے تجربات میں سے بچوں کو گزرنے نہیں دیتے ۔پند و نصائح کے لٹھ ہر وقت ان کے چاروں طرف گھماتے رہتے ہیں اور بالآخر چڑیا گھر کے پنجروں میں بند شیروں جیسا بنا دیتے ہیں''۔

چھوٹی خالہ!میں نے لمبا سانس بھرا۔

''میں تو مارکو پولو کی سگی بھتیجی بننا چاہتی ہوں۔واسکوڈے گاما کی گدی نشین ہونا چاہتی ہوں ۔مجھے ہیون سانگ بننے کی آرزو ہے۔میں تھامس جے کروسی کے نقش قدم پر چلنے کی متمنی ہوں۔جس نے سیاحت کو نئے رنگ اور نئے انداز دیئے۔پر مجھے تو مار ڈالا اس کمبخت لڑ لگنے والے نے کہ جو کائل کے اچھلتے ناچتے شعلوں کی بجائے اس کی ٹھنڈی راکھ بن کر پڑا رہنا چاہتا ہے''۔

چھوٹی خالہ بٹر بٹر میرا منہ تکتی تھیں۔کسی زمانے میں وہ پوری قانگو کی کھوپڑی تھیں۔کیا مجال جو کسی کو بولنے دیں۔پر تب جب آتش جوان تھا۔

چند لمحوں بعد انہوں نے پھر یہ کہنا ضروری سمجھا تھا۔

''مجھے تو تمہاری تکلیف کا احساس ہے''۔

''ارے آپ نہیں جانتیں اسے۔بڑا من موجی بندہ ہے۔بچوں کی ہڑک اٹھی تو پل نہیں لگائے گا ہواؤں کے دوش پر اڑتا پل جھپکتے میں میرے سر پر آ کھڑا ہو گا اور ساتھ لے کر ہی ٹلے گا۔میں تو شکر گزار ہوں مولا کی کہ اس کا ذہن سیمنٹ بجری اور سریا میں الجھا۔

گیارہ بجے میں نے بیگ میں ایک جوڑا کپڑوں کا،ٹوتھ پیسٹ،دوربین اور تولیہ رکھا۔ڈائری اور پین پنسلوں کا جائزہ لیا۔ان مقامی لوگوں کے ایڈریس چیک کرنے کے بعد سنبھالے،جن کے گھر مجھے مختلف جگہوں پر ٹھہرنا تھا۔پیسے دھیلے کو اندر کی جیب میں

ٹھونسا۔اس کی زپ مضبوطی سے بند کی۔ قیمہ بھرے پراٹھوں کا لفافہ بھی رکھ لیا۔

اب ''میجی لن'' اپنے بیڑے کے ساتھ شمالی علاقوں کی سرزمین کے گرد چکر لگانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

بچے بڑے کمرے میں کھیل رہے تھے۔میں ان کے کمرے میں نہیں گئی۔میں نے ان کے منہ ماتھے بھی نہیں چومے اور نہ ہی انہیں خدا حافظ کہا۔گو میرا دل ایسا کرنے پر تڑپا تھا۔

صدر روڈ سے سوزوکی میں بیٹھی تو وسوسوں اور اندیشوں کی قطاریں دماغ میں فلم کے ان شیدائیوں کی طرح لگ گئیں جو کسی سپر ہٹ فلم کے ٹکٹ کے لئے سینما گھر کی کھڑکی کے سامنے ایک دوسرے کو دھکم پیل دینے میں مصروف ہوتے ہیں۔

کٹھن اور دشوار گزار راستوں اور جگہوں پر تن تنہا چوروں کی طرح جا رہی ہوں۔ کوئی ہرج مرج ہو گیا تو سسرال چھوڑ میکہ بھی بیچارے میاں کا طعنوں سے کلیجہ چھلنی کر دے گا۔

کسی کھڈ میں گر گرا گئی تو لاش کو کتے بلیاں نوچتے کھسوٹتے پھریں گے۔

بچے پیچھے چھوڑے جا رہی ہوں۔خدانخواستہ کوئی حادثہ جنم لے لے تو بچوں سے والہانہ پیار کرنے والا میاں منڈیا مروڑ کر رکھ دے گا۔

پیرودھائی کے اڈے پر نیٹکو بس سروس سے چلاس کے لئے ٹکٹ کٹوانے لگی تو اونچے کاؤنٹر پر بیٹھے ٹکٹ بابو نے موٹے شیشوں کی عینک سے یوں گھورا جیسے یا تو میں مفرور عورت ہوں یا پھر قتل ڈاکہ ڈال کر پہاڑوں کی کود میں پناہ لینے جا رہی ہوں۔

میں نے پل نہیں لگایا اور جانے کی غرض و غایت پر روشنی ڈال دی۔چلو اتنا ضرور ہوا کہ انداز دید میں تھوڑے سے احترام کے جذبات عود آئے اور یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ لہجے میں مٹھاس بھی گھل گئی ہے۔نرمی اور ملائمت تھی لہجے میں جب کہا۔

''دراصل یہ راستہ اتنا لمبا اور دشوار گزار ہے کہ مقامی عورتیں بھی بہت کم سفر کرتی ہیں۔آپ اکیلی ہیں دعا کیجئے کوئی خاتون آ جائے۔

میرا جی چاہا چیخ کر کہہ دوں کہ میرے ساتھ ہے ایک ساتھی ،جس کی حفاظت میں میں اپنے آپ کو سونپ کر چلی ہوں۔مگر جانے کیوں چپکی ہو رہی۔

ظہر کی نماز وہیں ایک کمرے میں پڑھی اور دعا کی۔

''پروردگار کوئی میرے جیسی جنونی غیر ملکی عورت ہی آ جائے''۔

لمبی چوڑی دعائیں مانگنے کے بعد جب باہر نکلی تو پتہ چلا کہ ایک لاہوری جوڑا سیر سپاٹے کے لئے گلگت اور ہنزہ جا رہا ہے۔میرا دل اس وقت گندراج کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔لڑکی کا نام جس کا عروج تھا۔مشہور افسانہ نگار ممتاز مفتی کی بھانجی تھی۔جہاز کا ٹکٹ نہ ملنے کے باعث شاید قدرت نے انہیں میری ہمراہی کے لئے اس طرف دھکیل دیا تھا۔

ڈیڑھ بجے بس چلی۔ٹیکسلا کی دوکانوں میں پتھر کی سجاوٹی اور خانہ داری سے متعلقہ اشیاء پر رنگین نقش و نگاری یوں بہار دکھلا رہی تھی جیسے کسی ریگستان میں کیکٹس کے پودے جلوے بکھیرتے ہیں۔

شاہراہ ہزارہ پر جگہ جگہ بنے پُل گاڑی کے پہیوں کے نیچے سے نکل نکل کر پیچھے بھاگتے رہے۔جلد ہی ہندکو بولنے والوں کا ہریالی اور شادابی میں ڈوبا ہوا ہری پور کا شہر آیا۔

میرے سامنے والی نشست پر ایک نوجوان نے سگریٹ سلگایا۔جلتی تیلی کو ہوا میں لہراتے ہوئے بجھایا اور بولا۔

''اس شہر میں کپڑے کے چھوٹے بڑے پچاس کارخانے' پاور ٹرانسفارمر اور بجلی کے سوئچ بنانے کا سب سے بڑا کمپلیکس' ماچس سازی کے چھ کارخانے اور ملک بھر کا کاوا سا کی موٹر سائیکل کے پرزے جوڑ کر اسے بنانے کا کارخانہ ہے۔ارے ایوب خان اس شہر کو بنا گیا ہے''۔

میں نے ان معلومات پر حیران ہو کر جلدی سے رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑک کے کنارے غریب اور مفلوک الحال لوگ جگہ جگہ مکئی کے بھٹے کوئلوں پر بھون رہے تھے۔ گندے مندے کپڑوں میں دیہاتی مرد اور عورتیں مریل اور لاغر سے گھوڑوں میں جُتے تانگوں میں بیٹھے تھے۔ بے شمار کارخانوں کا مالک ایک صنعتی شہر۔

بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاّ دبھی۔

ہری پور کا پرانا نام گل ڈھیری تھا۔ پشین بلوچستان سے آنے والے ترین قبیلے کے دورِ اقتدار میں کشمیر کے گورنر ہری سنگھ نلوہ نے اسے فتح کرنا چاہا پر ہزارہ پکلیا اور تربیلا کے مسلمانوں نے اسے شکست دی۔ لیکن جب رنجیت سنگھ نے گل ڈھیری پر قبضہ جما کر اسے ہری سنگھ کے حوالے کر دیا۔ تب اس نے اس کا نام ہری پور رکھا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ بھی بنایا۔ قلعے کے چاروں طرف پانی سے لبالب بھری خندق تھی۔ قلعہ میں آمدورفت کا واحد دروازہ لکڑی اور لوہے کا ایک پل تھا جو رات کے وقت اٹھا لیا جاتا تھا۔ یوں رات کو یہ ایک جزیرے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یہ قلعہ اب بھی موجود ہے۔

اس وقت میرا جی چاہا میں چھلانگ مار کر بس کے دروازے سے باہر کود جاؤں اور قلعہ دیکھ آؤں۔ پر افسوس تو یہ تھا کہ نہ تو میرے پاس سلیمانی ٹوپی تھی اور نہ جادو کا سرمہ جسے آنکھوں میں لگا کر اور ٹوپی پہن کر میں موجیں مارتی پھرتی۔

حویلیاں کا خوبصورت شہر گزر گیا۔

حویلیاں سے سولہ کلومیٹر آگے شاہراہ ریشم پر کیپٹن جیمز ایبٹ کے نام پر رکھا گیا ایبٹ آباد شہر سرسبز ٹہنیوں پر کھلے گلاب کی طرح ہنستا تھا۔ یہ چوک فوارہ، گلیات، کوہستان، گلگت، کشمیر و کاغان کی وادیوں کا صدر دروازہ ہے۔ ایبٹ آباد ائیر مارشل اصغر خان کا شہر ہے۔ شاید اسی لئے اس شہر کے درودیوار پر نعروں کا انداز بہت تیکھا اور شوخ ہے۔ سطح سمندر سے ۶۲۲۸ فٹ بلند یہاں کا مشہور پہاڑ کوہ سربن ایک ادبی حیثیت بھی رکھتا ہے

کہ شاعر مشرق نے بانگ درا میں اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا

کوہ سر بن کے عین نیچے "رش" کا خوبصورت میدان ہے جس کے سر سبز سینے پر مکان یوں لشکارے مارتے ہیں جیسے سبز قمیص کے دامن پر رنگا رنگ دھاگوں کی کشیدہ کاری۔

ایبٹ آباد سے پندرہ میل کے فاصلے پر مانسہرہ ہے جو مان سنگھ نامی ایک ہندو کے نام پر ہے۔اس کی تین تحصیلیں مانسہرہ، بٹ گرام، بالا کوٹ اور چوتھی متوقع تحصیل اوگی ہے۔ یہاں مہا تما بدھ اور اشوک کے زمانے کی تحریریں کندہ ہیں۔

میں کھڑکی سے گردن باہر نکالے تیزی سے گزرتے خاکی، دودھیا، گاندھیاں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی نظروں میں سمونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے دوربین بیگ سے نکالی اور آنکھوں سے لگا لی۔پکھلی کی حسین اور سرسبز وادی دیکھ کر میری آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئی تھیں۔کونش کا پر بہار خطہ یوں لگتا تھا۔جیسے جنت کے نظارے زمین پر اتر آئے ہوں۔

ڈوڈیال اور شنکیاری دونوں اہمیت کی جگہیں ہیں۔ ڈوڈیال میں مینٹل ہسپتال ہے۔اور شنکیاری نہ صرف فوجی چھاؤنی ہے بلکہ اہل قلم کا مرکز بھی ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک بوڑھا آدمی توے پر روٹیاں پکا رہا تھا جانے اپنے لئے یا اپنے بچوں کے لئے یا مسافروں کے لئے۔اس کی گرم گرم روٹیوں نے مجھے بھوک کا احساس دلایا۔

ڈاڈر کا گاؤں آیا۔ میں چونکی۔میری ایک دوست ٹی بی کی مریض بن کر یہاں آئی تھی اور اس ٹی بی کے خوبصورت ہسپتال کے ایک کمرے میں دم توڑ گئی تھی۔ڈاڈر کا نام سالوں میرے ذہن پر ٹھکتا رہا۔

اچھڑیاں، کوٹلی، قاضی آباد، آبل اور بٹل کے گاؤں گزرتے گئے۔ بٹل میں پہاڑوں کی رنگت کیسری تھی۔ بائیں ہاتھ گھاٹیوں میں اندھیرا تھا۔ دائیں ہاتھ کوہستان بٹل کے گھنے جنگلات دیودار، چیڑ اور پلار کے بلند و بالا درختوں کی چوٹیاں جو سورج کی سونا بکھیرتی کرنوں سے لدی پھندی تھیں۔

چھتر پلین کی وادی کافی اونچائی پر ہے۔ برف باری خوب ہوتی ہے۔ بٹ گرام میں دھوپ قدرے پھیکی پڑگئی تھی۔ اس وادی کے نظارے مجھے کسی عاشق کی طرح آنکھوں سے اشارے کرتے تھے کہ کہاں جاتی ہو؟ اتر آؤ نا یہاں ہمارے پاس۔ بٹ گرام تحصیل کا صدر مقام بھی ہے اسی لیے بیشتر دفاتر یہاں ہیں۔ پشتو اکثریت کی زبان ہے۔ ڈگری کالج بھی بن رہا ہے۔

دریائے سندھ موجیں مارتا رواں دواں تھا۔ سڑک کبھی پیچ کھاتی کسی پہاڑ کے سر پر جا پہنچتی اور کبھی بل کھاتی ہوئی نشیبی وادیوں میں آگے بڑھتی۔

بٹ گرام سے صرف گیارہ میل کے فاصلے پر تھاکوٹ کا عظیم الشان پل جو دنیا میں اپنی نوعیت کا تیسرا پل سمجھا جاتا ہے اب میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

یہاں گاڑی رک گئی تھی۔ میں، عروج اور اس کا میاں زمان اس پل کو دیکھنے کے لئے یوں گاڑی سے نکل کر بھاگے جیسے گاؤں کی دلہن کے ڈولے پر پھینکے جانے والے سکوں کو لوٹنے کے لئے بچے بھاگتے ہیں۔

فنی کاریگری کا منہ بولتا یہ پل دس ماہ کی قلیل مدت میں تیار ہوا تھا۔ دریائے سندھ کی چنگھاڑوں سے دل دہلا جاتا تھا پر پل کی جوانی اور اٹھان بھی غضب کی اثر انگیز تھی۔

ایک مقامی بوڑھا آدمی میرے پاس آ کر رک گیا۔ میری آنکھوں سے چھلکتی وارفتگی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''وہ بڑا گرم دن تھا جس دن سڑک کا افتتاح ہوا۔ پاکستان کے صدر فوجیوں اور

افسروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ڈھیر سارے چینی بھی تھے۔اس دن میلے کا سا سماں تھا۔میرا پوتا پیدا ہوا تھا اس دن"۔

مجھے ہنسی آئی۔یادداشت کی کڑیوں میں کیسی مماثلت تھی۔

شاہراہ ریشم کی تعمیر ۷ جنوری ۱۹۵۹ء میں شروع ہوئی اور بیس سال میں چوبیس ہزار پاکستانی اور چینی جوانوں کی مشترکہ کاوشوں سے تکمیل کو پہنچی۔ ۱۸ جون ۱۹۷۸ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اس کا افتتاح تھاکوٹ پل پر کیا۔چین کی نمائندگی نائب وزیر اعظم کنگ پیاؤ نے کی۔اس پل پر سے ۷۰ ٹن وزن گزارا جا سکتا ہے۔

میں ڈائری میں تفصیلات کو نوٹ کرنے میں جتی ہوئی تھی اور ڈرائیور ہارن پر ہارن دیئے جا رہا تھا۔

عروج چیخی۔

"اللہ کی بندی بس کرا ب دو گرنہ چھوڑ جائے گا تمہیں یہاں۔پھر دیدار کرتی رہنا ساری رات بیٹھ کر اس کا"۔

ہم دونوں بھاگیں۔

تھاکوٹ سے ذرا آگے دلائی اور اس سے آگے بشام۔یہاں پہنچ کر گاڑی بھی رک گئی اور رات بھی اتر آئی۔یہاں سے سوات نزدیک ہے۔نوعمر لڑکے سوات جانے والی گاڑیوں پر سوات سوات کا شور مچا رہے تھے۔سڑک کے کنارے ہوٹل تھے۔چائے پکتی اور روٹیاں دھڑا دھڑ لگتی تھیں۔میلے کچیلے کپڑوں میں حسین صورت لڑکے مسافروں کے آگے سالن کی پلیٹیں اور روٹیاں رکھتے تھے۔ہوٹلوں کے عقب میں دریائے سندھ کی موجوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

ایک بار نہیں دو بار نہیں دس بار بھی نہیں یقیناً دس ہزار بار میں نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ اس نے میری رفاقت کے لئے ایک عورت بھیج دی۔لمبی چوڑی گاڑی میں ہم دو کے

سوا تیسری کوئی آدھی عورت بھی نہ تھی۔بشام کے جس ہوٹل میں ہم نے پڑاؤ ڈالا تھا۔وہاں باتھ روم اللہ کی بنائی ہوئی کھلی زمین پر تھا۔کو کہنے کو تاریکی تھی پر کہیں کہیں چمکتی سفیدیاں یہ بتاتی تھیں کہ خیر سے یہاں فراغت کے چھوٹے بڑے مرحلے طے ہو رہے ہیں۔

میں نے چادر کی دیوار بنائی۔عروج اس کے زیر سایہ بیٹھی۔پھر وہی کام عروج نے کیا اور میں نے فائدہ اٹھایا۔

کھانے کی چھوٹی سی میز پورم پور گندگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔کرسیاں بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اب خود بوجھ بنی پڑی تھیں۔چھت کے پنکھے نے چلنے کی تہمت کا بار مفت میں اپنے کاندھے پر اٹھا رکھا تھا۔کمرے کا ایک چھوٹا سا ٹوٹا بھی اس کا زیر احسان نہ تھا۔

میں نے قیمہ بھرے پراٹھے نکالے۔عروج نے ماش کی دال اور گرم گرم تنوری روٹیاں منگوائیں۔اللہ جانے ماش کی دال پکانے کے نسخے ان نال ہوٹل والوں کے پاس کہاں سے آ گئے ہیں۔گھر گرہستن عورتیں بھی انگلیاں چاٹتی رہ جاتی ہیں۔

ابھی چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ چلو چلو کا شور مچ گیا۔کنڈیکٹر نے تین چکر لگائے اور ہارن نے یوں چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا جیسے خدانخواستہ ایئر ریڈ ہو گیا ہے۔

باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔مجھے حسرت ہوئی کہ اے کاش چاندنی رات ہوتی۔کہیں کہیں جگنو سے ٹمٹماتے تھے جو یہ بتاتے تھے کہ یہاں وادیاں ہیں اور گھروں میں بتیاں روشن ہیں۔ابھی صرف ۲۴۰ میل کا سفر طے ہوا تھا۔

میرے سامنے والی نشست پر بیٹھا ہی نوجوان اٹھا۔میرے پاس آیا اور بولا مجھے ذوالفقار کہتے ہیں۔آدمیرا تخلص ہے۔داسو میں متعین ہوں۔آپ کیا کسی اخبار سے ہیں؟

''ارے کہاں بھائی مجھے تو آوارہ گردی کا جنون اڑائے پھرتا ہے''۔

اُس نوجوان کی جوانی ان علاقوں میں گزر رہی تھی۔پولیس میں ہونے کے باوجود

ادب سے دلچسپی رکھتا تھا' تاریخ اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ یہاں کا چپہ چپہ اس کے قدموں تلے روندا ہوا تھا۔

اُس نے سگریٹ سلگایا۔ تیلی کو ایک بار پھر اسی انداز میں فضا میں لہرایا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

شاہراہ ریشم کا وہ حصہ جو بشام سے سازین تک ہے۔ قدرت کے حسین مناظر سے پر ہے۔ بشام سے ہربن تک دریائے سندھ کے دونوں جانب واقع علاقے کوہستانی کہلاتے ہیں۔ ہزاروں سال قبل جب سکندراعظم نے ٹیکسلا فتح کیا تو یہ علاقہ ٹیکسلا کا ایک حصہ تھا۔ چندر گپت اشوک اور راجہ رسالو نے مدتوں اس علاقہ پر حکومت کی۔

تیمور نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد اس علاقے کو ترکوں کے سپرد کر دیا۔ اسلامی حکومت کی بنیاد تبھی رکھی گئی۔ اس وقت یہ علاقہ ولایت پکھی کہلاتا تھا۔ ترکوں کے زوال کے بعد درانی غالب آ گئے۔ بعد میں نا اتفاقیوں کی وجہ سے ہزارہ پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن کوہستان کا علاقہ ان کے قبضے سے آزاد رہا۔ انگریزی دور میں بھی اس علاقے نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ آزادی پاکستان کے بعد پاکستان میں شامل ہو گیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اسے ضلع کا درجہ دیا گیا۔

یہاں کے لوگ دلیر اور جری ہیں۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف کے لوگوں کی اکثریت شین ذات پر مشتمل ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ رسم و رواج عادات واطوار اور آداب و معاشرت میں یک رنگی کے باوجود زبانیں اس قدر مختلف ہیں کہ ایک دوسرے کی زبان نہ بول سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ ان شنیوں کا تعلق عرب قریش سے بتایا جاتا ہے جو سقوط سندھ کے بعد ہندوؤں کے ظلم وستم سے بھاگ کر قبائلی علاقوں میں آئے اور پھر کوہستانی علاقوں میں پھیل گئے۔ پشتو دونوں طرف کے لوگوں کے رابطے کی زبان ہے۔

ایک دلچسپ بات آپ کی اطلاع کے لئے

اس نے سگریٹ کا زوردار سوٹا لگایا نتھنوں سے دھواں خارج کیا اور پھر بولا۔

سندھ کے آر پار رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔مغربی جانب کے لوگ مشرقی جانب کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ اور دینی ہیں۔دین کے بڑے بڑے جید علماء نے یہاں جنم لیا ہے۔لوگ خوبصورت اور دراز قامت ہیں۔ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔

ہاں یاد رکھیئے جلکوٹ کبھی مت جائیں۔

جلکوٹ کے باشندے بہت سنگ دل اور سفاک ہیں۔کسی کو قتل کرانا یا کرنا ان کے لئے معمولی بات ہے۔جب کوئی مسافر ان کے گاؤں سے گزرے تو اسے لوٹے بغیر نہیں چھوڑتے۔ایک معمولی ٹوپی کی خاطر بھی قتل کر دیتے ہیں۔قتل کرنے کے بعد مینار جیسے تین منزلہ مکان میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔یہ مکان گھڑی کہلاتا ہے۔

ویسے ایک قابل ذکر بات ہے۔اس نے غالباً خوف کی پرچھائیں میرے چہرے پر رینگتی ہوئی محسوس کر لی تھیں۔بچوں اور عورتوں پر یہ لوگ ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

میں نے اپنے کانوں کو چھوا۔چھوٹی چھوٹی چار ماشے کی مرکیاں میں اتار آئی تھی۔ننگے بچے ہاتھ،کان میرے پاس تھا کیا؟

پھر بھی مجھے جھر جھری سی آ گئی۔نوجوان بولتے بولتے ابھی تھکا نہیں تھا۔یوں اب دریا کا مشرقی علاقہ ضلع ہزارہ اور مغربی حصہ ضلع سوات کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔قانون کا مکمل نفاذ عمل میں لایا گیا ہے اور علاقے میں قتل و غارت کی گرم بازاری میں بہت حد تک کمی آ گئی ہے۔

پچھلی نشست پر کوئی گھٹیا برانڈ کا سگریٹ پی رہا تھا۔دھوئیں کے مرغولے بھک بھک کرتے اس کے منہ سے نکل کر فضا میں گھٹیا اور ناگوار بو پھیلا رہے تھے۔عروج ناک

سکوڑتے ہوئے اس کی طرف یوں دیکھتی تھی جیسے اسے گردن سے پکڑ کر کھڑکی کے راستے سالم باہر پھینک دینا چاہتی ہو۔وہ میری تاریخ دانی سے بھی عاجز نظر آ رہی تھی۔

میرا اپنا دل بھی حمل کے کچے دنوں کی طرح متلانے لگا تھا۔

میں نے کھڑکی کا پورا شیشہ کھول دیا۔بلند و بالا پہاڑوں کی صورت پر ہیبت جنوں اور دیوؤں کی سی نظر آتی تھی۔وادیوں کا سارا حسن تاریکی نگلے بیٹھی تھی۔

نوجوان نے اپنا رخ سیدھا کر لیا تھا۔وہ اب آنکھیں بند کئے غالباً سونے کی کوشش میں تھا۔گاڑی کے سارے مسافروں کی گردنیں دائیں بائیں جھولتی تھیں۔عروج بھی اپنے میاں کے شانے پر سر رکھے آنکھیں موندھے ہوئے تھی۔میاں بھی اونگھ رہا تھا۔ بھری گاڑی میں غالباً میں واحد مسافر تھی جو کیل کی طرح سیٹ میں گڑی ہوئی تھی۔

میرے سارے سریر میں خوف اور دہشت یوں جذب ہو رہی تھی جیسے ریگستانی سیگا رو پانی اپنے اندر جذب کرتا ہے۔

تیسرا کلمہ میری زبان پر تھا۔ہر پندرہ منٹ بعد میں خود اللہ کے حضور کسی مظلوم کی طرح کھڑا کر دیتی۔

''بھلا جیسی بھی جنونی اور احمق ہوں پر ہوں تو تیری بندی۔''

بس اب تیز رفتاری سے پٹن کی طرف رواں دواں تھی۔بشام سے چھبیس میل آگے پٹن اور تقریباً چورانوے میل چلاس۔میرے سفر کی پہلی منزل۔

میں خوف اور اندیشوں کی گھمن گھریوں میں الجھی ہوئی تھی۔کیونکہ بس کو رات کے تین یا ساڑھے تین بجے وہاں پہنچ جانا تھا۔

رات کی تاریکی۔انجان جگہ'شہر سڑک سے ڈیڑھ دو میل کی بلندی پر۔

''پروردگار میں اوکھلی سر دئے بیٹھی ہوں۔موسلوں سے بچانا اب تیرا کام ہے''۔

پیرودہائی اڈے پر مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ بس پو پھٹے چلاس پہنچے گی۔لیکن ڈرائیور

کی بیٹی کے ہاں گلگت میں بارہ سال بعد بچے کی ولادت ہوئی تھی اور وہ اُسے دیکھنے کی خوشی میں ایکسیلیٹر کو معمول سے زیادہ دبائے جا رہا تھا اور مجھ جیسی پردیسن کا پیٹ اہوا جا تا تھا۔

یقیناً دعا قبول ہو گئی تھی کیونکہ جسم کا ہر مواس کے حضور رتنا کھڑا تھا۔ کومیلا میں گاڑی خراب ہو گئی۔ مسافروں کو نیچے اتار دیا گیا۔

میں اور عروج بند دوکانوں کے سامنے پڑے بینچوں پر بیٹھ گئیں۔ رات نہ صرف سیاہ تھی بلکہ ڈراؤنی بھی تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر پولیس کا سپاہی بیٹھا ڈنڈے سے کھیل رہا تھا۔ میں نے اس سے مزید معلومات حاصل کرنی چاہیں۔

''یہاں بچے بچیوں کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟''

''صفر''

اس کے لہجے میں رکھائی بھی تھی اور رعونت بھی۔

گورنمنٹ یہاں ہر بچے کو ماہانہ وظیفہ دیتی ہے کہ کسی طرح یہ لوگ پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیں۔ انہیں بھیڑ بکریاں چرانے سے فرصت ملے تب پڑھیں گے نا۔ اور ہاں لڑکیوں کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟

میں نے اپنی تاریخ دانی کی کتاب کو بستے میں باندھ دیا۔ کیونکہ اس کے پھڑ پھڑاتے صفحے مجھے کچھ نہ کچھ جاننے پر اکساتے تھے اور پاس بیٹھا مقامی آدمی بڑا روایتی جان پڑتا تھا۔ اس کے ہاں عورت کو سوال جواب کی اجازت نہیں تھی۔

گاڑی کی مرمت میں ڈھائی گھنٹے لگے۔ پائی باغ، لٹر، شتیال اور رشہ نالہ تاریکی میں ہی گزر گئے۔ دیو قامت ننگے بچھے پہاڑوں کی چوٹیاں سپید نظر آنے لگی تھیں۔ اس سپیدی کو دیکھ کر میرا دل ایسی طمانیت سے سرشار ہوا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

چلاس اب زیادہ دور نہیں تھا۔ تھور نالہ سے صرف اٹھارہ میل کا فاصلہ تھا اور تھور نالہ پل جھپکتے میں آیا چاہتا تھا۔ میں بار بار گھڑی کو دیکھتی تھی۔ بالآخر ڈرائیور سے کہہ بیٹھی۔

''اگر آپ جلدی کریں تو مجھے چلاس میں صبح کی نماز مل سکتی ہے''۔

اس اللہ کے بندے نے فوراً گاڑی ایک نالے کے پاس روک دی۔ ہوائیں گرم اور تیز تھیں۔ نالے کا پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ وضو کیا اور دور جا کر ٹیلے کے پیچھے نماز ادا کی۔ حقیقتاً سرور اور سپردگی کی ایسی کیفیت نماز میں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

میرا پہلا پڑاؤ چلاس تھا۔ میرے چھوٹے چچا ایک طویل عرصہ یہاں ملازمت کے سلسلے میں رہے تھے اور یہاں کے مقامی لوگوں کے نام ان کے خط میرے پاس تھے۔ چلاس کے چاندنی ہوٹل کے سامنے گاڑی رکی۔ سب مسافر بھی چائے پانی کے لئے اتر گئے۔ عروج سے میں نے ان کے گلگت میں قیام کا پتہ پوچھا۔ ہنستے ہوئے بولی۔

''یار کسی سستے سے ہوٹل میں تلاش کر لینا''

☆☆☆

باب:3

چلاس : دیامر کا ایک اہم شہر
نانگا پربت کے جلوے۔ چلاس قلعہ۔
جدوجہد آزادی گل جان اور اس کا محبوب

لوگوں کی بات نہیں پر میری ضرور ہے کہ زندگی میں بہت سی تشنہ آرزوئیں اور ادھوری خواہشیں ایسی بھی رہیں جن کی تھمسن گھیریوں میں غوطے کھاتے اور الجھتے ان کے پورا ہونے کا تصور ہمیشہ محال نظر آیا۔خدا غریق رحمت کرے جناب فضل کریم فضلی کو اور عمر دراز دے قرۃ العین حیدر کو کہ اول الذکر نے نہایت تفصیلاً اور موخر الذکر نے قدرے مختصر کنچن چنگا کے حسن و جمال کے نقشے یوں کھینچے ہیں کہ انہیں پڑھ پڑھ کر میں نے بے اختیار نیلی چھت والے سے گلہ کیا۔

''واہ مولا مجبور و بے بس اشرف الخلوق بنا کر احسان کا ٹوکرہ سر پہ دھر دیا ہے۔ مرغ زریں ہی بنا دیتا کہ تیرے جلوے تو دیکھتا''۔

چلاس کا شہر شاہراہ ریشم سے خاصی بلندی پر ہے۔چاندنی ہوٹل میں جب مسافر ناشتہ کر رہے تھے میں نے ہوٹل والے سے بات کی جس نے ایک نوعمر لڑکے کو جگایا جو کرائے پر سوزوکی چلاتا تھا۔بیس روپے کے عوض وہ مجھے لے جانے پر آمادہ ہوا۔

سوزوکی نے رخ پھیرا۔ذرا فاصلے پر شنگریلا تھا۔ائر مارشل اصغر خان کے چھوٹے بھائی بریگیڈئر اسلم کا شنگریلا ہوٹل۔شمالی علاقہ جات میں ان مہنگے شنگریلا ہوٹلوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔خاص طور پر شنگریلا بلتستان نے۔

دفعتاً میں نے اپنے دائیں ہاتھ دیکھا۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کنچن چنگا سورج

کی اولین کرنوں میں ہنستی ہو اور کہتی ہو کہ خواہشیں اور آرزوئیں اگر سچی طلب رکھتی ہیں تو کسی نہ کسی روپ میں ضرور پوری ہوتی ہیں۔

میں نے ڈرائیور لڑکے کی طرف دیکھا۔

اس نے میری آنکھوں سے چھلکتے سوال کا مفہوم سمجھا اور بولا۔

''یہ نانگا پربت ہے۔استور اور چلاس کا درمیانی پہاڑ۔دنیا کی چھٹی اونچی چوٹی جس کی بلندی ۸۱۲۶ میٹر ہے''۔

میں سوزوکی سے نیچے اتر آئی تھی۔

ڈرائیور لڑکا بولے جا رہا تھا۔میرے کان بند ہو گئے تھے۔ہونٹ سل گئے تھے۔آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔اس وقت چلاس کے پہاڑوں سے ٹکرا کر جو ہوائیں لوٹتی تھیں وہ تیز بھی تھیں اور گرم بھی۔نانگا پربت کی برف کے پیرہن پہنے چوٹیاں جن پر سورج کی طلائی کرنیں کیسے کیسے دلفریب نقش و نگار بنا رہی تھیں۔مجھ پر جذب کی گہری کیفیت طاری تھی۔جی چاہتا تھا وجود کی قید سے آزاد ہو کر ان کے سینے پر چڑھ دوڑوں۔حسن فطرت کی شراب اس فیاضی سے بہہ رہی تھی کہ میری آنکھیں پی پی کر سیراب ہونے کی بجائے مزید پیاسی ہو رہی تھیں۔

ڈرائیور چھوکرہ پاس آ کر بولا۔

''اب چلئے نا۔میں نے واپس بھی آنا ہے''۔

میں نے نگاہوں کا رخ پھیرا۔آسمان کی نیلی وسعتوں سے زمین کی خاکستری پنہائیوں میں آئی سونیوال کوٹ کی بستی شاہ بلوط کے جھومتے سبز درختوں کے درمیان کھڑی تھی۔دوربین کی آنکھیں مجھے چھوٹی چھوٹی تفصیلات سنانے لگی تھیں۔مثلاً گھروں کے آنگن سونے تھے۔خاصی گنجان وادی تھی، پر زندگی کی جیتی جاگتی علامت دھواں تین چار گھروں کے سوا کہیں سے نہیں اٹھ رہا تھا۔ڈھور ڈنگر بھی نظر نہیں آتے تھے اور انسان بھی کم

وحشی نظروں کی زد سے باہر تھے۔چند بوڑھوں نے ضرور اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ گلیوں اور گھروں میں اچھلتے ناچتے بچوں کی عدم موجودگی تشویشناک تھی۔

میں نے خود سے کہا تھا۔''ملک میں امن و امان کی صورت حال اطمینان بخش ہے۔لہٰذا میرے خیال کے مطابق مردوں کے لام پر جانے اور عورتوں اور بچوں کے ادھر ادھر ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں۔''

میں نے لڑکے سے اس ویرانی کا سبب پوچھا۔

پتہ چلا کہ چلاس چونکہ سارے شمالی علاقوں میں سب سے زیادہ گرم ہے۔گرمیاں شروع ہوتے ہی یہاں کے لوگ ٹھنڈی جگہوں پر چلے جاتے ہیں۔یہ بستی جواب شاہین آباد کہلاتی ہے۔موسم گرما کے آغاز میں ہی گئی داس اور نیاٹ کے نالوں میں چلی گئی ہے۔

بات سمجھ میں آجائے تو سر کا ہلنا فطری امر ہے۔میں بھی ہلتے سر کے ساتھ آکر سوزوکی میں بیٹھ گئی۔

لڑکے نے سوزوکی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

نانگا پربت کو مقامی لوگ دیامر کہتے ہیں۔ہماری زبان میں اس کے معنی ہیں پریوں کے رہنے کی جگہ۔یہ بات مشہور ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر پریاں رہتی ہیں۔اب لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ سب غلط باتیں ہیں۔

میں نے نانگا پربت کے حسن کو پھر دیکھا اور لڑکے سے کہا۔

''ارے غلط کیوں ہیں؟حسن و رعنائی کے خیالی یا حقیقی پیکر ایسی دل آویز جگہوں پر نہ رہیں گے تو کیا پنڈی بھٹیاں کے چک نمبر ۸۸ کی روڑیوں پر ڈیرے ڈالیں گے''۔

لڑکا کھلکھلا کر ہنسا۔بات شاید اس کے دل کو لگی تھی۔

میرے سامنے بٹوگاہ کے کنارے واقع ایک اور آبادی تھی۔چلاس بازار تھوڑا سا اونچائی پر ہے۔بٹوگاہ چلاس کا مشہور نالہ ہے۔چلاس کے اکثریتی قبیلے بٹو کے لوگ یہاں

آباد ہیں۔ اکثریت شین ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تاریخ کی قدیم ترین بستی ہے۔ بٹو کوٹ کی بستی بھی ویران نظر آ رہی تھی۔ لڑکا بتا رہا تھا کہ بیشتر لوگ اس مال مویشیوں کے ساتھ بٹو گاہ کی چراگاہوں میں چلے گئے ہیں۔ وہاں مکئی کی فصل کاٹ کر اکتوبر میں واپس آئیں گے۔

اللہ۔ اب میں اس ساری جان سے لرزی تھی۔ یہاں تو بستیاں ویران پڑی ہیں۔ جن کی مہمان بننے جاری ہوں وہ بھی اگر ٹھنڈی ہوائیں کھانے اپنے گرمائی مستقر گئے ہوئے ہوں تو میرا کیا بنے گا؟

بہر حال دل کو سمجھایا کہ اب گھبرانا کیسا؟ اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں سے کیا ڈر؟ چلاس کا بازار آیا۔ اونچے اونچے موڑ آئے۔ ٹیڑھی میڑھی گلیاں۔ چھوٹی سی عمر کا لڑکا کس مہارت سے گاڑی چلاتا تھا۔ ہر موڑ پر میرا دل ڈوب جاتا کہ بس اب گاڑی الٹی کہ الٹی لیکن خیریت رہی اور ہسپتال روڈ کے عین مقابل ایک کھلے سے میدان میں اس نے مجھے اتارتے ہوئے کہا۔

''لیجیے وہ سامنے آپ کے میزبانوں کا گھر ہے۔''

ابھی میں نے زمین پر قدم رکھ کر چلاس کی ہوا کا ناک کے نتھنوں سے ایک زور دار کش لیا ہی تھا کہ میرے دائیں بائیں بچوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ چمکتے دمکتے چہروں والی چھوٹی چھوٹی بچیاں جنہوں نے ایرانی جرسی کے سبز اور سرخ پھولوں والے میلے کچیلے سوٹ پہن رکھے تھے۔ اوڑھنیاں سروں پر تھیں اور بالوں کا رنگ واضح نہیں ہو رہا تھا۔ سرخ و سفید چہروں پر زکام کے پیلے لیس دار مادے سے لتھڑی ناکوں والے لڑکے جن کے نقش و نگار ان خدوخال سے مختلف تھے جن کے بارے میں میں نے پڑھا اور سنا تھا۔

اپنے اردگرد اس پر رونق میلے کو دیکھ کر مجھے خوشی کا احساس ہوا تھا۔ دل کو ڈھارس بندھی کہ چلو کچھ لوگ تو ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بہت سے سرکاری ملازمین اور کاروباری

گھرانے ابھی یہیں ہیں۔

تبھی میرے میزبان آنکھوں میں حیرت واستعجاب کے رنگ لئے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ڈاکٹر ناموس کی کتاب کا ایک خالص شین چہرہ کتابی صفحات سے نکل کر میرے سامنے آ گیا ہو۔ چھ فٹی قامت ،کھڑی ناک پر ذرا عمودی،موٹی آنکھوں کی رنگت اودے اور نیلے رنگ کے بین بین،رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں لیکن گال پچکے ہوئے۔چہرہ سرخ وسفید اور باریش۔

انہیں شاید کسی نے اطلاع دے دی تھی۔ میں نے اپنا تعارف اپنے چچا کے حوالے سے کروایا۔بہت خوش ہوئے۔

ان کے پیچھے پیچھے چلتی گھر میں داخل ہوئی۔گزرگاہ کے ساتھ مردانہ بیٹھک جس کا دروزہ صاحب خانہ نے کھولا تو لکڑی کی چھت کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ فرش بھی چوبی نظر آیا۔ چلاس کی وادیاں داریل اور تانگیر جنگلات کا گھر ہیں۔مکان میں لکڑی کا استعمال فراخدلی سے ہوتا ہے۔نشست گاہ آنگن سے تین زینے نیچی تھی۔صحن کے ایک طرف بادام کا درخت کچے پھل کے ساتھ پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسری طرف کائل کی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔آنگن سے ذرا اونچا برآمدہ اور آگے دو کمرے جن پر کسی اجڑی بیوہ کا گمان پڑتا تھا۔ ہاں البتہ دیواروں پر لٹکتی بیش قیمت بندوقیں چلاسی لوگوں کی جنگویانہ ذہنیت کی عکاس تھیں۔

بلوری آنکھوں والی خاتون خانہ بیٹی جنے بیٹھی تھی۔پتہ چلا کہ گھر والوں نے تو بابو سر چلے جانا تھا بس اس زچگی نے روک دیا۔اب کل پرسوں کی تیاری تھی۔

میں نے دل میں کہا: ’’چلو شکر ہے۔لڑکی بھاگوان ہے ،وگرنہ میں کہاں خجل خوار ہوتی‘‘۔

گھر پر خوشحالی اور رزق کی فراوانی تھی۔ پر صفائی ستھرائی اور سلیقہ جیسی خوبیوں کی

تنگی تھی ۔چودہ سالہ جوان بیٹی گلاب کا مہکتا پھول تھی جس کی مسحور کن خوشبو نے اندر باہر کے سارے گند پر ایک پردہ سا ڈال دیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر میں نے چارپائی کی پٹی سے نیچے لٹکتی ٹانگوں کو اوپر کیا۔ دیوار سے ٹیک لگائی اور اپنے میزبان کی طرف دیکھا جو مقامی ٹوپی سر سے اتارے اپنے خشخشی بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے ۔ان کا خیال تھا کہ میں تھوڑا سا آرام کر لوں ۔

مجھے آرام کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتی تھی ۔شہر کے مضافات میں گھومنے کی متمنی تھی ۔وقت کے ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھانا میرا منتہائے مقصود تھا۔ میں جو گھر میں تھوڑا سا کام کرنے کے بعد ہمیشہ شکست خوردہ کھلاڑی کی طرف ہانپ کر بیٹھ جاتی تھی ۔اب اٹھارہ گھنٹے کے طویل اور صبر آزما سفر کے بعد بھی راج پری پیکر کی طرح صعوبتوں کے اکھاڑے میں کودنے اور شہ زوری دکھانے کے لئے تازہ دم تھی ۔

صاحب خانہ نے اپنی پتولہ سی حسین بیوی پر ایک نظر ڈالی ۔پھر نگاہوں کا رخ میری سمت کیا اور بولے ۔

’’آپ کو یقیناً یہ تو پتہ چل گیا ہوگا کہ شنا یہاں کے اکثریتی لوگوں کی زبان ہے ۔ شنا بولنے والے لوگ دراصل دار دیا ڈرد ہیں اور نسلاً آریائی ہیں ۔آریا قوم دس پندرہ صدی قبل از مسیح وادی سندھ میں فاتح بن کر آئی ۔انہوں نے ’’جلکوٹ اور گور‘‘ کے درمیانی علاقے میں رہنا شروع کیا۔ان کا وہ گروہ جو اپنے طور طریقوں ،رسم و رواج پر قائم رہا ’’شین‘‘ کہلایا ۔لیکن وہ لوگ جو اردگرد پھیل گئے اور جنہوں نے مقامی لوگوں سے شادیاں کیں ۔اپنا رنگ انہیں دیا اور کچھ ان کا رنگ خود لیا ۔یشکن بنے ۔کمی اور ڈوم کمتر ذاتیں ہیں ۔

شین اس علاقے کی سب سے اونچی اور ممتاز قوم ہے ۔ہم دونوں شین ہیں ۔
انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور آنکھوں سے بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

صاحب خانہ نے آخری جملہ کو دھیمے انداز میں کہا تھا لیکن اس میں تفاخر کی جو لہریں موجیں مار رہی تھیں۔ وہ مجھ سے چھپی نہ رہی تھیں۔

باہر کوئی ملنے والا آیا تھا۔ میرے میزبان اٹھ کر چلے گئے۔ میں کمرے سے نکل کر آنگن میں آئی۔ دھوپ کی تیزی اور اس کا پہاڑوں اور میدانوں پر بکھری دوپہر کی مانند تھا۔ لیکن ابھی صبح تھی اور میری گھڑی نو بجا رہی تھی۔

برآمدے کی دیوار کے ساتھ لوہے کے چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ یہ چولہا عجیب ساخت کا تھا۔ آگے پیچھے کا سلسلہ یوں پھیلا ہوا تھا کہ چولہے کے منہ میں جلتی لکڑیوں کی آگ تیسری دیگچی تک پہنچ رہی تھی۔ پتیلوں اور دیگچی میں جانے کیا کیا پک رہا تھا؟

میں قریب جا بیٹھی۔ گلاب کے پھول نے ہنستی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نام پوچھا۔

''گل جان بیگم۔''

ایسی معصوم اور بھولی بھالی صورت کے لئے کیسا بھاری بھرکم نام تھا۔

میں کھڑی ہوگئی کیونکہ گل جان بیگم نے مجھے پیشکش کی تھی کہ ''آؤ تمہیں اپنا باغیچہ دکھاؤں۔''

نشست گاہ کے دروازے سے اتارا گیا دس پوڈوں کا چھوٹا سا چوبی زینہ گھر اور باغیچے میں رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ ناشپاتی' سیب' خوبانی کے درختوں کی ٹہنیاں اور انگور کی بیلیں پھولوں کے بار سے جھکی پڑتی تھیں۔ اس دلفریب نظارے کو دیکھ کر میرے چہرے اور آنکھوں سے خوشی کی کرنیں پھوٹی تھیں۔ کیونکہ میدانی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ہم لوگ تو قدرت کے ان انمول عطیات کو ان کے حسن کے ساتھ دیکھنے کی سعادت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

پر میری قسمت کہ میرے ذہن و دہن کو للچاتا پھل ابھی کچا تھا۔ پکا پھل تو ختم ہو

چکا تھا۔اگر کہیں کوئی نا نواں نا نواں دانہ نظر آ تا تھا تو اسے توڑنے کے لئے یقیناً میں لولی لنگی ہونے کا رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔

سوانچل (ساگ) اور منڈیا (چائنا پالک) کی کیاریوں میں ابھی گل جان نے پاؤں دھرا ہی تھا جب اس کی پکار پڑی۔ وہ اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی الٹے پاؤں بھاگی۔ پتہ چلا کہ گوشت تیز آنچ سے جل گیا ہے اس کی بُو نے چارپائی پر بیٹھی زچہ ماں کو اٹھنے اور پکارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں اب چلاس کے گردونواح کا چکر لگانے اور قبل از تاریخ وہ چٹانی مجسمے اور پتھروں کے ہتھیار دیکھنے کا سوچ رہی تھی جن کی وجہ سے چلاس خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

اس خواہش کا اظہار جب کمرے میں موجود صاحب خانہ سے کیا گیا تو بے چارے نے گھبرا کر ایک بار زمین کو دیکھا دوسری بار بیوی کو اور تیسری بار مجھے۔پھر قدرے تذبذب سے بولا۔

''بی بی دراصل ان علاقوں میں عورت کا یوں پھرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے''۔

''چلو یہ اچھی ایکٹویٹی رہی۔جان جوکھوں میں ڈال کر گویا میں ان کا گھر دیکھنے اور کھانے کھانے ہی تو یہاں آئی ہوں''۔

بہر حال میں نے غصے پر قابو پایا اور ہنس کر کہا۔

''میں آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت مند ہوں۔اتنا کٹھن سفر......انہوں نے فوراً میری بات کاٹ دی۔

''چلیئے میں کچھ کرتا ہوں''۔وہ باہر نکل گئے۔تھوڑی دیر بعد اندر آئے مجھے بتایا۔

''ابھی باہر میرا بھتیجا آیا تھا۔اسے میں نے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔وہ ابھی آ رہا ہے۔اس کے ساتھ چلاس کے مضافات میں گھوم آیئے۔باقی رہے تاریخی مجسمے،

دراصل یہ مختلف جگہوں پر ہیں۔دریا پار ایک وادی تھلپن ہے۔تھور اور ریگچی میں بھی سننے میں آئے ہیں۔میں دراصل تذبذب میں ہوں کہ وہاں جانا مسئلہ ہے"۔

ان تاریخی کتبوں کو دیکھے بغیر چلاس آنا رائیگاں جاتا تھا۔میں چارپائی پر بیٹھ گئی اور رسان سے بولی۔

"آپ میری مجبوری سمجھیں۔کسی اچھی سی گاڑی اور ماہر ڈرائیور کا بندوبست کر دیجئے۔جتنے پیسے وہ لینا چاہے میں دوں گی۔اچھا برا لگنے کی بات چھوڑیئے۔بچوں والی عورت کے لئے بار بار گھر سے نکلنا مشکل ہے۔روز روز کوئی آیا جاتا ہے!

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔

سترہ اٹھارہ سال کا ایک لڑکا گھر میں داخل ہوا۔یہ محمد صادق تھا۔جس نے گائیڈ کے فرائض سرانجام دینے تھے۔میں اٹھنے ہی والی تھی کہ برآمدے میں کھڑی گل جان نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔دہلیز سے قدم نکلتے ہی اس نے مجھے ہاتھ سے تھام کر دوسرے کمرے میں ایک جستی ٹرنک کے سامنے لاکھڑا کیا۔میں حیران وششدر "سر آرتھر کنین" ڈائل کی جاسوسی کہانیوں والی صورت حال محسوس کرتی تھی۔

تب ایک جھٹکے سے بکس کا ڈھکن اوپر اٹھا۔اس نے تہری کی پھولدار چادر کپڑوں کی تہوں سے نکال کر اسے بند کیا۔میرے سر سے دوپٹہ کھینچا۔ چادر اُتاری اور وہ اوڑھادی۔

بارہ تیرہ سالہ گل جان جس نے مجھے کچھ کہے بغیر بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔میں نے اس کی پیشانی چومی اور باہر نکل آئی۔

گھر سے نکل کر جو سڑک پاؤں کے نیچے آئی وہ ہسپتال روڈ تھی۔دورافتادہ علاقوں میں سرکاری عمارتوں کے مخصوص پیٹرن پر تعمیر شدہ چھوٹا سا ہسپتال جہاں ہمہ وقت دس بارہ مریض داخل رہتے ہیں۔پانچ مرد ڈاکٹر حاضر۔خاتون ڈاکٹر غیر حاضر ہی نہیں کلی غائب۔ انچارج ڈاکٹر محمد افضل خان سمیت تین اور ڈاکٹر اسٹور سے تھے۔پتہ چلا کہ تعلیمی

لحاظ سے استوار شمالی علاقہ جات میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

زنانہ وارڈ میں زچگی کا ایک اُلجھا ہوا کیس چلاس سے چھ میل پرے وادی سے آیا ہوا تھا۔ پورا خاندان برآمدے میں جمع چہ میگوئیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دائی جو اپنے آپ کو مڈوائف کہتی تھی۔ انہیں سمجھا سمجھا کر ہار گئی تھی کہ اگر انہیں مریضہ کی جان درکار ہے تو مرد ڈاکٹر اندر بھیجنا بہت ضروری ہے۔

ایسے نازک لمحات میں پند و نصائح اور قائل کرنے کے جو حربے استعمال میں لائے جا سکتے تھے وہ سب آزمائے گئے اور یوں مرد ڈاکٹر اندر جانے میں کامیاب ہوا۔

میں نے ڈاکٹر افضل خان کی طرف دیکھا اور بے اختیار کہا۔

اگر آپ نے کراچی جیسے شہر کو چھوڑ کر محض اپنے علاقے کی خدمت کے لئے یہاں ڈیرے ڈالنے تھے تو میٹریکولیٹ گھروالی کی جگہ ڈاکٹر بیوی لانی تھی۔ کم از کم ایسی صورت سے تو بچ جاتے۔

''ارے بی بی بہتیرے طرلے مارے اس ماڈرن ڈاکٹر لڑکی کے جسے مجھ سے محبت کا دعویٰ تھا۔ مگر جو شہر چھوڑ کر یہاں آنے پر تیار نہیں تھیں۔ آپ بتائیں کیا کرتا۔''

میں نے کچھ نہیں بتایا کیونکہ ایسی صورت میں بتانے کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔

ریاض گلی سے جو چڑھائی شروع ہوئی تو وہ کھتر محلّہ جا کر ختم ہوئی۔ پتھروں کی دیواروں والے گھر جن کے چھوٹے چھوٹے دروازے بند تھے۔ جولائی کے تپتے سورج نے مجھے پسینہ پسینہ کر ڈالا تھا۔ ایک دیوار کی اوٹ میں ستانے بیٹھی تو صادق ہنسنے لگا۔

میرے دائیں بائیں اور سامنے جانوروں کی بکھری ہڈیاں ہر جاندار کے فانی ہونے کی داستانیں سنانے ہی لگی تھیں کہ میں دہلا کر اٹھی۔ ان کہانیوں کو سننے کا ابھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔

محمد صادق بتاتا تھا۔

دیامر ۱۹۴۷ء میں گلگت پاکستان کا حصہ بنا۔ جنگ آزادی گلگت بلتستان میں چلاسیوں اوراستوریوں نے جی جان سے مجاہدوں کی نہ صرف مدد کی بلکہ عملی طور پر جنگ میں حصہ بھی لیا۔۱۹۵۳ء میں پورے داریل وتانگیر کا الحاق دیامر کے ساتھ ہوا۔۱۹۷۲ء میں انتظامی بہتری کے لئے استوار،داریل وتانگیر اور چلاس کی تحصیلوں کو ملا کر ایک ضلع دیامر کے نام سے قائم کیا گیا جس کا صدر مقام چلاس ہے۔

تھوڑی سی چڑھائی کے بعد میرے سامنے ایک پختہ سڑک تھی جس کے دونوں جانب بڑے بڑے دروازوں والی پختہ دوکانیں تھیں۔گاہکوں اور دوکانداروں کی اکثریت باریش تھی۔دلوں کے حال خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ سنت نبوی سے وابستگی کی بنا پر ہے یا اس میں خط بنوانے کی کاہلی کا عمل دخل ہے۔چلاس کی اٹھانوے فیصد آبادی سُنّی مسلک سے متعلق ہے۔

پرلی طرف چلاس کی تیسری آبادی جسے مہاجر کالونی کے ساتھ ساتھ رونئی بھی کہا جاتا ہے،واقع ہے۔گھروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا۔یہاں سرکاری ملازمین اور پٹھانوں کی اکثریت ہے۔ستر اسی گھر ہوں گے۔ساتھ ہی شلکٹ کا گاؤں ہے۔

محمد صادق مجھے مچھلیوں کے فارم دیکھنے کی دعوت دے رہا تھا جو کہیں قریب ہی تھا لیکن مجھے زندوں کی نسبت بے جانوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔میں نے چلاس کا تاریخی قلعہ دیکھنے کے لئے دوڑ لگا رکھی تھی۔

صادق کہتا تھا۔

''دیکھنا تھا تو آپ نے پہلے بتایا ہوتا میں شارٹ کٹ سے لے چلتا۔ہاں آپ ذرا آہستہ چلئے۔میرے پیچھے رہیے۔

میری بہت سی خراب عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی مرد کے ساتھ چلتے ہوئے میرا ایک قدم پیچھے رہنے کی بجائے اس سے آگے رہتا ہے۔شادی کے ابتدائی دنوں

میں میاں نے غالباً مروت میں اس عادت کو برداشت کیا۔ پر جب تعلقات میں ذرا بوسیدگی ائی تو ایک دن سیر کے لئے جاتے ہوئے بیچ سڑک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

''کیسی سٹوپڈ عورت سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ پیچھے نہیں قدم چلتے تو آگے بھی مت بڑھو''۔

وہیں ''تو تو میں میں'' ہوگئی اور نتیجتاً ہم لوگ گھر میں الگ الگ داخل ہوئے۔

''بیچارہ صادق''

اب بھلا میں مرد کی ذہنیت پر پیچ پیچ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ بازار کے ساتھ جماعت خانہ تھا اور اس کے پاس ہی مضبوط قلعہ آن بان سے کھڑا تھا۔ اندر پولیس نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔

میں نے برجیوں میں سے جھانکتے ان سوراخوں کو دیکھا جن کے دہانوں پر رکھی گئی بندوقوں کی نالیوں سے شعلے نکل کر دشمن کو خاکستر کرتے تھے۔

چلاس کے جری و دلیر اور غیور لوگ ہمیشہ دشمن کے لئے عذاب بنے رہے۔

صادق بتا رہا تھا۔

یہ ۱۸۵۱ء کا ذکر ہے۔ ڈوگرہ فوج نے چلاس پر حملہ کر دیا۔ ڈوگرہ فوج کیل کانٹے سے لیس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے نامور فوجی اور سول راہنماؤں کے ساتھ تھی۔ وزیر زور آور سنگھ دیوان ٹھاکر سنگھ، کرنل بجے سنگھ اور کرنل جواہر کے ہمراہ خود آئے تھے۔ اہل چلاس کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ لوگ اپنے اس قلعے میں آ گئے۔ یہ قلعہ ایسا مضبوط، ایسا مستحکم اور ایسا پر اسرار تھا کہ کسی طرف سے بھی اس پر حملہ کرنے کی راہ نہ تھی۔ ڈوگرہ فوج اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ چلاسی مردوں کی شجاعت تو ایک طرف، عورتیں ایسی جنگجو کہ انہوں نے بندوقیں ہاتھوں میں تھام کر مردوں سے کہا:

''تم لوگ رات کو لڑو، دن ہمارے لئے رہنے دو۔''

اب کرنل بجے اور جواہر سنگھ حیران کہ قلعے میں محصور لوگ کیا فولادی ہیں کہ تھکتے نہیں۔ کسی وقت تفنگ بازی کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ مخبروں نے خبر دی کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ لڑ رہی ہیں۔ جونہی ڈوگروں کی تازہ کمک پہنچتی۔ فصیل سے گولیوں اور پتھروں کی ایسی بارش ہوتی کہ سپاہیوں کی اکثریت وہیں ڈھیر ہو جاتی۔

صورت حال تشویشناک تھی۔ آخر کار قلعے کے اندر نقب لگا کر پانی کے حوض تک رسائی حاصل کی گئی اور پانی ضائع کر دیا۔ باہمت چلاسی اب مجبور ہو گئے تھے۔ اطاعت تو قبول کی دخراج ادا کرنا بھی منظور کیا۔ لیکن اس کے باوجود ۱۸۹۲ء تک ڈوگرہ فوج کو باقاعدہ انتظامیہ قائم کرنی نصیب نہ ہوئی۔

اسی سال انگریزی فوج کے میجر رابرٹسن نے چلاس پر حملہ کیا۔ زبردست جھڑپوں کے بعد افواج کشمیر نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چلاس والوں نے اپنے اندرونی معاملات میں انہیں مداخلت کرنے کی کبھی اجازت نہ دی۔ ہمیشہ ان کے لئے مصیبت بنے رہے۔

جنگ آزادی کے لئے اہل چلاس کی خدمات نے بھی تاریخ کے صفحات میں سنہری ابواب کا اضافہ کیا۔ ٹائیگر فورس جس کی قلندرانہ آن میں سکندرانہ شان تھی۔ اس میں چلاس کے جیالے بھی شامل تھے جو ہر محاذ پر بے جگری سے لڑے اور شجاعت کے میدان میں نئی داستانیں رقم کیں۔

جب واپسی کے لئے ڈھلانی راستے پر تیزی سے اترا جا رہا تھا۔ میں ایک جگہ بے اختیار رک گئی۔ میرے سامنے ایک ایسا گھر تھا جس کی دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ آنگن میں جابجا کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا شکستہ دیوار کی چھوٹی سی اوٹ میں ایک نحیف و نزار بوڑھا فراغت کا مرحلہ طے کر رہا تھا۔ خوبانی کے پیڑ کے نیچے بچھی چارپائی پر ایک ایسی لڑکی بیٹھی تھی جو اس ماحول کی مناسبت سے مجھے کنول کا پھول نظر آئی تھی۔ درخت کے تنے سے بندھی

بکری تصویر حیرت بنی اس ماحول کو دیکھتی اور کبھی کبھی بھاں بھاں کرتی تھی۔

میں بے اختیار اس کے پاس جا بیٹھی۔سامنے کا منظر کیسا دلفریب تھا۔دریائے سندھ ایک پتلی سی لکیر کی مانند نظر آ رہا تھا۔سہاگہ کئے ہوئے اور سبز کونپلوں والے چھوٹے بڑے کھیت جیومیٹری کی ہر شکل کا نمونہ تھے۔چلاس کی زرخیز میدانی زمین دو فصلی ہونے کے باوجود غذائی ضروریات میں لوگوں کو خود کفیل نہیں کرتی۔

شاہ بلوط کے قد آور درختوں کے پتے ہوا کے زور سے جھوم کر جب سورج کے رخ پر آتے تو یوں لگتا جیسے چاندی کے دریا میں غوطہ مار کر نکلے ہوں۔دریا پار کھڑ کے پہاڑ تھے۔ننگے بچھے یہ پہاڑ ذرا جاذب نظر نہ تھے۔

صادق نے شنا (مقامی زبان) میں اسے غالباً میرے متعلق بتایا تھا۔گرمی کی اس شدت میں اس نے نیلی پھولوں والی جرسی کا گندہ مندہ سوٹ پہن رکھا تھا۔گلے میں کپڑے پر لگائے گئے موتیوں کا زیور جسے وہ مشٹی کہتی تھی زیب تن تھا۔اس کی صحت حسن و جوانی اور بانکپن کو دیکھتے ہوئے میرا یہ سوال فطری تھا۔

''اتنا گند پھیلائے بیٹھی ہو؟ طبیعت نہیں گھبراتی''۔

اس ماہ رخ نے کمال بے اعتنائی سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا تھا۔

''دراصل پرسوں تو ہم لوگوں نے گنومل چلے جانا ہے۔وہاں ہمارا گھر، زمین، بھیڑ بکریاں، مال مویشی، دیار، دیودار اور چلغوزوں کے درخت ہیں۔جب جانا ہے تو فضول میں یہاں ہلکان ہونے سے فائدہ! تین چار دن پہلے جھاڑو دیا تھا۔ایک تو بکریاں اتنی کم بخت ہیں کہ جگہ جگہ گند ڈالتی پھرتی ہیں۔''

اب بھلا اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا'' کہنے کے سوا کوئی اور چارہ تھا؟

اس کی شادی کو گیارہ سال گزر گئے تھے اور ہنوز وہ بچے سے محروم تھی۔میرے پوچھنے پر کہ شوہر کا رویہ کیسا ہے؟ اس نے اعتماد اور توکل سے لبالب بھرا جواب دیا تھا۔

''یہ تو مولا کی دین ہے ۔بندہ کیوں پھوں پھاں کرتا پھرے؟ جب اس کی کوئی کاریگری نہیں۔

اگر وہ تمہیں چھوڑ دے پھر'' ۔''چھوڑ دے ۔ہزار بار چھوڑ دے۔اللہ مالک ہے ۔ بہتیرے مرد۔

اس ان پڑھ جاہل عورت نے مجھ جیسی پڑھی لکھی کے منہ پر زناٹے کا تھپڑا مارا تھا۔''بات ہوئی نا''میں نے اس کے شانے تھپتھپا کر داد دی۔

☆☆☆

باب:4

وادی نیاٹ کے غریب مظلوم لوگ۔
چاق اور ماہ چاق کی کہانی
جالو پر سفر۔ تھلپن اور قدیم تاریخ

گھر پہنچے تو صاحب خانہ کے دو عزیز انتظار میں بیٹھے تھے۔ سیدھے سادے معصوم سے لوگ جو چلاس شہر خریداری کے لئے آئے تھے۔ میرا سن کر بیٹھ گئے کہ میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی سے حکام بالا کو ضرور آگاہ کروں۔

قصہ یوں تھا کہ تھک داس پلین میں گورنمنٹ نے لاکھوں روپے کے خرچ سے نہر نکالی۔ پلاٹ بنائے۔ اب ان پلاٹوں کو مقامی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدہ داران نے ۱۳۰۰۰ (تیرہ ہزار روپے) فی مرلہ اپنے واقف کاروں اور رسوخ والے امیر لوگوں کے ہاتھ بیچ دیئے۔ بابوسر نیاٹ کے غریب لوگ جن کا پہلا حق تھا منہ دیکھتے رہ گئے۔

اب میں انہیں کیا بتاتی کہ تھک نالے کی بستی بابوسر نیاٹ ہو یا لاہور جیسے بڑے شہر کی کوئی عام سی آبادی۔ غریب کے استحصال کا سلسلہ تو زور و شور سے جاری ہے۔ عدل کے دروازوں کی کنڈیاں اتنی اونچی ہیں کہ انہیں کھولنے کے لئے غریب بیچارے کی قد و قامت سرے سے بہت چھوٹی ہے۔

لیکن میں نے سچ کے ڈنگ سے انہیں زخمی نہیں کیا۔ کیونکہ ایک تو میرا ایمان ہے کہ بے شک گڑ نہ دو پر گڑ جیسی بات تو کرو۔ دوسرے یقیناً مجھے اپنے آپ کو کم مایہ ظاہر کرنا بھی مقصود نہ تھا۔

صاحب خانہ مجھ سے کہتے تھے۔

''یہ میرے گھرے عزیز ہیں ۔ان کے والد اور میرے والد ''سومو'' کی رسم ادا کرنے کے بعد حقیقی بھائی بنے تھے ۔ ہمارے دستور کے مطابق جب دوستی کو محرم کے رشتے میں بدلنا ہو تو ''سومو'' بنایا جاتا ہے ۔یعنی بکرے وغیرہ ذبح کر کے گاؤں والوں کی ضیافت کی جاتی ہے ۔ان کا تعلق یشکن قبیلے سے ہے ۔میرے والد نے دس بکرے ذبح کئے تھے ۔ والدین کے بعد اب ہم لوگ بھی ایک دوسرے کے لئے بہت خلوص اور محبت رکھتے ہیں ۔''

میرے ہونٹوں پر بے بسی سے لبریز مسکراہٹ کو بے چارے سادہ لوح لوگ کیا سمجھتے ؟بہر حال میں نے پکا وعدہ کیا کہ نیچے جاتے ہی اس مسئلے کو ضروری اہمیت دوں گی ۔پر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا ۔

جس وقت گل جان نے چھوٹی سی چوں چوں کرتی میز لا کر ہمارے سامنے رکھی ۔ اس وقت ایک بجنے والا تھا ۔کھانا کھاتے ہوئے محمد صادق نے چلاس کے چہرے کے اولین نقش و نگار دکھائے ۔

روایت ہے کہ چلاس اور اسکے آس پاس کے علاقے پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا ۔اس کے دو لڑکے تھے ۔چاق اور ماہ چاق ۔باپ مرا تو بڑا بھائی چاق بوٹ (والی یا امیر) بنا ۔لیکن چھوٹے بھائی کو یہ گوارہ نہ ہوا ۔اس نے لوگوں کو اکسایا اور اعلان جنگ کر دیا ۔ زبردست لڑائی ہوئی ۔بوٹ نے یہ لڑائی جیتی لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کی حق تلفی نہیں کرے گا اس نے ماہ چاق کو بلایا اور کہا ۔

''آؤ ہم دونوں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر نشان زدہ تیر پھینکتے ہیں ۔ یہ تیر جہاں جہاں لگیں گے وہ علاقے ہماری سلطنت ہوں گے ۔ماہ چاق کو یہ تجویز پسند آئی ۔

کہا جاتا ہے کہ دونوں اپنے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے اپنے تیروں کے تعاقب میں بھاگے ۔ماہ چاق چترال کے مشرق کی طرف وادی شقار کول میں خیمہ زن ہوا ۔ چترال میں اس وقت رئیس خاندان کی حکومت تھی ۔سنا ہے رئیس نے اپنا نمائندہ بھیجا تو ماہ

چاق نے سونے کی کرسی پر بیٹھ کر اس سے مذاکرات کئے۔

"اللہ حکمران ماضی کے ہوں یا حال کے جاہ وحشمت کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

میں نے بے اختیار سوچا تھا۔

بڑا بھائی جو بوٹ کہلاتا تھا۔ اس کی حکومت جب ختم ہوئی تو یہ سارا علاقہ الگ الگ ریاستوں میں بٹ گیا۔ گوہر آباد تھک تھور، داریل تانگیر، ہربن شتیال، سازین اور جلکوٹ میں جشٹیر و سسٹم کے تحت حکومت شروع ہوئی۔

۱۸۴۲ء میں گلگت پر سکھوں نے قبضہ جمانے کے بعد چلاس پر حملہ کیا۔ لیکن بہادر چلاسیوں نے داریل اور تانگیر کے شہ زور لوگوں کی مدد سے انہیں زبردست شکست دی۔ انگریزوں نے عیاری سے اس علاقے پر قبضہ ضرور کیا مگر ان لوگوں نے سدا انہیں تنگ کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اب یہ پاکستان کا ایک حصہ ہے۔

محمد صادق کے شکر کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ ایسے جیالوں کی سرزمین میرا وطن ہے۔

ماضی کے دریاؤں میں غوطہ خوری کے بعد جب میں اٹھی۔ اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے صادق سے کہا کہ وہ تھلپن جانے کے لئے کسی سوزوکی کا بندوبست کرے جب تک میں ظہر کی نماز سے فارغ ہو جاؤں۔

برآمدے میں کھڑے تخت پوش کو بچھایا۔ گل جان نے قریب آکر استفہامیہ انداز میں کہا۔ صبائے نماز (ظہر کی نماز) میں نے بس قیافے سے اس کا مطلب سمجھا اور مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

کسری نماز کے دو فرض جلدی ہی پڑھے گئے۔ فارغ ہو کر رخ سیدھا کیا۔ دھوپ کی تیزی نے آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ دن کسی بیماری کی دکھ بھری رات کی طرح لمبا

ہو گیا تھا۔ یہی دن جو گھروں میں پل جھپکتے گزر جاتا ہے۔

تھلپن کا گاؤں دریائے سندھ کے پار ہے۔ سوزوکی میں بیٹھ کر تیز دھوپ میں چمکتے نانگا پربت کے نظارے پھر دیکھے۔ دریائے سندھ کے پاس سوزوکی رک گئی۔ پتہ چلا کہ تھلپن جانے کے لئے "جالو" سے سفر کرنا ہو گا۔ جالو دراصل ہوا سے بھری ہوئی مشکوں اور بانس کے ڈنڈوں سے بنی ہوئی مقامی کشتی کا نام ہے۔ ایسے علاقے جہاں درمیان میں دریا حائل ہیں اور پل نہیں، رابطے کا واحد ذریعہ یہی جالو ہیں۔

جالو پر قدم رکھتے ہی میرے دل نے دھک دھک کی صدائیں لگانا شروع کر دی تھیں۔ میں نے سہم کر فی الفور اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو بغور دیکھا کہ کہیں ڈوب کر مرنے کی کوئی علامت تو نہیں۔

میرے سامنے تھلپن کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ دریائے سندھ کے کناروں پر پڑے بڑے بڑے پتھروں پر ایسی کندہ کاری تھی جو زمانے گزر جانے کے بعد بھی ہنوز روزِ اول کی طرح نمایاں تھی۔ اگر ڈاکٹر احمد حسن دانی کے مقالات میری نظر سے نہ گزر چکے ہوتے تو شاید میں ان کی تاریخی باریکیوں کا صحیح طرح اندازہ نہ کر پاتی جن کی عکاسی یہ تصویریں اور تحریریں کرتی ہیں۔

جانوروں میں مارخور اور پہاڑی بکروں کی تصویریں تھیں۔ پرتھین سپاہی ان جانوروں کا شکار کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے لباس اور ہتھیاروں سے تاریخ کی معاشرتی گتھیوں کو کھولنا مجھ جیسی مبتدی کے لئے بہت دلچسپ تھا۔ کہیں گڈریے بھیڑ بکریاں چرا رہے تھے۔ کہیں شکاری شکار کرتے تھے۔

ایسی ہی تصویریں پیرو کے جنوبی صحرا ناز کا اور پالپا کے قصبوں میں بھی سینکڑوں مربع میل کے رقبے پر مشتمل خشک سطح مرتفع میں پائی گئی ہیں۔ صحرائی جانوروں کی دیوہیکل اور مختلف اقلیدسی شکلیں دیکھ کر لوگ حیرت سے سوال کرتے۔

بھلا قدیم باشندوں نے یہ کیوں اور کس لئے بنائیں؟

مگر ماہرین نے ان کے مطالعے سے یہ ثابت کیا کہ کچھ نقشے اور خاکے شمس و قمر کے نقطہ انقلاب اور کچھ بودوباش اور کچھ ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ہمارے ساتھ ڈرائیور لڑکا بھی تھا۔وہ گزشتہ ماہ دو جرمنوں کو شتیال اور کھر لے کر گیا تھا۔بتا رہا تھا کہ وہ لوگ سارا دن پاگلوں کی طرح وہاں پھرتے رہے تھے۔

مجھے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ وہ کہتا ہوگا اب ایک اور پاگل عورت پتھروں کو آنکھوں سے چاٹتی پھر رہی ہے۔

عصر کی نماز میں نے تھلپن کے گاؤں میں پڑھی۔ازل اور ابد کے زاویوں میں بھٹکتا ذہن ایک نقطے پر آ کر رک گیا تھا۔ماضی فنا ،حال اور مستقبل فنا کی طرف رواں دواں۔

چلاس میں سیتھین دور کے چٹانی کتبے اس عہد کی پوری تاریخ کی نشان دہی کرتے ہیں۔بدھ مت کے سٹوپا جن کے سامنے سیتھین سپاہی احتراماً گھوڑوں سے اترتے دکھائی دیئے گئے ہیں۔ان تصاویر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سیتھین حکمرانوں نے بدھ مت کی سرپرستی کی تھی۔

اب یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ سیتھین کون لوگ تھے؟

غیر مستند حوالوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ دراصل شین ہی سیتھین ہیں۔لیکن یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ سیتھین اور آریاؤں میں کس قسم کی بھائی بندی قائم تھی۔سیتھین کے بعد پرتھین آئے۔

گھومتے گھومتے شام ہوگئی تھی۔موسم کی تمازت اب خوشگواری میں بدل گئی تھی۔ اس وقت میرا جی ایک کپ چائے پینے کو چاہتا تھا۔لیکن ان ویرانوں میں چائے کہاں؟ تھک کر میں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔اس پر عجیب و غریب قسم کی تحریر تھی۔

غالباً یہی وہ تحریریں ہیں جنہیں کھروشتی کہا گیا ہے۔

تھلپن چھوٹی سی وادی ہے۔ستر اسی گھروں پر مشتمل لوگوں کی اکثریت اپنے گرمائی مستقر ملٹ ہروپے کی چراگاہوں میں گئی ہوئی تھی۔سواتی اور سونی وال ذات کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔

چلاس کے مشہور کھنر نالے کے یخ پانی نے طبیعت کو فرحت اور تازگی دی۔نالہ کا دریا میں گرنا بھی ایک دلفریب منظر تھا۔

جالوبان ہمارا منتظر تھا۔کشتی میں بیٹھی تو ہنستے ہوئے بولا۔

''بی بی کیسا لگا آپ کو ہمارا علاقہ''۔

میں نے ہنس کر جواباً کہا

''تمہارا کیوں؟میرا نہیں ہے یہ''۔

جس وقت گھر پہنچے تو مغرب ہو چکی تھی۔نماز کی وہ چوکی جس پر ظہر پڑھی تھی۔اس وقت مرغی کی بیٹوں سے یوں بھری ہوئی تھی جیسے کسی خوبصورت سے بچے کا گندمی چہرہ پھول ماتا کے داغوں سے بھر جاتا ہے۔

نماز کا خیال چھوڑ کر لکڑی کی سیڑھی سے چھت پر چڑھ گئی۔ہوائیں اتنی تیز اور گرم تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے پروردگار نے دوزخ کی کھڑکی کا چلاس پر واقع روشن دان کھول دیا ہو۔ساتھ والوں کے گھر اگا ہوا بادام کا درخت چھت پر جھکا ہوا تھا۔گل جان نے چند بادام توڑ کر میری ہتھیلی پر رکھے۔گری بڑی لذیز اور میٹھی تھی۔اس وقت میں نے سوچا اگر یہ درخت میرے صحن میں اگا ہوا ہوتا تو میں کتنی خوش نصیب ہوتی۔روز سردائی گھوٹ گھوٹ کر خود بھی پیتی اور اولاد کو بھی پلاتی۔

دور سفیدے کے درخت ہواؤں سے جھوم جھوم جاتے تھے۔ماناگاہ پربت پر پریوں کا کوٹ (قلعہ) اب نظر نہیں آتا تھا۔نیچے آنگن میں گھر والی مٹی کے تیل والے

چولہے پر جانے کیا پکا رہی تھی۔خوشبو ناک کے نتھنوں میں گھس گھس کر بھی کچھ واضح نہیں کر پاتی تھی۔

ملگجے اندھیرے میں مجھے یوں لگا جیسے گل جان کے رسیلے گلابی ہونٹ کچھ کہنے کچھ پوچھنے کے لئے پھڑ پھڑا رہے ہوں۔اس کی ہیرے کی مانند چمکتی آنکھوں میں جیسے حجاب اور شوق کے رنگ گھلے ملے ہوں۔ابھی میں اس کی کیفیت کا جائزہ لینے میں مصروف تھی کہ اس نے خود ہی پہل کر دی۔

''آپ کو محمد صادق کیسا لگا؟''

''اچھا لڑکا ہے''۔میں نے سادگی سے کہا۔

پر اگلے ہی لمحے مجھے اپنی بیوقوفی پر ہنسی آئی۔

''ارے''میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تو یہ بات ہے''۔

''وہ کچھ جھینپی۔یہ پتہ چلا کہ صادق کے گھر والے گل جان کا رشتہ چاہتے ہیں۔ خود محمد صادق اسے میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے۔

میں حیران رہ گئی۔جب چودہ سالہ گل جان نے آرزدگی سے کہا۔''ہمارے یہاں دھاپ کا رواج ہے۔لڑکی والے لڑکے والوں سے پیسہ لیتے ہیں۔میرے ابا نے پچاس ہزار روپیہ مانگا ہے۔صادق کا باپ نہیں۔اس کے بھائی بھی امیر نہیں۔اتنا پیسہ وہ کہاں سے لائے گا؟''

میں گنگ بیٹھی اس کے معصوم چہرے کو تکتی تھی۔اتنی سی عمر اور ایسا دکھ۔نیچے سے آواز پڑی اور ہم دونوں چونک اٹھیں۔

روٹیوں کی چنگیر اور سٹیل کی پلیٹ سامنے آئی تو پتہ چلا کہ اتنا شور شرابا کرنے والا سالن انڈے گنڈے تھا۔

کھانے کے دوران پتہ چلا کہ گھر والے کل بابوسر ٹاپ جا رہے ہیں۔ پانی کا وہ گلاس جو ہونٹوں سے لگانے کے لئے میں نے اٹھایا ہی تھا واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک دن کے لئے میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ایسی جگہوں پر جانے کے مواقع روز روز نہیں ملتے۔جواب میں صاحب خانہ نے ''شوق سے چلئے'' کہا۔

اب اللہ جانے کہ ''شوق سے چلئے'' کہنے میں مجبوری تھی یا فی الواقع جذبہ بھی تھا۔ میں اس جھمیلے میں زیادہ نہیں الجھی۔کبھی کبھار خودداری اور آن کو اپنے سے الگ کر کے طاق پر سجا دینا زیادہ سودمند رہتا ہے۔کیونکہ میرے خیال کے مطابق کسی بھی جگہ پر لکھنے کے لیے مقامی زندگی میں رچنا بسنا ضروری ہے۔حالات اگر کچھ مدت کی اجازت نہ دیں تو جتنا وقت بھی ہاتھ آئے تو اسے بھرپور انداز میں سمیٹنا چاہیے۔ چلاس کی تین چوتھائی آبادی تو نالوں میں بیٹھی تھی۔

اسی لئے میں خوش تھی اور گل جان مجھ سے بھی زیادہ خوش۔

عشاء کی نماز پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ پھیلے اور آنکھیں بند ہوئیں تو بچے دھم دھم کرتے جائے نماز پر آ کر بیٹھ گئے۔

میں خطرناک راستوں کی راہرو بن گئی تھی۔چودہ ہزار فٹ پر سفر کرنے والی تھی۔ میں عافیت کی طلب گار تھی۔اپنی اپنے بچوں اور گھر والے کی۔

احساسات کی شدت نے میرے سر کو زمین پر ڈال دیا۔میں نے طلائی کرسی پر بیٹھے اپنے رب کی ٹانگوں کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا تھا۔میرا رب جو کبھی نور کا ہیولا بن جاتا اور کبھی مادّی روپ میں ڈھل جاتا ہے۔میں اپنی مرضی کے مطابق اس کے مختلف بت تراشنے کی مجرم ہوں لیکن کیا کروں۔مقدم تو مجھے اپنی قلبی تسکین ہے۔

رات خاصی خوشگوار تھی۔پر چلاس کے مچھر جنہیں Sand flies کہا جاتا ہے بڑے ظالم نکلے۔کم بختوں کے کاٹنے کا انداز اُس چلبلے عاشق جیسا تھا جو بار بار اپنی محبوبہ کے

رخساروں کی چٹکی کاٹنے سے باز نہیں آتا۔

چلاس کی گرمیوں اور مچھر دونوں بڑی شہرت رکھتے ہیں اور میں ان دونوں سے لطف اندوز ہوئی۔

گل جان نے صبح سویرے چائے بنالی تھی۔ کیک نما کلچہ ذائقہ دار تھا۔ صادق ہمارے ساتھ جارہا تھا۔ اس کی ماں اور بھائی لوشی میں تھے۔ مجھے گل جان کے خوش ہونے کی وجہ اب سمجھ آئی تھی۔

دونوں ماں بیٹیوں نے چادریں اوڑھنے سے پہلے سروں پر ٹوپیاں رکھیں۔

''یہاں کا دستور ہے۔''

گل جان ہنسی۔

باب:5

وادی بابوسر - بابوسر ٹاپ پر جانا
شنا شاعری سے ذرا تعارف۔گھریلو زندگی کے رنگ
داریل کافرس خان

سوزوکی ڈرائیور بڑا گرانڈیل جوان تھا۔اس کا رنگ سرخ اور بال بھورے تھے۔ اس کی ٹوپی پر سجا تازہ پھول گویا خوش آمدید کہتا تھا۔پتہ چلا تھا کہ اس کا تعلق داریل وادی سے ہے۔داریل کے لوگ پھولوں اور موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔

صاحب خانہ نے سامان کی لدلدائی کروائی۔بیوی بچوں کو بٹھایا۔انہیں چند دن ٹھہر کر جانا تھا۔

عاشقوں کے جذبے اگر صادق ہوں تو پھر خدا خود مسبب الاسباب بن جاتا ہے۔ گاڑی نے ابھی فرلانگ بھر فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ گل جان کے دونوں چھوٹے بھائی مچل اٹھے کہ وہ آگے ڈرائیور کے پاس جائیں گے۔ماں نے شنا (مقامی زبان کا نام) میں بہتیرا ڈانٹا ڈپٹا پر ضدی لڑکے اڑیل ٹٹو کی طرح اکڑے رہے۔مجبوراً صادق پیچھے آیا اور وہ دونوں آگے بیٹھے۔میں نے دیکھا تھا گل جان کی چادر کے ہالے میں لپٹی سیاہ چمکدار آنکھوں میں خوشی صبح کی کرنوں کی مانند جھلملائی تھی۔

ٹیپ کا بٹن آن ہوا اور شنا کا ایک گیت فضا میں گونجا۔

مے سخ گہ شکے لو گے جمریل گہ شکے
اژ واجا اسما زمہ توٹے سوری ہاتس

گیت غالباً رومانی تھی۔دونوں نے چور آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

میں ہنسی۔صادق بھینس کے آگے بین بجانے والی بات مت کرو۔ مطلب تو بتاؤ۔ وہ کچھ خفیف ساہو گیا۔میرے اصرار پر بولا۔

محبوبہ عاشق سے کہتی ہے۔میرے چہرے کو دیکھو اور میرے چہرے پر بکھری سنہری زلفوں کو بھی دیکھو۔آسمان گھنے بادلوں میں گھرا ہوا ہے۔ان (بادلوں) میں میں تیرے لیے ایک چمکنے والا سورج ہوں۔

میں تخیل کی بلندی پر حیرت زدہ ہو گئی تھی۔زلفوں کو بادل اور چہرے کو آفتاب کے ساتھ تشبیہ نے شعر کے حسن کو دو چند کر دیا تھا۔

کچھ یہی حال باقی اشعار کا تھا۔

دیامر کی مختلف وادیوں ،داریل کے عبدالحق ،ساز ین کے صفدر ،تھک کے گل اور گوہر آباد کے مولوی حسین کی خوبصورت شاعری شینا زبان کا قیمتی اثاثہ ہے۔صادق افسوس کر رہا کہ شنا چونکہ تحریری زبان نہیں۔اسی لئے کلام سینہ بہ سینہ چلتا ہے۔اور یوں بہت سا ضائع بھی ہو جاتا ہے۔بیشتر شعرا پڑھے لکھے نہیں تھے۔بھیڑ بکریاں چرانے اور کھیتوں میں ہل چلاتے چلاتے ان پر آمد ہوتی۔ایسے خوبصورت اور اعلیٰ معیار کی نظمیں ،غزلیں وجود میں آتیں کہ لفظوں کی بندش پر سادہ لوح شاعروں کی فنکارانہ گرفت پر انسانی عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

ہمارا سوزو کی ڈرائیور بھی بڑے اچھے شعر کہتا ہے۔صادق نے میری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

''کوشش کریں گے کہ بابوسر میں ایک مجلس (شعر گوئی) کی نشست ہو جائے۔''

میں نے باہر جھانکا۔فضا پر سکون اور سناٹا تھا۔اس سناٹے کو توڑنے والی آواز سوزکی کی کھڑ کھڑ تھی۔سڑک کچی بھی تھی اور خراب بھی۔۱۹۴۸ء میں اسے بنایا گیا تھا۔پی ڈبلیو ڈی شاید اسے اب مرمت کے قابل نہیں سمجھتی۔

وادی بابوسر کی وجہ تسمیہ بھی بڑی دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔ سرشنا زبان میں جھیل کو کہتے ہیں۔ اس علاقے میں سڑک کی تعمیر کا جب سوال پیدا ہوا تو ایک وجیہہ سا آفیسر سروے کے لئے آیا۔ راستہ بہت دشوار گزار اور کٹھن تھا۔ اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر علاقے کی دو جھیلوں کو عبور کیا اور آگے پہنچا۔ سیدھے سادے دیہاتی لوگوں نے اسے بابو بابو کہتے کہتے علاقے کو ہی بابوسر کہنا شروع کر دیا۔

جل نامی جگہ پر گاڑی رک گئی۔ ہم لوگوں نے ابھی گیارہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ یہاں چند دکانیں اور ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ چائے نے اس ماحول میں بہت لطف دیا۔

گل جان کے دونوں بھائی اب پیچھے آ گئے تھے۔ اس نے انہیں خفگی سے گھورا اور بولی۔

''تم لوگوں نے کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ چلو اپنی جگہ پر جاؤ''۔

بچے اب پھر مچل گئے کہ نہیں ہم تو اب یہیں بیٹھیں گے۔ گل جان کے جذبات کا بھلا مجھ سے بڑھ کر کسے اندازہ ہو سکتا تھا۔ میں نے فوراً پیشکش کر دی۔

''مت ڈانٹو انہیں۔ بچے ہیں۔ میں آگے چلی جاتی ہوں''۔

ہولی ہوکس کے پھولوں کی طرح مسکراتے چہرے والا فرس خان اپنی ذات کی پرتوں میں کیسے کیسے غم چھپائے ہوئے تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس سے باتیں کرنے کے بعد ہوا۔ انسان کا اندر بھی سمندر کی تہہ میں پڑی ہوئی بند سیپی کی طرح ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لئے نیچے تہوں میں غوطہ خوری کرنا پڑتی ہے۔

وادی داریل کا فرس خان ستمبر ۱۹۸۱ء کی ایک سہانی صبح چھ دن گھر پر گزارنے کے بعد چلاس جانے کے لئے نکلا تھا۔ وہ ان دنوں چلاس میں ڈرائیونگ سیکھ رہا تھا۔ ماں نے اپنے کھردرے ہاتھوں میں اس کا سر تھام کر کہا تھا۔

''جلدی چکر لگانا۔ پتہ نہیں دل کیوں گھبراتا رہتا ہے؟ ۔وہ ہنسا ماں کے ہاتھ

چومتے ہوئے بولا۔بوڑھی ہوگئی ہے اب تو۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ آج کی رات تو اپنے جگری یار رمنان کے پاس گوہر آباد گزارے گا۔لیکن ابھی گوہر آباد کے گاؤں میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس قیامت کے بارے میں جان کر بے کل ہوگیا۔بھاگا بگٹٹ بھاگا۔جو سواری ملی اسے پکڑا۔وہی سڑک جس پر ابھی چند گھنٹے قبل گزر کر آیا تھا۔بند تھی۔

وادی دارئیل میں زلزلہ آیا تھا۔ایسا ہولناک کہ وادی سمندر میں کشتی کی طرح ہچکولے کھاتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں چکنا چور ہو کر زمین بوس ہوئیں اور اپنے ساتھ ہزاروں افراد،جانوروں کو بھی لے ڈوبیں۔

جب امدادی پارٹیوں نے آ کر جانے کا راستہ بنایا تب اس نے دیکھا اور جانا ۔وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔گھر اور گھر کے مکین،سبز آنکھوں والی منگیتر اور اس کا خاندان ،ڈھور ڈنگر،زمین،درخت کچھ بھی نہیں تھا۔

اس نے خون رستی آنکھوں کو پونچھا اور واپس لوٹ آیا۔وہ کھاتا پیتا ہے۔ہنستا مسکراتا ہے۔اچھے کپڑے بھی پہنتا ہے۔پیسے بھی کماتا ہے اور جمع کرتا ہے۔پر جیسے ٹوٹے ٹوٹے ہوگیا ہو اور سمجھ نہ پاتا ہو کہ ان ٹکڑوں کو کیسے جوڑے کہ وہ پہلے والا فرس خان بن جائے۔

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔کھڑکی سے باہر تھک کوٹ کی خوبصورت وادی کے حسین نظارے اداسی کے سایوں میں لپٹے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

تھک کوٹ شینا زبان میں آباد جگہ کو کہتے ہیں۔یہاں گھروں کی بھی بہتات تھی اور خودرو درختوں کی بھی۔ چھ میل آگے لوشی کی وادی تھی۔یہاں صادق کا گرمائی گھر اور تھوڑی سی زمین تھی۔لوشی قدرتی جنگلات کی وجہ سے شہرت رکھتی ہے۔کھیتی باڑی کے قابل زمین البتہ کم ہے۔

صادق چاہتا تھا کہ سب لوگ ان کے گھر تھوڑی دیر آرام کریں۔ چاہتی تو میں بھی یہی تھی کہ لوشی کے گھر دیکھوں۔ جنگلی جانور یہاں بہت زیادہ ہیں۔ شاید کسی کی جھلک مجھے بھی نظر آ جائے۔ لیکن نہ تو صادق اپنی خواہش کو زبان دے سکا اور نہ ہی میں۔ گاڑی آگے چل پڑی تھی۔ تین میل آگے بابوسر کی وادی تھی۔

تقریباً تیس کلومیٹر کے اس سفر میں سڑک کی حالت زار، راستے کی دشواری، سوزوکی کی ضعیفی و ناداری اور راستے کی وادیوں کے حسن و جمال کے تحیر نے مجھے تھور ہیر ڈاہل کی ان مہموں کی یاد دلائی جو اس نے ''پولی نیسا'' کے جزائر سر کرنے کے لئے کی تھیں۔

بابوسر کی وادی میں داخلے کے وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ وادی کا حسن اس کنواری حسین دوشیزہ کی مانند تھا۔ جس پر نگاہ ڈالنے سے اپنی آنکھوں کی غلاظت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آدھ فرلانگ چوڑی اور ڈیڑھ فرلانگ لمبی اس وادی پر شام کے سائے سہ پہر کو ہی قبضہ کئے بیٹھے تھے۔ وادی میں رونق تھی۔ مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ اکا دکا خستہ حال غیر ملکی بھی نظر آتے تھے۔ چھوٹا سا بازار گزر گیا۔ سوزوکی ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ گل جان کے چچا کا گھر۔

انجن بند ہوتے ہی چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں گاڑی کے اردگرد یوں اکٹھے ہو گئے جیسے پولیس کسی چور ڈاکو کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر لیتی ہے کہ مبادا وہ کہیں بھاگ نہ نکلے۔

بڑے سے چوبی دروازے پر دو عورتوں نے استقبال کیا۔ ایک جوان اور دوسری بوڑھی تھی۔ نوجوان عورت کے سر پر رکھی ٹوپی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن خلافِ رواج اُس کا صاف ستھرا لباس دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ٹوپی خوبصورت کڑھت سے مزین ہو گی۔ گرم سرخ چادر کو یوں اوڑھا گیا تھا کہ دائیں اور بائیں پلو سر پر جا کر جھالریں سی بن گئے تھے۔ اس کی سرخی مائل رنگت چادر کے عکس سے کچھ اور بھی سرخ ہو گئی تھی۔

دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔گل جان کی ماں نے تعارف کروایا تو محبت بھری مسکراہٹ ان کے ہونٹوں اور آنکھوں میں پھیل گئی۔

کمرے میں اونی دری بچھی تھی۔دری کا رنگ و روپ سب مٹ مٹا چکا تھا۔گھر سر سے پیر تک چوبی پیرہن پہنے ہوئے تھا۔دیواریں چھت فرش سبھی بتا رہے تھے کہ لکڑی یہاں کتنی ارزاں ہے۔انگنائی کی دیواریں بھی پتھروں کی بجائے لکڑی کے بڑے بڑے شہتیروں کو اوپر نیچے رکھ کر بنائی گئی تھیں۔

چائے نمکین تھی۔ساتھ میں میٹھے بسکٹ تھے۔چائے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر میں صادق اور فرس خان کے ہمراہ بابوسر کا چکر لگانے کے لیے تیار تھی۔بوڑھی عورت نے ہنستی آنکھوں سے کچھ کہا تھا۔صادق فوراً ترجمان بن گیا۔

''پوچھتی ہیں کہ رات کو کیا کھائیں گے؟''

''جو آپ کھلادیں''۔میں نے صادق کی طرف دیکھا۔

ہم دونوں ہنس پڑی تھیں۔

اچانک گل جان اٹھی۔اس نے چادر ٹھیک کی اور ماں سے کچھ کہنے لگی۔ماں نے ابروؤں کو اوپر چڑھاتے ہوئے خفگی سے گھورا۔اس کے تیز لہجے میں ڈانٹ بھی محسوس ہوتی تھی۔معمر عورت گو خاموش تھی لیکن سینے پر ہاتھ باندھے خط مستقیم کی طرح اکڑی کھڑی چہرے پر ابھرتے تاثرات کے ساتھ اس سارے عمل میں حصہ لے رہی تھی۔

عقدہ کھلا کہ گل جان ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ماں روکتی تھی۔لیکن باپ کی عدم موجودگی میں وہ ماں کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔اور وہ ساتھ جانے میں کامیاب ہوئی۔نوجوان عورت کی اسے شہہ حاصل ہوئی تھی۔نوجوان عورت صادق کی حقیقی خالہ اور گل جان کی چچی تھیں۔

جس وقت گھر سے نکلے اس وقت گھڑی تین بجا رہی تھی۔دھوپ پہاڑوں کی

چوٹیوں پر تھی ۔وادی پر سائے کسی خوبصورت نازنین کے چہرے پر پڑی نقاب کی طرح تھے ۔بازار چھوٹا سا تھا۔ذرا اُوپر چند ضلعی دفاتر کی عمارات نظر آتی تھیں۔

وادی میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھا جائے تو بابوسر ٹاپ نظر آتی ہے ۔یہ اور بات ہے کہ دید کی اس کشمکش میں سر چکرانے لگتا ہے اور گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے ۔پہاڑ مٹی کے ہیں اور ان پر گھنے جنگلات ہیں ۔جن میں صنوبر دیودار ،پڑتل اور کائل کے درختوں کی بہتات ہے۔

فرس خان کی سوزوکی بھاگتی جا رہی تھی ۔وادی میں جا بجا کاغذی اخروٹوں کے درخت تو نظر آتے تھے ۔لیکن سیب اور خوبانی کے پیڑ نہیں تھے۔

گل جان بڑی جیالی لڑکی تھی ۔اس وقت چادر سے منہ ڈھانپے باہر دیکھی تھی۔

گندم کے کھیتوں میں پودوں کی اونچائی ڈھائی تین بالشت سے زیادہ نہ تھی۔ ہریالی نمایاں تھی ۔کٹائی کا عمل کہیں ستمبر میں جا کر ہوتا تھا۔

گندم کے کھیت پیچھے رہ گئے تھے ۔تھک نالے کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔راستہ زگ زیگ کی طرح بل کھاتا تھا۔

ہم لوگ بابوسر ٹاپ جا رہے تھے ۔۱۳۶۹۴ فٹ بلندی پر صادق مجھے گٹی داس کا میدان بھی دکھانا چاہتا تھا جو ٹاپ سے تقریباً تین فرلانگ اترائی پر تھا۔

ایسا خوفناک راستہ سچی بات ہے میں دم سادھے بیٹھی تھی ۔تیسرے کلمے کے ورد نے میری زبان خشک کر دی تھی ۔گل جان ہنستی تھی ۔پہاڑوں کی بیٹی جس کے لئے یہ سب ایک معمول کی طرح تھا۔

ٹاپ پر جیپ رک گئی ۔ہمارے سامنے کوئی ڈیڑھ پونے دو سو گز لمبا گلیشیر تھا۔ برف کا پہاڑ ۔میں اس پہاڑ پر کھڑی تھی ۔میں اسے چھو سکتی تھی ۔اسے دونوں ہاتھوں سے تھام سکتی تھی ۔عجیب سا تحیر ،ایک انوکھی اور نرالی چیز دیکھنے کی خوشی کے احساس نے مل جل کر

مجھے ایک ایسی مسرت سے ہمکنار کیا تھا جو کسی چھوٹے بچے کو پہلی بار کھلونا ہاتھ میں پکڑنے سے ہوتی ہے۔

چوٹی کے پہاڑ شکل وصورت میں انڈے کی مانند تھے۔ اب اترائی شروع ہوئی۔ اترائی چڑھائی سے زیادہ خطرناک تھی۔ راستہ ڈھلانی تھا۔ لیکن فرس خان بھی ماہر ڈرائیور تھا۔ اس کا بس چلتا تو کاغان کی وادیوں تک جا پہنچتا۔

''گٹی داس کا میدان۔ گل جان کہتی تھی بہار کے اوائل میں اس گھاس سے خوشبو نکلتی ہے۔''

ہم سب پاس پاس کھڑے تھے۔ چپ چاپ' لیکن اتنا میں جانتی تھی کہ میں اگر اس خوبصورت میدان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں کے حسن سے اپنی عشق دنیا داری میں لپٹی روح کو عشق حقیقی میں بدلنے کی تگ و دو میں مصروف تھی' وہیں صادق عشق مجازی میں جذب ہو رہا تھا۔ حسن فطرت سے آنکھیں سینکنے کی اسے بھلا کیا ضرورت تھی۔

گل جان کا چہرہ حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے تھے۔

فرس خان نے مغرب کی جانب انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہ دیکھئے''۔

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور سبزہ زاروں پر دوڑتا پھرتا ایک خوبصورت سا جانور میری بصارت کی زد میں آیا۔ اسے مقامی زبان میں توشوں کہتے ہیں۔ یہ صرف صبح اور شام اپنا پیٹ بھرنے کے لیے نکلتا ہے۔

واپسی میں فرس خان نے مجھے زیرے کے پودے دکھائے۔ یہ شکل صورت میں ہمارے ہاں کے برسین یا چٹالے کے پودے کی مانند ہوتا ہے۔ سفید یا کالے تلوں کے بوٹوں سے جس طرح تل گرتے ہیں بعینہٖ اس میں سے زیرہ گرتا ہے۔

ڈھلانی پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیپ ایک بار پھر رک گئی۔ صادق نے

بیری نمادرختوں کے جھنڈ دکھاتے ہوئے بتایا۔

یہ چلغوزے کے درخت ہیں۔پھل کوتوڑنا بڑا دلچسپ عمل ہے۔لوگ ٹولیوں کی صورت میں پہاڑوں پرآتے ہیں۔ دنوں یہاں رہتے ہیں۔توڑتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ہاتھوں کوسریش جیساما دہ لگ جاتا ہے۔جو چھٹائے نہیں چھٹتا۔آگ کےالاؤدہکائے جاتے ہیں۔توڑےہوئے خول اس میں ڈالنے سے ان کےمنہ کھل جاتے ہیں۔چھن چھن کرتے ہوئے جب وہ چادروں پرگرتے ہیں۔تب تچی بات ہے بہت لطف آتا ہے۔رت جگاہوتا ہے۔رقص اورگیت چلتے ہیں۔

اس وقت شام گہری ہورہی تھی۔گھنے جنگلات کا سلسلہ اندر ہی اندر پھیلتا چلا جاتا تھا۔چشموں کاشورفضا کوپراسراربنارہا تھا۔باوجودیکہ شیر،برفانی چیتوں،ریچھوں اور مارخوروں کااحساس رگ وپے میں خوف کی بجلیاں سی دوڑارہا تھا۔پھربھی میں چاہتی تھی کوئی من چلاشیر یاچیتاجیپ کےآگےآجائے اورنہیں تومرغ زریں ہی جھلک دکھادے۔

وادی کے پولوگراؤنڈ میں لڑکےوالی کھیل کراب گھروں کوواپس جارہے تھے۔

سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔مہم جوئی کےشوق میں سیاحت کےمحاذپر نکلتے ہوئے میں نے مختلف جگہوں کےموسم کاخیال نہیں کیا تھا۔تن پرایک قمیص اورگل جان کی چادرساڑھے تیرہ ہزارفٹ کی بلندی پرسردی کی لہروں کوروکنے میں بہت بودی ثابت ہوئی تھیں۔میرے شانوں کےاکڑاؤ کی کیفیت کچھ جولا ہے کےجنوائی کی لاش جیسی تھی جوغریب جوانمردی دکھانے کےشوق میں پوہ ماگھ کی ٹھٹھرتی رات میں کوٹھے پرجاسویا تھا۔ٹانگیں یوں محسوس ہوتا تھاجیسےکسی بیکارشےکوگھسیٹاجارہاہو۔اورناک کی پھنگی توجیسےکہیں راستے میں گرگراگئی تھی۔

دہلیز میں قدم رکھتے ہی میرادل چاہا کہ میں بھی اس دیوکی طرح جوگھرمیں داخل ہوتے وقت"آدم بوآدم بو" کی صدائیں لگاتا ہے۔روٹی روٹی کی آواز لگاؤں۔لیکن افسوس تو یہ تھا کہ میں دیونہیں انسان تھی۔پردیسی انسان جوروٹی کے لئے دوسروں کامحتاج

ہوتا ہے۔

کمرے کے بیچوں بیچ آگ جلتی تھی ۔ چولہے پر روٹیاں پکتی تھیں اور اودے اودے دھوئیں کے بادلوں نے چھت پر قبضہ جما رکھا تھا۔ میں نے آگ کے پاس بیٹھتے ہی اپنے دونوں ہاتھ جلتی لکڑیوں پر یوں پھیلائے جیسے میں انہیں بھی آگ میں جھونک دینا چاہتی ہوں۔ بڑی سی ہنڈیا چولہے کے پاس پڑی تھی ۔ ڈھکنے پر رکھی ڈوئی کو جو آمیزہ چمٹا ہوا تھا وہ ہنڈیا کے اندر پکے ہوئے سالن کی کچھ کچھ نشاندہی کر رہا تھا۔ یہ بجھیا تھی ۔لکڑی کے چوکور ڈبے میں گندھے آٹے سے معمر عورت پیڑے بناتی تھی ۔

بُھوک میری آنکھوں میں ندیدہ پن لے کر اتری ہوئی تھی ۔بس نہ چلتا تھا کہ کیونکر جھپٹا مار کر ساری روٹیاں اپنے آگے کرلوں ۔بھوک کیسی خوفناک شے ہے اس کا حقیقی انکشاف مجھ پر اس شب ہوا تھا۔

گل جان ہنستے ہوئے میرے پاس آئی اور بولی۔

''چنی ماں (خالہ) نے مردوں کو دیس کونکالا دے دیا تھا۔بیچارے شام سے گھر میں نہیں داخل ہوئے ۔ میں انہیں کہہ کر آئی ہوں کہ مہمان خاتون کون سا پردہ کرتی ہیں؟''

مجھے خفت محسوس ہوئی کہ صرف میری وجہ سے بیچارے شام کے ان پرمسرت لمحوں سے محروم ہورہے ہیں ۔میں نے فوراً کہا۔

''گل جان انہیں کہو کہ اندر آئیں ۔''

روغنی ہنڈیا کے پاس پڑی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر گل جان نے اندر جھانکا۔ناگواری سے نتھنے پھلائے اور بولی۔

''چنی ماں نے کیا ہند (پالک جیسی سبزی جو ذائقے میں قدرے کڑوی ہوتی ہے) پکالیا ہے کون کھائے گا سے۔''

ماں نے غالباً اسے ڈانٹ دی تبھی وہ اٹھ گئی تھی۔

دو مرد اندر آئے۔ایک نے گرم شوقہ (چوغہ) پہن رکھا تھا۔دوسرے نے چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ان کی شلواروں کے پائنچے کھلے کھلے اور پاؤں میں بوٹ تھے۔

میں گل جان کے کہنے پر وہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔جہاں رضائیاں تہ در تہ رکھی ہوئی تھیں۔گل جان کھانا لے کر آئی۔دو پلیٹیں ایک میں آلو گوشت کا شوربا اور دوسری میں ہند کی بھجیا۔روٹیاں موٹی موٹی تھیں۔

میں نے سر جھکا کر کھانا شروع کیا اور تب اسے اوپر اٹھایا جب گل جان نے قریب آ کر کہا۔

چنی ماں (خالہ) کہتی ہیں ہند کو مسکہ (تازہ گھی) کا تڑکا لگا دیں۔''ارے نہیں میں نے آلو اور شوربے میں نوالہ لتھیڑتے ہوئے کہا۔اس وقت میرا دل کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔سوائے کھانے کے۔آلو نہایت لذیذ تھے۔بابوسر کے آلو اپنے ذائقے کے اعتبار سے بہت لذت رکھتے ہیں۔ہند کو میں نے چکھا ضرور لیکن اس کی کڑواہٹ نے مجھے اس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے روک دیا تھا۔

گل جان کی سب سے چھوٹی چچی پشمہ بیگم جو قریب ہی رہتی تھیں ملنے آئیں۔اس نے فرن (پٹو کی لمبی قمیض) جس کے دامن اور گلے پر رنگارنگ دھاگوں کی کڑھائی لالٹین کی روشنی میں بھی اپنے رنگوں کی نمائش کر رہی تھی پہن رکھی تھی۔اس کی چمک دار نیلگوں غلافی آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔بولتی آنکھیں بولتے ہونٹ بولتا چہرہ اداؤں کے بانکپن سے شکار کرنے والی عورت۔پشمہ بیگم۔میں نے ازحد دلچسپی اور حیرت سے اس کردار کو دیکھا تھا۔

گھر کے مرد کھانا کھا رہے تھے۔بڑی سی پرات کے گرد بیٹھے تھے۔بوٹیاں ہاتھوں میں تھیں اور روٹی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں شوربے میں ڈوبی ہوئی تھی۔کھانے کا یہ عمل ایک طرح اخوت ومحبت کی بہترین مثال تھی۔لیکن مجھے تھوڑی سی

گھن آئی ۔ یہ یقیناً نئی روشنی نے میرے اندر پیدا کی تھی جو جھوٹ سے جراثیم اور بیماریاں پھیلنے کا سبق دیتی ہے۔

گل جان کی چھوٹی بہن کو بخار تھا۔چولہے پر جوشاندہ سا پک رہا تھا۔معلوم ہوا تھا کہ یہاں ڈاکٹری دوائیوں کا رواج نہیں ۔بس جڑی بوٹیوں سے کام چلتا ہے۔آرٹی میشا ایک بوٹی موسمی بخار کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

گل جان نے چائے کا پیالہ میرے ہاتھوں میں پکڑایا۔گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے دفعتاً مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میں اسی ماحول کا ایک حصہ ہوں ۔زمانوں سے یہاں رہتی چلی آ رہی ہوں ۔ماضی سے میرا کوئی ناطہ نہیں ۔لیکن ان محسوسات کی عمر بس چند لمحوں کی ہی تھی۔

چائے کا خالی پیالہ دری پر رکھنے کے بعد میں نے پشت رضائیوں کے ساتھ ٹکائی ۔چادر میں اپنے آپ کو لپیٹا۔پتہ نہیں کب مجھے نیند آ گئی ۔یقیناً گل جان نے رضائی میرے اوپر ڈالی ہوگی ۔تکیہ بھی اس نے رکھا ہوگا۔

جب میری آنکھ کھلی ۔لالٹین کی لو مدھم تھی۔آگ یقیناً بجھی ہوئی تھی ۔کمرے میں تیرتی پھرتی ٹھنڈک اپنے آپ کا احساس دلا رہی تھی ۔رات کا پتہ نہیں کونسا پہر تھا۔لیکن چند لمحوں بعد میری پوری کھلی آنکھوں کی کیفیت نے مجھے یہ بتایا کہ صبح قریب ہے۔کسلمندی یا بے خوابی کا ہلکا سا اثر بھی مجھے خود پر محسوس نہیں ہوتا تھا۔میں نے پوری نیند لی تھی۔

اچانک مجھے گھبراہٹ سی ہوئی ۔ایک نیا سفر پھر میرے سامنے تھا۔فرس خان سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ مجھے علی الصبح بابوسر سے لے کر چلے گا۔چلاس سے میں کسی بھی ویگن کے ذریعے گلگت جا سکتی ہوں۔

باہر چشموں کا شور تھا۔اس شور کو سنتے سنتے مجھے اذان کی آواز سنائی دی۔یہ مانوس آواز جس کی موجودگی میں مختلف زبانوں ،اجنبی جگہوں ،مانوس لوگوں اور فاصلوں کی

دوریاں کبھی مٹ جاتی ہیں۔

میں نماز کے لئے اٹھنا چاہتی تھی۔لیکن سب لوگ ابھی خراٹے لے رہے تھے۔ میں دم سادھے پڑی رہی تھوڑی دیر بعد نی سانے آگ جلائی۔ میں نے رضائی پرے پھینکی۔چشمے کا پانی ٹھنڈا یخ تھا۔وضو کیا' نماز پڑھی' دعائے خیر مانگی۔چائے کا پیالہ ابھی ہاتھوں میں ہی تھا کہ فرس خان اپنی جیپ کے ساتھ باہر آ گیا تھا۔صادق مجھے بلانے آیا۔ سوئی سوئی گل جان کے ماتھے پر میں نے بوسہ دیا۔اس کی آنکھیں کھلیں۔بازو میرے گلے میں آ گئے۔اس کی آنکھوں میں جوانی کی نیند کی یلغار تھی۔

''اللہ تمہیں ڈھیر سارے سکھ دے۔''

صادق کو خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے اس کے لئے ڈھیر ساری نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور اسے لاہور آنے کی دعوت دی۔گھر کی عورتوں نے مجھے گلے سے لگایا اور الوداع کہی۔

دھیرے دھیرے میں ایک ایسی دنیا سے دور ہوتی جا رہی تھی۔جہاں کے پہاڑ جنگلات سے بھرے ہوئے ہیں۔جہاں سلاجیت' زمرد' نیلم' ابرق جیسی قیمتی اشیاء پائی جاتی ہیں۔جہاں کے لوگ قدامت پسند اور اپنی روایت پر مر مٹنے والے ہیں۔جہاں خاندان در خاندان دشمنوں کے سلسلے چلتے ہیں۔جہاں کے لوگ قول کے پکے اور سچے مسلمان ہیں۔

گلگت کے لئے ویگن میں بیٹھنے سے قبل میں نے فرس خان کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔میرے لہجے میں ممتا جیسی شفقت امنڈ آئی تھی۔جب میں نے کہا تھا۔

''فرس خان زندگی نے تمہیں دُکھ دیئے ہیں تو اس کے پاس تمہارے لئے خوشیاں بھی ہیں۔دکھوں کا بوجھ تو تم نے اٹھا لیا ہے لیکن خوشیوں کا حصہ وصول کرنے سے کیوں گھبراتے ہو؟ شادی کرو۔گھر بساؤ۔زندگی کی ہما ہمی میں کھو جاؤ۔

''ہاں کبھی نیچے آؤ تو میرے گھر ضرور آنا۔''

باب:6

خوابوں کی جنت گلگت۔ گلگتی گھرانہ
آزادیٔ شہدا کی یادگار

''پاتھی کورس'' نے اگر کرسٹوفر کولمبس کے دل میں دنیا کی حقیقتیں جاننے کی لگن پیدا کی تھی تو میرے بچپن کے وہ دن بھی ''کورس'' کی کتاب جیسے ہی تھے کہ جس کے ہر صفحے پر گلگت کو دیکھنے اور اس کو جاننے کی ایک تڑپ تھی۔

ہمارے گھر کے بڑے سے دروازے سے نکل کر جب میری مامی اپنے شوہر اور کبھی کبھی میری ماسیاں (خالائیں) اپنے بھائی کے پاس جہاز میں لدلدا کر گلگت جاتیں اور واپس آ کر رابرٹ رپلے کی طرح ایسی ایسی پر اسرار کہانیاں اور باتیں سناتیں کہ مارے تحیر کے ہم لوگ آنکھیں جھپکنا بھی بھول جاتے۔ جب کہانیاں ختم ہوتیں تب وہ اٹھتیں سٹور میں پڑے بڑے بڑے بوروں میں سے خشک خوبانیاں اور توت نکال لاتیں پھر ہم بچوں کی ہتھیلیوں پر مٹھی بھریوں رکھتیں جیسے دروازے پر کھڑے فقیر کے پھیلے کشکول میں نخرے والی گھر گھرہستن آٹا ڈالتی ہے۔

میٹھی ذائقہ دار پٹھور (خشک خوبانی) کھاتے کھاتے میرا جی چاہتا میں ایک پرندہ بن جاؤں۔ جہاز کے پروں سے لٹک جاؤں اور اس پر اسرار دنیا میں کھو جاؤں۔

لیکن میں کرسٹوفر کولمبس کی طرح بلند ہمت نہ تھی اور نہ ہی مجھے ملکہ آئس بیلا جیسی کسی مہربان ہستی کی مدد حاصل تھی۔

اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ آج میں گلگت جا رہی تھی۔ اسی گلگت کی

طرف جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔

ویگن میں کوئی پندرہ مسافر ہو نگے۔میرے ساتھ دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ایک بیمار اور دوسری تندرست۔لیکن مجھے بیمار تندرست اور تندرست بیمار نظر آتی تھی۔رنگ برنگے موتیوں کے زیور جسے وہ مشٹی کہتی تھی اس کا گلا سجا ہوا تھا۔سر پر سرخ ٹوپی اور شوخ رنگ کی چادر سے اس کا جسم ڈھنپا ہوا تھا۔کوئی اندرونی تکلیف تھی جس کے لئے وہ گلگت ہسپتال جا رہی تھی۔

کورز کے پاس پہاڑوں کی چوٹیاں سرسبز درختوں سے یوں ڈھکی ہوئی تھیں جیسے برجیوں نے سائے کئے ہوں۔ریکوٹ کے دائیں ہاتھ سندھ بہہ رہا تھا۔یہیں استور کے پل پر فوج کام کر رہی تھی۔استور کی سڑک کچی ہے۔اس پر کولتار بچھانے کا کام شروع تھا۔ دور سے یہ سڑک یوں نظر آتی تھی جیسے کسی نے پہاڑ کا جگر تیز چاقو سے خراش دیا ہو۔

دریائے سندھ کا پانی مٹیالا تھا یوں جیسے اس میں سیمنٹ گھولا ہوا ہو۔راستہ نہایت پرخطر، پہلو بہ پہلو کھڑے اور رلیٹے پہاڑ،سڑک بے حد تنگ۔کبھی کبھی یوں لگتا جیسے ابھی پل میں گاڑی ہزاروں فٹ نیچے گہرے کھڈوں میں گر جائے گی۔چوٹیوں پر جمی برف کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے سانولی عورت کے چہرے پر برص کے دھبے ہوں۔کسی جگہ پھیلاؤ آ جاتا۔ دریا دور ہو جاتا۔دھوپ بڑی تیکھی تھی۔

جگلوٹ کی آمد کا اعلان سبزے سے ہوا۔سڑک کے کنارے دو رویہ سفیدے کی قطاریں کہیں کہیں پرانا چنار کا درخت بھی نظر پڑتا۔سفر اب بتیس تینتیس میل رہ گیا تھا۔ جگلوٹ ختم ہوا۔ساتھ ہی سبزہ بھی ختم۔اب پھر وہی لق ودق راستہ وہی پر ہیبت پہاڑ۔کچھ آگے جا کر دریائے سندھ اور سکردو جانے والی سڑک دائیں طرف کو مڑ گئے۔

وادی بڑی شاہراہ ریشم کے دائیں جانب رہ گئی تھی۔سڑک اب دریائے گلگت کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔چھمو نگر میں بچے سڑک کے کنارے سلور کی تھالیوں میں خوبانیاں

دسیب اور انجیر لئے کھڑے تھے۔ایک ایک روپے میں تھالی' مسافروں نے فوراً ساری تھالیاں خالی کردیں۔میں نے بھی بیگ بھرلیا۔انجیر کو منہ میں رکھا تو وہ اندر کی حرارت سے پگھلتا ہوا پل بھر میں حلق سے نیچے اتر گیا۔رسیلا اور ذائقہ دار۔اللہ اگر زمین کے انجیر کی مٹھاس اور لذت کا یہ عالم ہے تو جنت کا یہ پھل کیسا ہوگا؟

جلال آباد میں دریا ایک چھوٹی سی نہر کی صورت میں بہتا تھا۔دنیور کے بعد ہم وادی گلگت میں داخل ہو گئے تھے۔

گلگت قریب آیا۔ویگن نے جوبلی ہوٹل کے پاس اُتار دیا۔ہوٹل میں جا کر میں نے ائیرپورٹ فون کیا۔یہاں بھی مجھے ایک مقامی فیملی کے پاس ٹھہرنا تھا۔فون پر غلام محی الدین صاحب کو بتایا کہ میں لاہور سے آئی ہوں اور ان کے دوست زین العابدین کی بھتیجی ہوں۔

انہوں نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا کہ فی الفور ائیرپورٹ آجایئے۔

ہوائی اڈے کی دیدہ زیب عمارت کے کوریڈور میں بالائی منزل کی سیڑھیوں کے تیسرے پوڈے پر ایک ادھیڑ عمر کے سرخ وسفید مرد نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔میں ذرا بدکی پھر یہ سوچتے ہوئے کہ شاید یہ مقامی معاشرتی آداب میں شامل ہے ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

اس وقت لوگوں کا ایک جم غفیر شوریدہ سر لہروں کی طرح اندر باہر موجیں مارتا پھر رہا تھا۔صورت حال ایسی تھی کہ بے چاروں کا بس نہ چلتا تھا کہ جہاز کے پروں سے لٹک جائیں۔میرے میزبان آخری پرواز کی روانگی کے انتظار میں مصروف تھے۔مجھ سے آدھ گھنٹے کی معذرت کر کے چلے گئے۔

میں دومنزلہ عمارت کے ٹیرس پر جا کھڑی ہوئی۔یہاں وادی گلگت کا انتظار ایسا دلکش تھا کہ تیز چبھتی دھوپ بھول گئی۔

گلگت کا نام پہلے گری گرت تھا۔گری گرت کے معنی پہاڑوں سے گھرا ہوا مقام ہے' کیونکہ چاروں طرف کوہ قراقرم اور کوہ ہندوکش کے سلسلے واقع ہیں۔ایک اور روایت کے مطابق گلگت سنسکرت کے لفظ گللگوت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔گللگوت کا مطلب قبرستان ہے۔قدیم زمانے میں یہاں بہت سی لڑائیاں ہوئیں ۔بے شمار آدمی قتل ہوئے ۔جابجا قبروں کی مناسبت سے اس کا نام گلگوت پڑا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گلگت گلگشت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ان کا کہنا ہے کہ گلگت کی زمین میں اتنی زرخیزی تھی کہ ہرطرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔

اس وقت جب میری آنکھوں کو وادی گلگت ایک سبز بلوری پیالے کی مانند نظر آئی تھی۔میرے ذہن کو اس کے نام کی وجہ تسمیہ میں تیسری روایت حقیقت سے قریب تر لگی تھی۔

رن وے کا منظر بڑا دل کش تھا۔

ایک گلگتی دلہن بیاہ کر نیچے جارہی تھی۔سسرالی خواتین ہر دو قدم پر رک کر دلہن کی چادر ٹھیک کرتیں۔

پتہ چلا کہ حیدر آباد کا ایک خاندان ملازمت کے سلسلے میں کافی عرصہ یہاں رہا۔ دلہن ان کی ہمسایہ تھی۔بس پسند آئی اور رشتہ داری جوڑلی۔خدا کرے کہ ایسی شادیاں پاکستان کے چاروں صوبوں میں ہونی شروع ہوجائیں۔یقیناً ایسے رشتوں کے بطن سے محبت ویگانگت کے سوتے ابلیں گے۔

جہاز کی پرواز کے بعد میں اندر سیکورٹی کے دفتر میں آکر بیٹھ گئی۔میرا سر تپ رہا تھا۔دھوپ میں اتنی شدت تھی کہ مجھے احساس ہوا تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور وہاں کھڑی رہی تو سیدھی ''سن سٹروک'' کے منہ میں چلی جاؤں گی۔

کمرے کی ٹھنڈی خوشگوار فضا نے میرے حواس پر اچھا اثر ڈالا۔کمرے میں موجود آفیسر ہنزہ کا رہنے والا تھا۔میں اس سے ہنزہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے لگی۔

جب اچانک کمرے میں ایک خوش پوش اور خوبصورت مرد اندر آیا۔تعارف ہونے پر پتہ چلا کہ میر غضنفر علی ہیں والئی ہنزہ۔میری ہنزہ جانے کی خواہش پر بولے۔

''کریم آباد کا راستہ بہت خراب ہے۔گنش سے جیپ والے تین چار سو ٹھگ لیں گے۔''

''پر جناب جانا تو ضرور ہے۔اب یہ کیسے ممکن ہے؟ گلگت آؤں اور ہنزہ ونگر دیکھے بغیر لوٹ جاؤں یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ لاہور آئیں اور تاریخی عمارات دیکھے بغیر واپس چلے جائیں۔

وہ ہنستے ہوئے بولے''چلئے گنش پہنچ کر اگر کسی مشکل کا سامنا ہوا تو مجھے فون کر دیجئے گا۔میں جو کچھ بن پڑا کروں گا''۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

ان کی فیملی آخری پرواز سے پنڈی گئی تھی۔وہ حکام کا شکریہ ادا کرنے کے بعد تشریف لے گئے۔وہاں موجود ہنزہ ہی کے ایک معمر مرد نے یہ کہتے ہوئے کہ آپ اکیلی عورت ہیں لہذا ہنزہ جانے کی غلطی نہ کریں۔مجھے جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔میرے دل کی وہ کلی جو میر آف ہنزہ کی باتوں سے کھلی تھی دبوڑھے مرد کی کڑوی کسیلی گفتگو کی تمازت سے جھلس سی گئی۔

تبھی غلام محی الدین اندر آئے۔کرسی پر بیٹھے۔میرے یوں آنے پر خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت کا اظہار کیا۔ان کی بیگم ہڈیوں کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھیں۔جس نے ان کا نچلا دھڑ بیکار کر دیا تھا۔پانچ چھ ماہ قبل وہ لاہور کے جنرل ہسپتال میں نیورو سرجن ڈاکٹر بشیر کے زیر علاج رہیں۔میں نے ان کی طبیعت کا پوچھا۔میرے استفسار پر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔پھر قدرے جھینپتے ہوئے بولے۔

''میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔دراصل گھر چوپٹ ہو گیا تھا۔''

ایک پل کے لئے جیسے میرا دل ساکت ہوگیا۔اگلے لمحے یوں تیزی سے دھڑکا جیسے اس سانحہ پر احتجاج کرتا ہو۔مرد کی دنیا میں عورت کی قربانی وایثاراور بھرپور رفاقت کی کتنی قیمت ہے؟اس کا حساب تو چارپائی پر بیٹھی وہ معذور عورت ہی دے سکتی ہے؛جس کی ذہنی دولت اور سکون لوٹنے کے لئے ایک اور عورت اس کی حریف کے روپ میں اس کے سامنے لاکھڑی کی گئی ہو۔

ان کے گھر جانے کے لئے جب میں اٹھی اس وقت میں دو بج رہے تھے۔

ایئر پورٹ کی چھوٹی سی عمارت کسی کم عمر دلہن کی مانند سجی سنوری اداؤں سے گھائل کرتی تھی۔باہر سوزوکیوں اور گاڑیوں کی خاصی بہتات تھی۔کونے میں دو چھوٹے چھوٹے کھوکھوں پر تازہ خوبانی اور آلو بخارہ سجا ہوا تھا۔

دھوپ میں کسی باغی جوان جیسی سرکشی تھی۔ایئر پورٹ روڈ کے دائیں کنارے پر جھومتے شاہ بلوط کے درختوں کی لمبی قطار اس سرکشی کا زور تھوڑا سا توڑ رہی تھی۔درجہ حرارت چونتیس اعشاریہ تین سنٹی گریڈ تھا۔محی الدین صاحب مجھے اپنی گھریلو کہانی سنا رہے تھے۔میں سوچ رہی تھی۔گھر سنبھالنے والی کوئی بچی نہیں ہوگی۔بیمار بیوی کے ساتھ گھریلو مسائل کا انبار ملازم آدمی کو پریشان کردیتا ہوگا۔

شاہ بلوط کی چھاؤں تلے چلتے چلتے میں نے انہیں ان کی دوسری شادی کے مسئلے پر رعایتی نمبر دے ڈالے تھے۔

کشروٹ محلّہ یادگار چوک کے پاس ہی ہے۔پتھروں کے گھر تنگ تنگ سی گلیاں جن میں خوبانی اور شہتوت کے درختوں کی چھاؤں باہر سے آنے والوں کو لطیف سی ٹھنڈک کا احساس بخشتی ہیں۔گلیوں کے درمیان بہتی چھوٹی سی کھال (نالہ) جس کے پختہ کناروں پر کم عمر لڑکیاں کپڑے دھونے اور چہلیں کرنے میں مگن تھیں۔نووارد خاتون کو دیکھتے ہی ان کے ہاتھ رک گئے۔چہروں پر تجسس عود آیا۔

میں کس گھر کی مہمان ہوں؟ ان کی متجسس نگاہوں نے دور تک میرا پیچھا کیا۔ بچپن میں ہم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ محلے میں کوئی اجنبی صورت دکھائی دے جاتی تو ہونقوں کی طرح اُسے سر سے پاؤں تک گھورتے گھورتے تو ڑ اس کے گھر تک پہنچا کر دم لیتے۔

یہ ایک کشادہ آنگن والا مکان تھا جہاں میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے برآمدے میں وہی معذور عورت چارپائی پر بیٹھی تھی جس کے متعلق تین فرلانگ کے فاصلے میں میں نے ڈھیر سارا سوچا تھا۔

مسکرا کر انہوں نے خوش آمدید کہا۔ بیمار چہرے پر صحت مند مسکراہٹ شاذونادر ہی نظر آتی ہے۔ یہ ایک دکھ بھری آوردہ ہنسی لگتی تھی۔

میں قریب بیٹھ گئی۔ بجلی بند تھی۔ برآمدے میں مکھیوں کا راج تھا۔ دستی پنکھے سے انہوں نے مجھے ہوا دینے کی کوشش کی۔ میں نے خجل سی ہنسی ہنستے ہوئے پنکھا ان کے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

دفعتاً کمرے سے دو نوجوان لڑکیاں نکلیں اور ''سلام خالہ'' کہتے ہوئے میرے دائیں بائیں آ کر بیٹھ گئیں۔ ایک کے چہرے پر نظر پڑتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی مہربان نے ٹہنی پر کھلے تازہ پنک گلاب کو توڑ کر اس گھر کے برآمدے میں پھینک دیا ہو اور دوسری اللہ جھوٹ نہ بلوائے سوفی صد ڈچز آف یارک شہزادی سارہ فرگوسن لگتی تھی۔ میں ٹک ٹک اُن کی صورتیں دیکھتی تھی۔ خاتون خانہ نے کہا۔ ''میری بیٹیاں ہیں۔''

''بیٹیاں'' میں نے ایک زوردار جھٹکا کھایا۔

ابھی میں اس جھٹکے سے سنبھلی بھی نہ تھی کہ ایک اور لڑکی کمرے سے نکل کر چوبی ستون کے پاس آ کر رک گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی سبز اوڑھنی کا عکس اس کی آنکھوں میں گھلا ہوا ہو۔ لیکن نہیں اس کی موٹی موٹی آنکھیں سبزی مائل تھیں۔ وہ چپ چاپ کسی مجسمے کی مانند کھڑی تھی۔

''میری سوکن'' خاتون خانہ کی آواز میں نفرت کی جو جھلک تھی وہ مجھے بخوبی محسوس ہو گئی تھی۔

صاحب خانہ بازار سے لدے پھندے آئے۔خمیری روٹی اور قیمے کا سالن کھانے کے بعد میں نے رسیلی خوبانیاں کھائیں۔تربوز کاٹا گیا۔سب لوگوں کو قاش قاش پکڑائی گئی۔غلام مصطفےٰ خاصے عیال دار تھے۔ بڑے چھوٹے بچے ملا کر نصف درجن سے اوپر جاتے تھے۔سب لوگ تربوز کھا رہے تھے۔لیکن وہ سبز اوڑھنی والی چپ چاپ سب کو تکے جاتی تھی۔مجھے یوں لگا جیسے شہد جیسے تربوز کا رس زہر بن کر میرے حلق سے اتر رہا ہو۔ میں نے صاحب خانہ سے کہا۔

''ارے اسے بھی تو دیں۔''

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر میں نے بقیہ دن کا پروگرام ترتیب دیا۔سرفہرست عروج اور اس کے میاں کی تلاش تھی۔

تین بجے میں شاہرہ قائداعظم اپنے قدموں سے کوٹ رہی تھی۔پارک ہوٹل، ٹورسٹ کاٹیج، سارگن ان، متکہ ان، قراقرم ان اور جوبلی ہوٹل سبھوں کو چھان مارا تھا۔یہ سب ہوٹل شاہراہ قائداعظم پر ہی واقع ہیں۔کسی نے ہنزہ ان اور چناران میں بھی دیکھنے کے لئے کہا۔دونوں بابر روڈ چنار باغ کے پاس ہی ہیں۔وہاں بھی پہنچی۔اللہ جانے انہیں گلگت کا آسمان کھا گیا تھا یا زمین۔تنگ آ کر میں نے ان پر دو حرف لعنت کے بھیجے اور چنار باغ کی سیر کے لئے آ گئی۔

چنار کے درختوں سے لدا پھندا یہ باغ میرے لئے اپنے حسن و رعنائی سے کہیں زیادہ دلکش اس لئے بھی تھا کہ یہاں جنگ آزادی کے شہدا کی یادگار اُن جیالوں کی جوانمردی اور شجاعت کی داستانیں سنا رہی تھی۔جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود وہ جنگ لڑی جس نے اگر انہیں آزادی جیسی نعمت سے نوازا تو وہیں فطرت کی یہ شاہکار

وادیاں پاکستان کا ایک حصہ بنیں کہ مجھ جیسی سیاح اپنے وطن کی ان جنت نظیر حصوں کو دیکھتے ہوئے فخر و انبساط سے کڑک مرغی کے پروں کی طرح پھولی جاتی ہے۔

یادگار کے دوسرے سیاہ پتھریلے پوڈے پر بیٹھی میں اپنے سامنے پھیلے کونوداس پہاڑ اور دریائے گلگت کے پار میدانوں میں ان سورماؤں کی گولیوں کی تڑتڑ سنتے ہوئے اس وقت کو یاد کر رہی تھی جب میں بہت چھوٹی سی تھی توتلی باتیں کرتی تھی۔شام کو چولہے کے پاس بیٹھی میری ماں جب راکھ کریدتے ہوئے رویا کرتی اور میں دلگیر سے لہجے میں اس سے رونے کا سبب پوچھا کرتی۔تب وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچ کر کہتی کہ ''تیرا منجھلا ماما کشمیر میں لڑ رہا ہے نا۔''

کشمیر کی لڑائی مدتوں میرے اعصاب پر سوار رہی۔

میری آنکھوں نے کوئی بیس بار ان ماموں کو پڑا تھا جنہوں نے اپنا آپ اور اپنا آج قوم کے کل کے لئے قربان کیا تھا۔

وہی کل میرا آج تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں کرنل مرزا حسن خان اور کیپٹن بابر کے مقبروں پر فاتحہ پڑھ رہی تھی میری آنکھیں پانی سے تر تھیں اور میرے ہونٹوں نے بے اختیار کہا تھا۔

''کرنل مرزا حسن خان اور کیپٹن بابر قوم کو آج بھی آپ جیسے جیالوں کی ضرورت ہے۔''

ہواؤں کی تیزی دریائے گلگت کی لہروں کے بھراؤ اور تندی نے مجھے ہوا اور سورج کی وہ کہانی یاد دلا دی تھی کہ جنہوں نے آپس میں ایک مسافر کے کپڑے اُتروانے کی شرط باندھ لی تھی۔

کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گلگت کی ہوائیں بھی کیسی ایسی ہی سازش میں شریک ہوگئی ہیں۔میں سنگ مرمر کے چبوترے پر جو دریا کے کناروں پر پانی کے اندر تک بنائے

گئے ہیں کھڑی کبھی اپنی قمیص کے دامن کو پکڑتی تھی اور کبھی چادر کو۔ پر ہوائیں تو کسی لڑاکی عورت کی طرح مجھے چھیاں دے رہی تھیں۔

اس وقت کا ہانپتا کانپتا سورج دوپہر والے شہہ زور سورج سے کتنا مختلف تھا؟ عروج و زوال کے بھی کیسے کیسے المیے ہیں؟ نظروں کے سامنے گلگت کا خوبصورت معلق پل بھی اس داستان کو دہراتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں وادی اشکومن کی ایک جھیل کرمبر میں گلیشر کا بند لگ جانے سے یہاں طوفانی سیلاب آیا تھا۔ قدیم پل کسی تنکے کی مانند بہہ گیا تھا۔ نیا پل بنا جسمیں وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔

مجھے یہاں کھڑے بہت دیر ہوگئی تھی۔ ایسا حسن پرور نظارہ تھا کہ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دریائے گلگت کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں سے کھیلتے ہوئے میں نے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو مغل شہزادی سمجھا۔ جن کی شامیں بہتے پانیوں پر بنی بارہ دریوں اور چبوتروں پر گزرتی تھیں۔

دور ایک ہوٹل تھا۔ کچھ لوگ چناروں کے سائے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ یہاں کھڑے ہو کر گرم چائے کی چسکیاں لوں۔ لیکن ایک اکیلی عورت کا یوں کھڑے ہونا اور سیر سپاٹا کرنا ہی قابل اعتراض کجا کہ چائے کی عیاشیاں بھی کرتی پھرے۔

واجب تھا کہ لوگوں کو اتنے سارے اعتراضات اور شک وشبہات کی بھول بھلیوں میں نہ پڑنے دوں۔

☆☆☆

باب:7

تاریخ گلگت کا ایک سچا اور قابل فخر کردار
شہزادی جوار خاتون

ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے۔سالوں قرنوں کی گزری پر چھائیں اپنے کچھاروں سے نکل کر رواں دواں ساعتوں کے سینوں سے آ چمٹتی ہیں۔وقت کے بہتے ہوئے پانیوں کی گم شدہ لہریں پھر سے مخالف بہاؤ پر بہنا شروع ہو جاتی ہیں۔تاریخ کے گزرے ہوئے واقعات پرانے جامے اتار کر نئے پہناوے پہن کر سامنے آ جاتے ہیں۔

وہ تاروں بھری رات تھی۔مصر کے آسمان پر بکھری اس رات جیسی جب شاہ عزیز کی ملکہ نے یوسف کے حسن و جمال کا نظارہ خوابوں میں کیا تھا۔کوہ ہندوکش' کوہ قراقرم اور ہمالیائی سلسلوں کے دامن میں لپٹی اس وادی میں جہاں سناٹا اور اندھیرا وقت کی گود سے لمحہ لمحہ سرک رہا تھا۔شہزادہ فردوس نے بھی ایک پری پیکر کا دیدار کیا تھا۔

آنکھیں کھول کر اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''پروردگار یہ میں نے کیا دیکھا ہے؟ ایسا چہرہ' ایسا حسن تو میرے آس پاس کہیں نہیں۔صبح وہ بے کل تھا۔مضطرب تھا۔کوئی ماورائی مخلوق' کوہ قاف کی کوئی پری' اپسرا کیا تھی وہ؟ جسے اس نے رات خواب میں دیکھا تھا۔وہ سوچتا رہا' الجھتا رہا' دنوں اس گتھی کو سلجھاتا رہا اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اس حسین شبیہ کو اپنی آنکھوں سے اپنے دماغ اور دماغ سے دل میں اُتار لیا تھا۔آنکھیں دل اور دماغ سبھی مطمئن ہو گئے تھے۔کیونکہ جب اور جس وقت اس کا جی چاہتا وہ تصویر یار دیکھ لیتا۔

میں چنار باغ سے جب لوٹی اس وقت گھر کے برقی چراغ جل رہے تھے۔آنگن

صاف ستھرا تھااور وہاں بستر بچھے ہوئے تھے۔خاتون خانہ ایک پر بیٹھی شفقت سے مسکراتی تھی۔

''کہاں کہاں کی سیر کی؟ ساتھی لوگ ملے''۔

میں نے ہنس کر ساری روئیداد سنائی انہیں۔

رات کے کھانے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تو محسوس ہوا کہ گھر والی باتوں کے موڈ میں ہیں۔انکی آنکھیں کچھ دکھانا اور ہونٹ کچھ سنانا چاہتے ہیں۔

میرے اس سوال پر کہ کچھ گلگت کے بارے میں بتایئے انہوں نے کہا تھا۔گلگت کی قدیم تاریخ ملکہ جوار خاتون کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔کیونکہ موجودہ گلگت کی زرخیزی دشادابی، تازگی اور آبادکاری اسی کے کاموں کی مرہون منت ہے۔

گلگت کو ڈوگروں کی غلامی سے آزاد کروانے اور اسے پاکستان کا ایک حصہ بنانے کا اعزاز کرنل مرزا حسن خان کے کھاتے میں جاتا ہے کہ جس کے بغیر تحریک آزادی شمالی علاقہ جات کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکتی تھی۔آپ دونوں میں سے کسے پہلے سنیں گی۔

گلگت کی یہ رات بہت خوبصورت تھی۔ہوا میں خنکی تھی اور ستارے سیاہ آسمان کے سینے پر کسی شوخ حسینہ کی چمکتی آنکھوں کی طرح مسکراتے تھے۔ماضی کو کریدے بغیر حال تک نہیں پہنچا جاتا۔میں نے اپنا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''چلئے آج کی شب ملکہ جوار خاتون کے نام کرتے ہیں۔''

بدر کامل تھی وہ رعنائیوں کا ایک تراشیدہ پیکر' حسن و شباب کا ایک لبالب بھرا جام' پر کیا مجال کہ اس جام سے ایک قطرہ بھی باہر چھلکا ہو یا کسی کو ایک گھونٹ بھی پینا نصیب ہوا ہو۔حتی کہ وہ بھی پیاسا تھا۔وہ جو اس کا محسن تھا۔راجہ احمد خان جس نے اُسے پناہ دی تھی اس کڑے وقت جب وہ اپنی سلطنت گلگت پر دشمن کے قبضے کے بعد بھاگی تھی۔

اپنی ریاست میں اپنے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔شاہی زندگی کے تمام لوازمات

مہیا کیے اور اس کے سر پر ملکہ کا تاج سجایا۔

یہ راجہ حاتم خان، گلگت کے مدار خاقان مرزا کی دُلاری بیٹی شہزادی جوار خاتون تھی۔

وہ دلیر تھی، شہ زور تھی، سپاہیانہ طرزِ زندگی کو پسند کرتی تھی۔ روایتی شہزادیوں اور ملکاؤں کی طرح خود کو زیور لتے سے سجانے کی بجائے تلوار کو پہلو سے لٹکاتی تھی۔ نیزہ کمان ہاتھ میں پکڑتی تھی۔

یہ آتی بہاروں کی ایک دل آویز سی شام تھی جب ہواؤں کا دامن بادام اور خوبانی کے شگوفوں کی خوشبوؤں سے بوجھل تھا۔ جب سارے میں جنگلی گھاس اور عناب کے پتوں کی مدہوش کن مہک حواس کو متاثر کرتی تھی۔ فضا کسی کنواری دوشیزہ کی مانند پاکیزہ تھی۔ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں پر سورج کی آخری کرنیں اس انداز میں اپنے جلوے دکھاتی تھیں کہ سونے اور چاندی کے دریا بہتے محسوس ہوتے تھے۔

ایسے میں وہ اپنے محل کے بالا خانے کی چھت پر کھڑی تیر اور کمان سے دور جھیل پر اڑتی مرغابیوں کو نشانہ بنا رہی تھی۔ کمان سے زن کرتے ہوئے تیر نکلتا اور فضا کا سینہ چیرتا ہوا مرغابی کے دل میں کہیں پیوست ہو جاتا۔

دفعتاً وہ رک گئی۔ جنگلوں سے آتی اس خوشبو کو اس نے اپنے سینے میں اُتارنا چاہا پر پتہ نہیں کیوں اس کا دم گھٹنے لگا تھا؟

اس وقت ہوائیں پچھمی تھیں اور پچھم اسے ہمیشہ مضطرب رکھتا تھا۔ اپنے پہاڑوں پر جمی نگاہوں کا رخ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور اس سے ہمکلام ہوئی۔

کہتے ہیں کبھی کبھی تو اپنی آسمانی دنیا سے اتر کر نیچے بہت نیچے کسی کے دل میں آ جاتا ہے اور وہ سب کچھ جان لیتا ہے اور سن لیتا ہے جو وہ جانے کب سے تجھے سناتا چلا آتا ہے اور جسے تیرے کانوں کے بند دروازے ذرا سی درز کھول کر اندر نہیں جانے دیتے۔ کچھ ہرج ہے اگر آج چند لمحوں کے لئے تو میرے پاس آ جائے اور یہ جان لے کہ میں اپنے

وطن گلگت جانے کی آرزومند ہوں۔

تب بالاخانے کی سیڑھیوں کے آخری پوڈے پر محل کی پرانی خادمہ نسلاً ڈر دبیکینہ بروک پا دیودار کی چھڑی دیواروں سے ٹکراتی ظاہر ہوئی تھی۔اسکی تیز اور پاٹ دار آواز خاموش اور سناٹے میں ڈوبی فضا پر اسی طرح برسی تھی جیسے تھوڑا لوہے پر۔

''تمہارا اقبال بلند ہو۔ابھی ابھی سپدر (راجہ کے ملازم) دربار سے آئے ہیں۔ بتاتے ہیں تمہاری راج دھانی گلگت سے وزیر رشو آیا ہے۔اس کے ساتھ بے شمار نوکر اور خادم ہیں جو سبک رفتار گھوڑوں پر سوار یہاں پہنچے ہیں۔خوان پوشوں سے ڈھپنی سینیوں میں بہت قیمتی تحائف آئے ہیں۔ابھی تھوڑی دیر قبل وہ راجہ کے پاس پہنچے ہیں اور بس کسی بھی لمحے یہاں آیا چاہتے ہیں۔

وہ آپ کو لینے آئے ہیں۔گلگت کی راجدھانی آپ کو سونپا چاہتے ہیں۔آپ کو اپنی ملکہ بنانے کے آرزومند ہیں۔آپ سنتی ہیں نا ملکہ عالیہ!''

سماعت پر بجتی اس آواز کو اس نے حیرت سے سنا۔

ہاتھ میں پکڑی کمان اک ذرا لرزی تھی۔چھ فٹی قامت نے پورے سراپے میں ہلکا سا جھٹکا کھایا تھا۔اس نے آسمان کو دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''تو پھر تو آج نیچے آ ہی گیا کھلے کانوں اور کھلے دل کے ساتھ''

''میں تیری شکرگزار ہوں''۔

اور جب چوب چراغوں کی روشنی سے محل جگمگا رہا تھا وہ پرتمکنت چال چلتی دیوان عام میں داخل ہوئی تھی۔

پر اندر قدم بڑھانے سے پہلے وہ دہلیز میں رکی تھی اور اپنے ناقدانہ نظریں اندر پھینکی تھیں۔

وزیر رشو اور اس کے معتمد ساتھی کھڑے ہو گئے تھے۔سر کو تعظیمی جھکاؤ دینے کے

بعد جب وہ سیدھا ہوا تو دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور کچھ کچھ جانا تھا۔

سوا چھ فٹ کا پینتالیس سالہ مرد افگن دبلا کا زیرک چالاک اور کائیاں تھا۔ کمان جیسے ابروں اور گھنی پلکوں کی حفاظت میں سبزی مائل چمک دار شعلوں کی مانند دہکتی آنکھیں جن کی مماثلت کے بارے میں اس کے ذہن نے پل بھی نہیں لگایا تھا اور جان لیا تھا کہ یہ خونخوار چیتے کی آنکھوں سے بہت مشابہ ہیں۔

سپدروں (نوکروں) نے رشو کے اشارے پر خون پوش سینیاں شہزادی کے حضور پیش کیں۔

تب اس نے نہایت عجز و انکساری کے ساتھ مدعا پیش کیا۔

اس وقت گلگت کا تاج و تخت خالی ہے۔ صرف شہزادی جوار خاتون کی ذات شرعاً و رواجاً اس کی جائز وارث ہے۔ حق بحق دار رسید میرا ایمان ہے۔ اس لئے میں حاضر خدمت ہوا ہوں اور خواہش مند ہوں کہ شہزادی عازم گلگت ہوں۔

اس نے شہزادی کے خاوند راجہ احمد خان کو بھی پیشکش کی کہ وہ بھی اس کے ہمراہ چلیں اور ایک مشیر کی حیثیت سے شہزادی جوار خاتون کی مدد کریں۔

رشو سیاست کا شاطر کھلاڑی تھا۔ اقتدار کے جس سنگھاسن پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کی چند حماقتوں کی وجہ سے وہ ڈولنے لگا تھا۔ گلگت پر نگر کے راجہ شاہ کمال کا قبضہ تھا۔ پر یہ قبضہ برائے نام سا تھا۔ راجہ شاہ کمال کا بڑا بیٹا شہزادہ فردوس کبھی کبھی گلگت ضرور آتا پر انتظامی معاملات میں دخل نہ دیتا۔ اقتدار کی ساری کنجیاں رشو کی جیب میں تھیں۔ تکبر نخوت اور ذاتی شخصیت پرستی نے مکڑی کی طرح اس کے گرد جالا بن دیا تھا۔ امراء وزراء سے سلوک توہین آمیز تھا۔ معاملاتِ عدالت میں جانبداری کارفرما تھی۔ عوام میں ہیجان تھا۔ صورت حال کو سدھارنے میں شاہ کمال نے معذوری ظاہر کی تھی اور اب وہ عوام کی خواہشات کے مطابق

شہزادی کو لینے آیا تھا۔

وہ شہزادی کی سحر زدہ شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔لیکن اس کی سبز آنکھوں میں چھلکتے جاہ و جلال کے رنگوں سے اتنا وہ ضرور سمجھا تھا کہ اسے وہ کٹھ پتلی نہیں بنا سکے گا۔پر شطرنج کے ماہر کھلاڑی کی طرح مہروں کے ہیر پھیر سے اس نے بازی کا پانسہ اپنے حق میں پلٹ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس ضمن میں اٹھایا جانے والا پہلا قدم دانشمندی اور تدبر سے پر تھا۔شہزادی جوار خاتون کو احمد خان کی زوجیت سے آزاد کروا کے اس نے شہزادی کو حد درجہ ممنون کیا تھا۔

دوسرے ٹھاٹھ باٹ اور شان وشوکت سے شہزادی کا شاہانہ جلوس گلگت کی طرف روانہ کیا۔

دینور کے قریب شہزادی کا استقبال گلگت کے باسیوں نے حفظ مراتب کے ساتھ کیا۔رونو (شاہی خاندان) شین (درباری امراءووزراء) اور ان کے پیچھے یشکن (عوام)۔ لوگوں نے محبت وخلوص اور جوش عقیدت سے شہزادی پر پھولوں اور موتیوں کی بارش کی۔ڈوم (ناچنے گانے والے) قوم اپنے آلات موسیقی کے ساتھ موجود تھی۔فضا میں شہنائی کی آوازیں بکھری ہوئی تھیں۔کہیں کوئی من چلا ستار بجا رہا تھا۔ڈوم عورتیں رقص اور مرد گیت گا کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

خوبرو شہزادی چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتری تھی۔اس کی خوبصورت آنکھیں اتنی پرتپاک پیشوائی پر گیلی ہو رہی تھیں۔وہ فرداً فرداً سب کے پاس گئی۔انکساری سے ان کے احوال دریافت کرتی رہی۔

پھر لوگوں کے ہجوم میں اس کی سواری قلعہ فردوسیہ کے شاہی محلات میں داخل ہوئی۔

محل میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام سجدہ شکر کی ادائیگی تھا۔

وہ نبض شناس تھی اور نظر شناس بھی مگر تھوڑا سا دھوکا کھا گئی۔تاج پوشی کی رسم دو دن بعد تزک و احتشام سے منائی گئی۔اس وقت جب دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور درباری لوگوں کے چہرے وفورِ مسرت سے گلنار تھے وہ کھڑی ہوئی اور اس نے کہا۔

ان تاریخ ساز لمحوں میں میں اسلام کے جید عالم ابن سماک کی خلیفہ ہارون الرشید سے گفتگو کا حوالہ دوں گی۔خلیفہ شدید پیاسے تھے۔دربار میں ہی پانی کا پیالہ طلب کیا۔

عین اسی وقت ابن سماک نے پوچھا ''یہ پانی اگر آپ کو نہ مل سکے تو اس کی کیا قیمت دینا پسند کریں گے''۔

''نصف سلطنت بھی سستی سمجھوں گا۔''

پانی آیا۔انہوں نے پیا۔دوبارہ سوال ہوا۔''یہ پانی اگر آپ کے پیٹ سے نکلنا چاہے اور نہ نکلے تب کیا کریں گے؟ خلیفہ جواب دیتے ہیں ''باقی سلطنت بھی دے دوں گا''۔

ابن سماک نے فرمایا ''تو یہ جان لیجئے امیر المومنین کہ آپ کی ساری سلطنت ایک گھونٹ پانی اور چند قطرے پیشاب کی قیمت کے برابر ہے تو پھر اس پر کیا تکبر کیسا؟

چونکہ ایک طویل عرصے کی جلاوطنی کے بعد مجھے سلطنت کے حالات کو سمجھنے اور جاننے کے لئے وقت درکار ہے۔اسلئے وزیر رشو میرے قائم کے طور پر کام کریں گے۔میں ان سے یہ توقع کروں گی کہ وہ رعایا سے حسن سلوک کریں اور ہمیشہ اپنی عاقبت کو مدنظر رکھتے ہوئے عدل و انصاف کا میزان قائم رکھیں اور اس سلطنت کو اپنے لئے ایک آزمائش جانیں۔

اور اس نے دیکھا تھا وہی چہرے جو تھوڑی دیر قبل مسکرا رہے تھے۔شاداں و فرحاں تھے۔وہ یکلخت سناٹوں کی زد میں آ گئے۔یوں لگتا تھا جیسے کسی جابر نے ان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا سرخ خون کشید کر لیا۔

اس نے سر جھکالیا تھا۔کچھ سنے اور پوچھے بغیر وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔ پر زبان سے نکلی ہوئی بات اس تیر کی طرح تھی جو کمان سے ایک بار نکلنے کے بعد واپس نہیں آتا۔

باشعور اور رسیدا رمغز شہزادی حالات سے جلد آگاہ ہوئی۔ارا کین دربار کو تسلی و تشفی دے کر مطمئن کیا اور رشو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب یہ معمول بنا کہ عوام کی تکلیف اور ان کے خانگی معاملات کا جائزہ لینے کے لئے وہ ریاست کے گشت پر نکل جاتی۔فنون سپاہ گری میں طاق اور شکار کی بے حد شوقین تھی۔شکار کا تعاقب پیدل اس تیزی سے کرتی تھی کہ کوئی تیز رفتار مرد بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ وہ دریائے گلگت و ہنزہ کے ساتھ کچی سڑک پر گھوڑا دوڑاتی متم داس کی وادی سے آگے نکل گئی۔یہاں سے نگر کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔اس وقت دھوپ بہت تیز تھی۔گھوڑا تھکا ہوا تھا اور خود اس کی زبان پر پیاس سے کانٹے پڑے ہوئے تھے۔گھوڑے کو خوبانی کے ایک پیڑ کے نیچے باندھ کر وہ خود کسی چشمے کی تلاش میں پیدل ہی چل پڑی۔ کافی آگے جا کر سپروس کے درختوں کی چھاؤں میں اس نے کچھ انسانوں کو سوتے ہوئے پایا۔ذرا فاصلے پر گھوڑے آرام کرتے تھے۔پانی کا مشکیزہ اور چند کٹورے بھی وہیں پڑے تھے۔گھوڑوں کے قد بت ان کی صورتیں اور وہاں موجود چیزیں ان کے حسب نسب کی نشان دہی کرتی تھیں۔راجہ لوگ معلوم ہوتے تھے۔جو شکار کے لئے نکلے ہوئے تھے۔

اس نے پانی پیا اور واپسی کے لئے قدم اٹھائے۔پر جھٹکا کھا کر یوں رکی جیسے قدموں کو آگے کھائی نظر آ گئی ہو۔دو ہاتھ کے فاصلے پر ایک نوجوان دونوں بازو رخساروں کے نیچے رکھے سوتا تھا۔

یوں لگا جیسے سورج دیوتا اور اس کا رتھ آسمان کے سینے پر دوڑتا دوڑتا اچانک زمین کے اس گوشے پر ٹوٹ کر گر گیا ہو اور اب سوتا۔

اس نے چند بار پلکیں جھپکیں اور پھر رخ موڑ لیا۔

وہ برفانی تودے سے ٹوٹے ہوئے اس ٹکڑے کی مانند تھی۔ جو سورج کی کرنوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی پتھر جیسا بنا رہتا ہے۔

لیکن گھوڑے پر جب چھلانگ مار کر بیٹھی تو محسوس ہوا جیسے پتھر ٹوٹ پھوٹ رہا ہے اور برف کا تودہ پگھلنے لگا ہے۔

اس کا جی چاہا تھا وہ اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس کا رخ سپروس کے درختوں کی طرف موڑ دے جہاں کوئی سوتا تھا۔

دنوں وہ بے کلی کا شکار رہی۔ پھر اس نے سورج دیوتا کو اپنی پلکوں کی چھاؤں میں بٹھایا اور خود سلطنت کے کاموں میں جذب ہوگئی۔ کبھی کبھی فرصت کے لمحوں میں اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور یوں وقت گزرتا گیا۔

پورے ملک کا دورہ کرنے سے شہزادی پر واضح ہو گیا تھا کہ غریب عوام میں وزیر رشو کی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں سے ہیجان ہے۔

اب مداخلت اور روک ٹوک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رشو آمریت اور مطلق العنانی کے منہ زور اندھے گھوڑے پر سوار تھا۔ جسے روکنا ٹوکنا اسے گوارا نہ تھا۔ عوام میں شہزادی کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی بھی اس کے لئے خطرے کا نشان بن رہی تھی۔ اس کی سوچیں اب اس نقطے پر مرکوز ہو رہی تھیں کہ وہ کسی طرح شہزادی کا خاتمہ کردے۔

یہ خزاں کے دن تھے۔ کسانوں نے چاول، مکئی، کنگنی اور چینا (آنو) کی کٹائی کر لی تھی اور اب سردیوں کے انتظامات میں مصروف تھے۔ جب شہزادی نے بگروٹ جانے کا ارادہ کیا۔ بگروٹ شدید سردی کی زد میں رہنے والا پہاڑی علاقہ ہے۔

اس دورے کے دو اہم مقاصد شہزادی کے پیش نظر تھے۔ ایک باج اور خراج کا معاملہ دوسرے لوگوں کے مسائل کا جاننا۔ کیونکہ بگروٹ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے سال

میں صرف ایک فصل پیدا کرنا تھا۔

شہزادی کا بگروٹ کے قلعے سینکر میں قیام ہوا۔

اب رشو نے سوچا بس یہی موزوں وقت ہے۔اس نے اپنے خیر خواہوں کی ایک جماعت کو اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ فوراً قلعہ سنیکر کے دروازے پر قبضہ کر لے بگروٹ کی جانب روانہ کر دیا۔ان مسلح لوگوں نے شہزادی کی مہربانیوں اور نیکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سنیکر میں داخل ہوتے ہی سب کچھ اسے بتا دیا۔شہزادی نے انہیں انعام واکرام سے نوازتے ہوئے کہا ''رشو کو اطلاع دے دو کہ اس کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے''۔

وہ اسلحہ جنگ سے لیس ہو کر آیا۔شہزادی کے روبرو حاضر ہوا۔اس کا لہجہ درشت تھا۔آنکھوں میں رعونت اور تکبر کا رنگ تھا۔شہزادی کو تعظیم دیئے بغیر شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

''تم جانتی ہو۔اچھی طرح سمجھتی ہو۔والئی یاسین تمہارے دادا کا قاتل ہے۔نگر کا راجہ شاہ کمال تمہارے باپ خاقان مرزا کا مجرم ہے۔یہ صرف میں ہوں جس نے تمہاری جلاوطنی کو ختم کیا اور تمہیں تخت سونپا۔میری جوانمردی' دلیری اور شجاعت سے دشمن لرزاں ہیں۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔شہزادی کو اس نے گہری نظروں سے دیکھا اور پھر بولا۔

''تمہاری عمر اس وقت پچیس سال ہے۔میں تم سے پیار کرتا ہوں۔مجھ سے بہتر شوہر تمہیں نہیں مل سکتا یا مجھ سے شادی کرو اور یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔سوچ لو تمہیں زندگی قبول ہے یا موت۔''

شہزادی کا چہرہ غیض وغضب کی آگ سے دہکنے لگا تھا۔

''موت مگر اپنی نہیں تمہاری''۔

اس نے نیزہ رشو کے سینے پر مارا۔وہ بھی بلا کا شمشیر زن تھا۔مہارت سے اپنے

آپ کو بچا گیا۔شہزادی نے فن سپہ گری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خوبی سے وار کیا کہ رشو زمین پر گرا۔باہر لوگوں کو پتہ چل گیا تھا۔سٹیکر کے دلیر اور غیرت مند جوان قلعہ میں داخل ہوئے۔شہزاری کو انہوں نے منت سماجت سے ہٹایا اور آخری سانسوں پر رشو کو فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا۔

امراءوزراء کا ایک وفد فوری طور پر گبروٹ پہنچا۔اس سانحہ سے پہلے وادی بلچھار کے لوگوں نے شہزادی کو وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔اس نے اپنے معتمد وزراء کو ہدایات کے ساتھ گلگت روانہ کیا کہ وہ بلچھار کے دورے سے فارغ ہوکر پہنچتی ہے۔

وہ راکھاپوشی اور بلچھار دوبانی کی حسین چوٹیوں کو دیکھنے کی بہت مدت سے خواہش مند تھی۔اب اتنا قریب آ کر یونہی لوٹ جانا ٹھیک نہیں تھا۔اس نے سوچا۔

اس نے چوٹیوں کے حسن سے جی بھر کر آنکھوں کو سینکا۔وادیوں کے لوگوں سے دل کھول کر باتیں کیں۔ان کے مسائل جانے۔باج خراج معاف کیا۔پولو میچ کے کھلاڑیوں کو انعام دیئے اور سٹیکر کے لئے روانہ ہوئی۔اس وقت سورج نصف النہار پر تھا۔ اور گھوڑے تازہ دم تھے۔

راستہ بلاشبہ دیکھا بھالا نہ تھا پر جو لوگ ساتھ تھے وہ اتنے ناواقف بھی نہ تھے اور پھر بھی وہ بھٹک گئے۔پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں چند لوگ خیمہ زن تھے۔کائنات کے اس حصے کو ڈھانپتی سفیدی اور سیاہی کا ملا جلا عکس بڑا پراسرار اور خوفناک تھا کہ بھوج پتر اور رایش کی جلتی لکڑیوں کے شعلے لپ لپ کرتے آسمان کی طرف بھاگے جاتے تھے۔یوں جیسے اژدھے پھنکارے مارتے ہوں۔تین مارخور زمین پر پڑے تھے۔دو آگ پر بھونے جا رہے تھے۔چکور اور مرغابیوں کا ڈھیر ایک طرف پڑا تھا۔

شہزادی مردانہ لباس میں تھی۔آگ کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ذرا فاصلے پر تین چار مرد کچھ کام کاج میں مصروف نظر آتے تھے۔غالباً رات کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔

سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی آوازوں پر وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ گھوڑے سے کود کر شہزادی کے قدموں نے جب زمین کو چھوا تو نگاہوں کا رخ بھی اس سمت اٹھا جہاں ایک رعنا نوجوان کھڑا تھا۔ دونوں کے چہرے اور چمکتی آنکھیں آگ کی روشنی میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ دونوں پل بھر کے لئے لڑکھڑائے۔ انہوں نے پلکیں تیزی سے جھپکائیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور تعجب کے رنگ تھے۔ پر کمال سلیقے سے انہوں نے اپنے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔

علیک سلیک کا تبادلہ ہوا۔ تعارف کروایا گیا۔ لطف کی بات دونوں نے اپنا آپ چھپا لیا تھا۔ دونوں شہزادی جوار خاتون اور شہزادہ فردوس کے مصاحب بن کر ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ دونوں کے ساتھیوں نے خاموش ہونٹوں کے ساتھ ان کے اس جھوٹ پر سچ کی مہر ثبت کی۔

رات کا کھانا مارخور کے لذیذ گوشت اور قہوے پر مشتمل تھا۔ ایسا ہوا' ایک بار نہیں کئی بار' شہزادہ فردوس کی وارفتگی میں ڈوبی نگاہیں اس نے اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اپنے سارے سریر میں لطیف سے جھٹکے محسوس کئے تھے۔

دفعتاً اس نے کہا۔

ایک خاص ذاتی سوال اگر اجازت ہو تو پوچھوں؟

آپ کی کوئی بہن بھی ہے؟

شہزادی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی سبز بلوری آنکھوں سے تیز وحشیانہ چمک شہزادے کی جانب یوں لپکی تھی جیسے گھپ اندھیرے میں آسمانی بجلی کا لشکارے مارتا کوندا کسی راہ گیر پر گر پڑے۔

''کوئی خالص بات'' شہزادی نے تعجب سے پوچھا۔

''خاص بات۔ شہزادے نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ ہاں خاص بات ہی تو ہے۔

وہ جسے سالہا سال سے اپنے سینے میں دفن کئے بیٹھا ہوں۔آج اس کی جھلک نظر آئی ہے۔تو کچھ جاننے کی پوزیشن میں نہیں۔"

"بس ایسے ہی"۔اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

رات انہوں نے اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ الگ الگ خیموں میں کاٹی۔پر وہ سوئے نہیں۔جہاں شہزادہ فردوس اس انوکھے حادثے پر حیران وششدر تھا۔وہاں شہزادی جوارخاتون کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا۔

وقت رخصت مصافحہ کرتے ہوئے یکا یک شہزادے فردوس کو احساس ہوا تھا کہ اس کے مضبوط ہاتھوں میں پکڑا دوسرا ہاتھ نرمی اور گرمی کا دلکش امتزاج لئے ہوئے ہے۔

جیسے اس میں کچھ نسوانی پن ہو۔

انہوں نے راستہ سمجھا اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔

قلعہ سئیکر میں ایک دن قیام کرنے کے بعد شہزادی گلگت کے لئے روانہ ہوگئی۔

اب ملکہ کا اپنی شخصی حکومتی دور شروع ہوا۔اس نے زنانہ لباس مکمل طور پر اُتار پھینکا۔شاہی لباس زیب تن کیا۔عمامہ سر پر باندھا۔طلائی کمر بند باندھ کر اس کے ساتھ شاہی تلوار باندھی اور تخت پر بیٹھی۔

سنجیدہ وہوشیار و تجربہ کار اور صلاحیت مند افراد کا انتخاب کر کے انہیں مختلف عہدوں پر متمکن کیا۔رعایا کی فارغ البالی ملک کی آبادی اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں میں وہ اپنے آباؤاجداد پر سبقت لے گئی تھی۔چلاس واستور گریز اور گلگت خاص میں سڑکیں اور نہریں بنوائیں۔کوہل بالا اور کوہل پائیں (اوپر اور نیچے کی نہریں) داریل اور تانگیر کے لوگوں کی مدد سے نالہ بسین سے نکلوائیں۔سونی یب (رانی کی نہر) خومر اور جوٹیال کے درمیان سے نکلی۔

یہ شادمانی کا دور تھا۔امن وآشتی اور عیش وآرام کا زمانہ تھا۔جامع اصلاحات

کے نقاذ نے اسے سنہری ایام کا نام دیا تھا۔اس کا طرز جہاں بانی منفرد تھا۔

وہ مطمئن تھی،مسرور تھی۔پر کبھی کبھی مضطرب بھی ہو جاتی تھی۔اس کی بند پلکوں پر تھرکتی وہ صورت اب اسے زیادہ ستانے لگی تھی۔ابھی رات وہ اس کی ہمراہی میں ننیار باغ میں چکوروں کا شکار کھیلتی رہی تھی۔صبح دم جب آنکھ کھلی تو شاہی چھپر کٹ پر تھی۔سارے سریر میں دکھاور یاس گھل گیا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک بار جب وہ اپنے سالانہ دورے پر داریل، تانگیر اور ہربن کے علاقوں سے ہوتی ہوئی علاقہ کور (موجودہ گوہرآباد چلاس) میں آئی یہ جگہ ایک بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔پورا علاقہ نہایت دل کش، خوش منظر اور صحت بخش آب و ہوا کے لیے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔حسن و خوبصورتی سے معمور اس کی راجدھانی کا یہ حصہ اُسے بہت پسند تھا اور وہ اکثر یہاں دنوں پڑاؤ کرتی۔

اس بار دو باتوں سے وہ متفکر ہوئی۔بہت ساری زمین محض پانی کی کمی کی وجہ سے غیر آباد تھی۔یہاں آبادی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

اس نے حدنظر نگاہ ڈالی اور اپنے آپ سے کہا۔ایک نئی کوہل (چھوٹی نہر) یہاں زیادہ خوشحالی لانے کی ذمہ دار بن سکتی ہے۔اس لئے اسکا بننا بہت ضروری ہے۔

سرکردہ لوگ اس کی طلبی پر حاضر خدمت ہو گئے۔شفقت اور محبت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کسی دور دراز نالہ سے راستے میں حائل پہاڑوں اور چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر ایک نئی کوہل تعمیر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔لیکن یہ میری خواہش ہے۔میں اس بنجر اور ویران زمین پر آپ لوگوں کے کھیت کھلیان دیکھنا چاہتی ہوں۔''

لوگ خاموش تھے۔یہ تو گویا پہاڑ سر پر اٹھانے والی بات تھی۔

''بولیے، بتایئے۔چپ کیوں ہیں؟ آپ میری اس خواہش کو بال ہٹ نہیں کہہ

سکتے ۔ یہ تریاہٹ بھی نہیں ۔آپ لوگ میری ایسی خواہشات کے پس منظر میں میرے جذبات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔

مجمع پر چھائی خاموش ٹوٹی تھی ۔ایک شریں گفتار مرد جس کا نام طانوجشیرو تھا کھڑا ہوا۔دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اس نے کہا۔

''اگر جان کی امان پاؤں تو ملکہ کے حضور خاموشی کا عذر پیش کروں۔''

جواباً شہزادی نے کہا

''اجازت ہے ۔بلا خوف وخطر اپنے جذبات کا اظہار کرو۔''

طانوجش جشیرو بھرے دربار میں یوں گویا ہوا

''ہمیں احساس ہے کہ آپ کی ہر سوچ اور ہر خواہش کے پس منظر میں اپنی رعایا کے کسی ایک فرد کو بھی غربت زدہ یا مفلوک الحال دیکھنا گوارا نہیں۔لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ آپ اپنی مملکت کو نیک سیرت اور حمیدہ خصلت تاجداروں سے محروم بھی رکھنا چاہتی ہیں۔''

شہزادی جیسے حیرتوں سے بھرے پانیوں کی کسی جھیل میں دھڑام سے گر گئی۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔جو کہنا چاہتے ہو صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرو۔''

طانوجشیرو نے مودبانہ انداز میں بڑا اچھنبے والا سوال کردیا تھا۔

''شہزادی جوار خاتون آپ کے بعد تخت وتاج کا وارث کون ہوگا؟''

اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بھرے پڑے دربار کا ہر فرد ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔اندر کا اضطراب کرب کی صورت میں پسینہ بن کر اس کی پیشانی پر پھوٹ نکلا۔وہ گم سم سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔جب طانوجشیرو نے اس سکوت کو توڑا۔

''یہ میری ہی نہیں آپ کی قلمرو کے تمام عورتوں' مردوں' جوانوں' بوڑھوں کی

خواہش ہے۔خود سوچئے نا جس ملک اورعوام کے لیے آپ دن رات ہلکان ہو رہی ہیں۔ آپ کے بعد وہ آپ کے بدخواہوں کے تصرف میں ہوگا۔اپنی رعایا کو اس عذاب میں مت ڈالیں۔حضور قدرت کے اصولوں کے خلاف کام نہ کریں اور خاندان طرہ خان کے سلسلے کو ختم کر کے رعایا کو مایوس مت کریں۔

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔یہ کیسا امتحان ہے میرے خدا؟ آزمائش کی یہ کیسی گھڑی ہے؟ خوابوں کی اس جنت سے یہ کیسا دیس نکلا ہے؟

ہر فرد منتظر نگاہوں سے اُسے دیکھتا تھا۔اس نے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور اپنے آپ سے کہا۔

''میں دو دھاری تلوار کی زد میں ہوں۔ہاں کہتی ہوں تو اپنا گلا کٹتا ہے۔نہ کہتی ہوں تو یہ سب مرتے ہیں۔''

تب اس نے ان کی ملتجی نگاہوں کو اپنے دل میں اتارا اور کہا

مملکت گلگت کے بوڑھے مرد اور عورتیں میرے والدین، جوان میرے بہن بھائی اور بچے میری اولاد کی مانند ہیں۔اگر یہ سب کا فیصلہ ہے تو میں اس کے سامنے سر جھکاتی ہوں اور اس کا کلی اختیار آپ لوگوں کو سونپتی ہوں۔

بھرے مجمع نے فرط انبساط سے نعرے لگائے۔ایک دوسرے کو فرط جذبات سے گلے لگایا اور مبارکباد دی۔

پھر پروگرام کی تفصیلات طے پائیں۔دن اور وقت مقرر ہوا۔اکابرین سر جوڑ کر بیٹھے کہ کس ملک اور کس خاندان کا شہزادہ موزوں رہے گا۔

والئی یاسین کی طرف رجحان رکھنے والے ایک نمائندے نے اس خاندان کے ساتھ ناطہ جوڑنے کو کہا۔

اس تجویز پر معمّر ترین بزرگ نے قدرے غصے سے کہا۔

''کبھی ایسا مت سوچنا۔وائی یاسین کی اولاد محسن کش ہے۔وہ عوام کا گوشت کھاتے ہیں۔

حراموش کے علاقے کے کسی اکابر نے کہا کہ علاقہ سکردو کے مقبوں خاندان کا کوئی شہزادہ مناسب رہے گا۔

''ہرگز نہیں بلتیوں کی خوراک زیادہ تر زان ہے۔ان کی کمر کمزور ہوتی ہے۔وہ ہماری شجاع اور دلیر شہزادی کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔''

شاہی خاندان ہنزہ بھی رد ہوا۔پھر اسی بزرگ نے دھیرے دھرے کہنا شروع کیا۔میری ناقص رائے کے مطابق نگر کا شہزادہ بہت موزوں رہے گا۔اس نے دونوں خاندانوں کے درمیان رشتہ داری کا حوالہ دیا۔ان باتوں کو بھی زیر بحث لایا گیا جو شاہی خاندانوں میں وجہ تنازع بنے۔اس نے کہا میرے ساتھ طانو شیٹر واور دیگر معزز لوگوں کا ایک وفد جائے گا اور نگر کے راجہ شاہ کمال کے حضور اپنی درخواست پیش کرے گا۔

نگر میں وفد کا استقبال شاہانہ انداز میں کیا گیا۔شاہی محل میں انہیں اتارا گیا۔اور اگلے دن دربار عام میں شاہ کے حضور مدعا پیش ہوا۔

شاہ نے شکوے شکایتوں کا جو دفتر کھولا اُسے وفد کے سربراہ نے ذہانت اور متانت سے سمیٹا۔دلوں کی کدورت صاف ہوئی تو دونوں شہزادوں کو پیش کیا۔شاہ فردوس اور شاہ رحیم۔وفد کی نگاہ انتخاب شاہ فردوس پر تھی کہ وہ ایک خوش رو، خوش خو اور وجیہہ انسان تھا۔

پر ایک عجیب سی بات ہوئی کہ شاہ فردوس نے کہا وہ شہزادی سے ملے اور اس سے باتیں کئے بغیر شادی نہیں کرے گا۔

وفد لوٹ آیا۔شہزادی کو صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ساری روئداد سننے کے بعد اس نے متانت سے جواب دیا تھا۔

''کوئی ہرج نہیں ۔ پیغام بھجوادیں ۔''

وہ ایک شام بونجی کے دورے سے لوٹی تھی۔ اُس نے شہ زور گھوڑے کی طنابیں ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے زمین پر ساکت کرتے ہوئے قلعہ فردوسیہ کے باہر غیر معمولی رونق اور گہما گہمی کا سبب جاننا چاہا تھا۔

''شہزادہ فردوس تشریف لائے ہیں اور آج شب آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔''

اس نے یہ سنا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ قلعے کے راستوں پر بگولے کی طرح اڑتا شاہی محل میں اس جگہ آ کھڑا ہوا جہاں خدمت گار اس کی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ چوب چراغوں کی روشنی سے کمرہ منور تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی اور دروازے میں کوئی کھڑا تھا۔

وجاہت اور شجاعت کا پیکر چلتا چلتا عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دم بخود دم گنگ اور حیرت زدہ۔

''تو یہ تم ہو'' ساکت لہجہ بالآخر ٹوٹا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ پلکوں کی چھاؤں میں جو سورج دیوتا ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا' وہ اس وقت سامنے تھا۔ اضطراری حالت میں وہ کھڑی ہوگئی۔ اسکی زبان نے بھی بے اختیار کہا تھا۔

''یہ تم ہو''

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طویل فراق کی داستانیں سناتے ہوئے۔ جانے کتنی دیر بیت گئی تھی' شاید صدیاں۔ تب اس نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔ اسے بٹھایا اور خود بھی بیٹھا اور بولا۔

''تمہیں مجھ پر اپنا آپ ظاہر کرنا چاہیے تھا۔میرے اندر برسوں کی جلتی آگ پر تو پھوار پڑتی۔

وہ مسکرائی یوں جیسے کوئی عقل مند کسی معصوم اور بھولے بھالے بچے کی کسی بات پر مسکراتا ہے۔

چراغ جلتے رہے۔باہر ہوا شاہ بلوط کے پتوں کے ساتھ مل کر تالیاں بجاتی رہی اور رات کا اولین پہر پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھسل کر نیچے وادی میں اترتا آیا۔

شہزادی کی آنکھوں میں چھلکتے سوال تھے۔یہ سوال اس کے ہونٹوں پر آنے کے لئے مچل رہے تھے۔شہزادی فردوس نے انہیں سمجھا اور اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہیں زبان دے دی۔

یوں محسوس ہوتا تھا وہ جیسے کسی اور دنیا میں کھو گیا ہے۔اس کی آواز بھی کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔چوب چراغوں پر جمی نظریں خوابوں کی اس جنت میں جھانک رہی تھیں جہاں جھیلوں' آبشاروں اور چشموں کے کنارے اس نے اسے بارہا دیکھا تھا۔شاید اسی لئے اس کا حقیقی روپ مردانہ صورت میں دیکھ کر گڑبڑا یا تھا۔

''ہاں۔وہ مسکرایا۔شادی سے پہلے تم سے ملنے کی شرط اس لئے تھی کہ تمہارے بارے میں بے شمار باتیں گردش میں ہیں۔تم نفسانی خواہشات سے کسی حد تک مبرا ہو۔رعایا کے مجبور کرنے پر ولی عہد کے لئے شادی کر رہی ہو۔''

میں شہزادی جوار خاتون سے یہ جانے کا آرزو مند تھا کہ ولی عہد کے حصول کے بعد مجھ سے کیا سلوک ہوگا۔''؟

شہزادی ہنسی تھی۔مدتوں بعد ایسی ہنسی اس کے ہونٹوں پر بجی ہوئی خود ہونٹوں کو اجنبی اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔

آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

شہزادہ فردوس نے یہ ہاتھ اٹھایا۔اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اوراس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''عورتوں سے کبھی میرے مراسم نہیں رہے۔میرے لئے یہ ایک طرح شجر ممنوعہ ہی ہے۔مگر بگروٹ کی اس صبح یقین کروتمہارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھامتے ہی مجھے نسوانی تپش کا احساس ملا تھا۔''

پھر وہ اٹھا۔اس کا چہرہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔اسکے چمکتے گھنے بالوں کو چوما۔

میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ چہرہ جو مدتوں میرے خوابوں خیالوں اوردل کی دنیا پر اپنا قبضہ جمائے بیٹھا رہا کسی ایسی خاتون کا ہے۔جو بڑی شہ زور جیالی اور بڑی خود سر ہے۔میں اسے ملکہ بنانے کا متمنی ضرور تھا۔پر اس کا مشیر بننا مجھے تصوّر میں بھی گوارا نہ تھا۔

پر مقدر زوروررہوتا ہے۔

وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔اس کی آواز میں اس کے خیالوں کی شکستگی کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

بس تو اتنی سی بات یادرکھنا کہ جس دن مجھے یہ محسوس ہوا کہ تمہاری راجدھانی میں میری حیثیت ایک عضو معطل کی سی ہے اورتم مجھ سے اکتا گئی ہو میں اسی لمحے تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گا اور پھر تم لاکھ بھی چیختی رہو میری صورت کبھی نہ دیکھ پاؤ گی۔''

اور شہزادی نے حیرت سے پلکیں جھپکیں۔اس کا ذہن ماؤف سا ہو گیا تھا۔ دروازے کی کنڈی ہلتی تھی اور کمرے میں یوں لگتا تھا جیسے کوئی بگولا اڑتا اڑتا باہر نکل گیا ہو۔

''کہیں یہ بھی تو سپنا نہیں ۔خوبصورت اور پر اسرار سا۔''

اس نے بے اختیار اپنے آپ سے کہا۔

پھر بڑی دھوم دھام سے بیاہ ہوا۔شہزادی فردوس کو راجہ کا خطاب دیا گیا۔سال

بعد ولی عہد کی پیدائش ہوئی ۔نومولود کا نام جی خان (حبیب خاں) تجویز ہوا۔

اب محلاتی سازشوں کا دور شروع ہوا مملکت کے چند دانشمند اور دوراندیش افراد کا انتقال ہونے سے شر پسندوں اور مفاد پرستوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا کیونکہ شہزادہ فردوس ان کی راہ میں رکاوٹ تھا جو بڑی زبردست اور دھڑے والی شخصیت ہونے کی وجہ سے پوری سلطنت پر چھایا ہوا تھا۔

ایک دن جب وہ اپنے اکابرین کے ساتھ ہنکا شکار کھیلنے (بازوں اور شکروں کی مدد سے شکار کھیلنا) چلا گیا۔واپسی پر اس نے دریائے گلگت پر تعمیر شدہ رسیوں کا پل کٹا ہوا دیکھا۔پل کے دوسرے طرف گلگت کے چند معتمد لوگ تھے۔

انہوں نے کہا۔اپنی راجدھانی نگر جاؤ۔تخت و تاج کا وارث موجود ہے۔یہاں اب تمہاری ضرورت نہیں۔"

اس نے غیظ و غضب سے بھری ہوئی نظریں ان پر یوں ڈالیں جیسے شاہین عقاب کبوتروں کے غول پر ڈالتا ہے۔

شہزادہ جی خان مجھے دے جاؤ۔

جواب ملتا ہے۔"تھوٹ چھال نش"۔(یعنی بچہ بکری والوں کا ہوتا ہے) زہر خند ہنسی ہنستے ہوئے وہ واپس مڑا اور مڑتے مڑتے بولا۔

مجھے اس دن کی توقع تو تھی۔پر ملکہ جیسی زیرک خاتون سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ وہ ممولوں کو شہباز سے لڑانے کی ایسی ناقص تربیت کرے گی۔

اور ملکہ کو جب اس سانحہ کا علم ہوا تو بہت پریشان ہوئی۔سازش میں شریک لوگوں کو نہ صرف لعن طعن کیا بلکہ انہیں عوام کی عدالت میں پیش کر دیا۔راجہ فردوس کو سندیسہ بھیجا۔اپنی پوزیشن واضح کی۔جواب آیا تھا۔

"میں نے کہا تھا مجھے کبھی کوئی ایسا پالتو جانور نہ سمجھنا جو مالک کے اشارے پر دم

ہلائے۔اس کی مرضی پر آنکھیں کھولے اور بند کرے۔

جواری دل کی دنیا کے دروازے تو صرف ایک بار ہی کھلتے ہیں۔کھل کر اگر یہ بند ہو جائیں تو میرے جیسا جیالا انہیں دوبارہ کھولنے کی کوشش میں ہی لہولہان ہو جائے گا۔"

اس نے یہ پیغام سنا۔نگاہیں اٹھائیں۔اپنے سامنے دیکھا۔ان آنکھوں میں فولادی جذبوں کی انگڑائیاں تھیں۔

"تمہیں لہولہان دیکھنا میری کب تمنا ہے؟فردوس خان تم اور میں آسمان کے ان ستاروں کی مانند ہیں جو قریب آنے پر ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے ہیں۔پر دور رہ کر روشنی بکھیرنے اور راستہ دکھانے کا موجب بنتے ہیں۔چلو مجھے تمہارا یہ فیصلہ منظور ہے۔ کیونکہ تاج پہننے والا بیدار مغز سر کبھی اپنے لئے نہیں جیتا۔"

اور تاریخ گلگت کے اوراق گواہ ہیں کہ صدیاں گزر جانے پر بھی وہ زندہ ہے۔ صفحات میں بھی اور دلوں میں بھی۔

☆☆☆

باب:8

وادی دینور کے مقدس مزار۔چینی یادگار
کوراقبرستان ۔ مغل مینار
جارج ہائی ورڈ اور وادی نلتر

صبح نماز کے لئے آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے رات سوتے میں کسی منچلی نا رنے میرے پپوٹے اٹھا کر شرارت سے ان میں روڑ بھر دیئے ہوں۔

ملکہ جوار خاتون جب رات کے ڈھائی بجے ہماری دنیا سے تاریخ کے صفحات میں لوٹ گئیں اُس وقت کئی نوکیلے سوال میرے ذہن میں چُبھ رہے تھے۔

یہ اپنے وقت کی مہذب اور جدید علوم آشنا دنیا سے الگ تھلگ دُکتا ہوا دشوار گزار علاقہ اتنی وسعت نظری کا حامل تھا کہ اس نے ایک عورت کی سربراہی کو قبول کیا۔

اس زمانے میں بھی ایسی جیالی عورتیں تھیں جن کی جہانبانی کے انداز آج بھی مثال بن سکتے ہیں۔مرد کسی زمانے کا بھی ہو شوہر بن کر حاکمیت ہی چاہتا ہے۔یہ غالباً اس کی فطری جبلت ہے۔

ماضی اور حاصل کے موزانے میں آدھ گھنٹہ ضرور صرف ہوا ہوگا۔تین بجے کہیں آنکھ لگی۔دو گھنٹے بعد جاگنا ہوا تو آنکھوں میں مرچوں جیسی چبھن تو ضروری تھی۔

سارا گھر اس وقت سوتا تھا۔صحن میں لگے نل کی ٹونٹی شُوں شُوں کی آوازیں نکالتی تھی۔میں نے بلی کی چال چلتے بیرونی دروازے کی کنڈی کھولی۔قریبی کھیتوں کے پاس بہتی کھال سے وضو کیا۔وہیں نماز پڑھی اور واپس آکر پھر بستر پر ڈھیر ہوگئی۔

جب دوبارہ جاگی تو دھوپ میرے سر پر تھی۔برقی پنکھا چلتا تھا۔گھر والی

برآمدے میں اپنی مخصوص چارپائی پر بیٹھی مسکراتی تھی لڑکیاں کام کاج میں مصروف تھیں۔
چوبی ستون کے پاس وہ بیٹھا تھا۔سنہرے بالوں اور سنہری رنگت والا خاتون خانہ کا بڑا بیٹا۔
کراچی یونیورسٹی کا طالب علم ۔چھوٹا بھائی جو دہاڑی پر سوزوکی چلاتا تھا اس سے سوزوکی
لے کر نیچے سے آئی ہوئی مہمان خالہ کو گلگت کی نواحی جگہوں کی سیر کرانا چاہتا تھا اور اب
میرے جاگنے کا منتظر تھا۔

میں نے نمکین چائے اور تازہ چھپٹی (کیک نما روٹی) کا ناشتہ کرتے ہوئے محبت
سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''علاؤ الدین اگر آج کی ساری دیہاڑی میرے کھاتے میں ڈالو گے تو خالہ
ساتھ چلے گی وگرنہ نہیں''۔

دراصل میرے جیسے حساس لوگ ہمیشہ اپنی جیب کو کم اور دوسروں کے مسائل
زیادہ دیکھتے ہیں۔

نچلا متوسط گھر جہاں ایک کمانے والا اور سب کھانے والے۔ بیماری اور پڑھائی
کے اخراجات اس کے علاوہ۔ میں اس کی پیش کش کو مفت کیسے قبول کرتی؟ سو بار انکار کے
بعد کہیں جا کر اس ضدی لڑکے نے ہار مانی تھی۔

سوزوکی میں بیٹھتے ہی میں نے بھی روایتی مسلمان عورت کی طرح بزرگوں کے
مزار پر دعائیں مانگنے سے سفر کی ابتدا کی تھی۔

سید سلطان علی عارف (المشہور سلطان الف) کا مزار دینور میں چینی یادگار سے
چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ گلگت میں وہی اہمیت رکھتا ہے۔ جو حضرت داتا گنج بخش
کے مزار کو لاہور میں حاصل ہے۔اس دن جمعرات تھی اور مرادیں مانگنے والی عورتوں کا
سویرے ہی تانتا بندھ گیا تھا۔ بڑی بڑی چادروں میں لپٹی عورتیں ،چھوٹے چھوٹے بچے
بوڑھے اور جوان مرد دلوں میں آرزوؤں کے پورا ہونے کی تمنائیں لئے یا ان کے پورا

ہونے پر تشکرانہ جذبات کانذارنہ پیش کرنے کے لئے مزار کے اردگرد جمع تھے۔

کہا جاتا ہے کہ گلگت میں اسلام کی بنیاد آذر شمشر کے زمانے میں ۱۱۲۰۰۰۰ عیسوی میں پڑی۔سلطان علی عارف ان چھ بزرگوں میں سے ایک تھے جن کی شب وروز کی تبلیغ نے بدھ مت میں ڈوبے ہوئے ملک کو مسلمان بنایا۔

یہ ایک خوبصورت زیارت گاہ ہے جہاں فاتحہ پڑھنے دعائیں مانگنےاور اپنا آپ کہہ دینے سے قلبی سکون ملتا ہے۔مزار کا بالائی حصہ چینی طرز تعمیر کی نشان دہی کرتا ہے۔

چینی یادگار گلگت سے دس کلومیٹر دور شاہراہ ریشم کے ساتھ دینور کے مقام پر ہے۔سنگ مرمر کی یہ یادگار دراصل ان چینی جوانوں کی یاد میں بنائی گئی ہے۔جو شاہراہ ریشم کی تعمیر کے دوران جان بحق ہوئے۔دائیں بائیں گمنام چینی شہدا کی تصوراتی قبریں بھی موجود ہیں۔زیارت کے پس منظر میں سر اٹھائے پہاڑوں کی چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے میں نے چین کی لازوال دوستی پر فخر محسوس کیا تھا۔دہائیاں گزر گئی ہیں۔لیکن آج تک اس دوستی کی آب وتاب اسی طرح قائم ہے۔چین اعتبار کرنے اور اعتماد دینے والا دوست ہے۔

پھر میں سنگ مرمر کے دس گیارہ پوڈے چڑھ کر ستون کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔چینی زبان میں لکھے گئے مختلف حروف کو یونہی تکتے تکتے ایک کربناک خیال نے مجھے بھڑ کی طرح کاٹا۔دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر کر میں نے علاوہ الدین سے یہ جاننا چاہا کہ ان ہزاروں پاکستانی نوجوانوں جنہوں نے قراقرم کی سنگلاخ چٹانوں کو رسے کی تاروں پر چڑھ کر انہیں سرنگوں کرکے یورپ کو حیرت زدہ کردیا۔ان کے شایان شان بنائی گئی کوئی یادگار کہاں ہے؟

اس کا سرنفی میں ہلتے دیکھ کر میرے دل میں جیسے کسی زبردست کا گھونسہ پڑا۔

''کیوں وہ ماؤں کے بیٹے نہ تھے۔دلہنوں کے سہاگ نہ تھے۔معصوم بچوں کے باپ اور بہنوں کے بھائی نہ تھے۔وہ کیا پاکستانی نہ تھے۔ان کے ناموں کا کوئی مجموعی کتبہ کہیں لگانے کی ضرورت نہ تھی''؟

میرا گلا شدت جذبات سے روندھ گیا تھا۔ میں سوزوکی میں بیٹھ گئی۔ دو آنسو میرے رخساروں پر بہہ گئے ۔جنہیں صاف کرتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ہم کیسی محسن کش قوم ہیں''۔

مغل مینار۔

اب جوٹیال کی پہاڑی میرے قدموں کے نیچے تھی ۔اور میں ۱۶۹۰ء میں بنائے گئے مغل مینار کودیکھ رہی تھی جوآج بھی اپنی صحیح حالت میں موجود ہے۔جوٹیال گلگت سے چار میل کے فاصلے پر ہے ۔یہ مینار تاج مغل نامی حملہ آور نے گلگت فتح کرنے کی خوشی میں بنایا تھا۔

روایت ہے کہ کوئی تین سوسال قبل ترکستان سے تاج مغل نامی ایک شخص بدخشاں اور یاسین کے راستے گلگت میں داخل ہوا۔اس نے اس علاقے کو فتح کیا۔وہ مذہب کے لحاظ سے اسماعیلی تھا۔یہاں اس نے اسماعیلی مذہب کوفروغ دیا۔فاتح اور کارکن کے نام پر مقامی لوگوں نے اس مذہب کا نام مغل رکھا جووقت کے ساتھ کچھ بگڑ کر مولائی ہوگیا۔

اسماعیلی یامولائی مسلمانوں کی مختصروضاحت کچھ یوں ہے۔

ضلع گلگت میں مسلمانوں کے تین فرقے اقامت پذیر ہیں۔ پہلا سنی ،دوسرا شیعہ،اور تیسرا مولائی ۔تعداد کےلحاظ سے یہ تینوں فرقے کم وبیش برابر ہیں۔

اہل تشیع کے ایک فرقے کے مطابق صرف سات امام ہوئے۔اس فرقے کو ہفت امامی کہا جاتا ہے۔دوسرے فرقے کے مطابق بارہ امام ہوئے ۔اس کے بعداماموں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔یہ بارہ امامی یا اثنائے عشری کہلائے ۔گلگت میں اہل تشیع کا یہی فرقہ موجود ہے ۔تیسرا فرقہ جن کےعقیدے کے مطابق امامت ابھی تک جاری ہے۔

یہ فرقہ اسماعیلی یامولائی کہلاتا ہے۔پرنس کریم آغاخان ان کے حاضرامام ہیں۔

مغل مینار پر سے راکاپوشی چوٹی کا منظر بہت دلکش نظر آتا ہے۔دوربین آنکھوں

سے لگا کر میں نے جی بھر کر اس شہرہ آفاق چوٹی کا نظارہ کیا۔ دھوپ میں کیا کیا نقش و نگار بن بگڑ رہے تھے۔

میرا دل چائے کا ایک کپ پینے کو چاہتا تھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ چنار باغ میں سوزوکی میں ہی بیٹھ کر میں نے چائے پی۔ دریائے گلگت اور چنار باغ کی خوبصورتی سے آنکھوں کو ایک بار پھر ٹھنڈا کیا۔

علاؤالدین مجھے اب ایک ایسی جگہ لے آیا تھا جہاں کسی زمانے میں قلعہ گلگت اور شاہی محلات تھے۔ قلعہ تو اب ناپید ہے۔ لیکن اس کی ایک یادگار میں نے ضرور دیکھی۔ جو این ایل آئی چھاؤنی کے اندر تعمیر کی گئی ہے۔ اس یادگار کو راجہ گوہرامان نے ۱۸۵۲ء میں تعمیر کروایا تھا۔ گوہرامان گلگت کا آخری تاجدار کوہستانی شیر کے دبدبے جیسی شخصیت کا مالک جس نے سکھوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔

یادگار کی اونچائی پچاس فٹ بلند ہے۔ ہم لوگ اوپر چڑھ گئے تھے۔ گلگت شہر کا نظارہ بہت دل کش تھا۔ علاؤالدین دوربین سے چمٹا ہوا تھا اور اس کی جان بخشی نہیں ہو رہی تھی۔ فوکس ایک خاص زاویہ پر تھا۔ میں نے آنکھوں سے لگائی تو ساری حقیقت روشن ہو گئی۔ ایک گھر کی انگنائی میں نہایت خوبصورت لڑکی خوبانی کے پیڑ سے خوبانیاں اتار رہی تھی۔ بڑا صبیح چہرہ تھا۔

''شیطان''۔ میں نے ہنس کر دوربین بیگ میں ڈال لی۔

اس وقت بھوک زوروں پر تھی۔ شاہراہ قائداعظم پر اندر کی جانب ہوٹلوں میں سے ایک پر ہم نے گرم تندوری روٹیاں اور کباب کھائے' چائے پی اور باہر نکلے۔ تبھی علاؤالدین نے کہا''

کوراقبرستان ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی ہے۔ دیکھنا چاہیں گی!''

''کوروں کی قبریں دفع کرو۔ وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہیں''۔ میں نے دھوپ

سے بچتے ہوئے ایک شیڈ کے نیچے کھڑے ہو کر کہا۔

''جیالے اور جی دار لوگ یہاں دفن ہیں۔قبریں تو یوں بھی جائے عبرت ہیں''۔

''اگر یہ بات ہے تو چلو چلتے ہیں۔''

قبرستان کی حدود میں قدم کیا رکھا۔بے ثباتی کی ٹھنڈی بے رحم لہروں نے مجھے سر سے پاؤں تک اپنے آپ میں ڈبو دیا۔

برٹش دور میں وہ مہم جو سیاح اور کوہ پیما جو مختلف اوقات میں یہاں کے دشوار گزار دروں، پہاڑوں کی چوٹیوں اور گلیشروں کو سر کرنے آئے اور ہلاک ہوئے۔میں نے ان کی قبروں کو خصوصی توجہ سے دیکھا۔دل سے فاتحہ پڑھی اور دعائے خیر کی۔افسروں کی طرف نظر التفات ذرا کم رکھی۔

پھر علاؤالدین مجھے ایک ایسی قبر کے پاس لے گیا۔جس کی انفرادیت،جس کے سرہانے لگے پتھر پر لکھی عبارت کچھ کچھ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی تھی۔

''تاریخ میرا مضمون ہے۔ایک غیور مسلمان اور پاکستانی ہونے کے ناطے میں نے برٹش دور اور اس عہد کے انگریزوں کو کبھی پسند نہیں کیا۔لیکن کبھی کبھی کوئی ایسا کردار بھی سامنے آجاتا ہے جو ساری ہمدردیاں سمیٹ لیتا ہے۔

خوبصورت، ضدی، جنونی، دھن کا پکا، خطرات میں بے دھڑک کود پڑنے والا، جارج ہائی ورڈ رائل جغرافیکل سوسائٹی کا ممبر کوہ ہمالیہ کے دشوار گزار دروں کو سر کرتا ہوا سری نگر کے راستے گلگت پہنچا تھا۔کوہ ہندوکش کے نئے درّے دریافت کرنے کا آرزومند تھا۔ پر اپنوں کی بے حسی اور غیروں کے ظلم کا نشانہ بن گیا۔

اس وقت جب میں علاؤالدین سے یہ سب سن رہی تھی۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ میں پکڑا قلقاریاں مارتا میرے ارادوں اور منصوبوں کا پرندہ دراصل کھلونا بم ہے جو پھٹ گیا ہے اور میرے جسم کے لوتھڑے گلگت کی زمین اور آسمان پر دھنکی

ہوئی روئی کے گالوں کی طرح بکھراور گر رہے ہیں۔

دہل کر میں دھوپ سے چھاؤں کی طرف بھاگی۔میرا سر دھوپ نے چکرا دیا تھا۔ چند لمحوں بعد میرے حواس بحال ہوئے۔خصوصی فاتحہ پڑھ کر میں نے علاؤالدین کی طرف دیکھا۔وہ یقیناً وادی یاسین کے گاؤں درکوت پہنچا ہوا تھا۔

درکوت کی وہ رات بڑی خوفناک تھی۔جارج نے کھانا نہیں کھایا تھا۔خیمے کے اردگرد اگی جھاڑیوں سے برچھیوں کی طرح کاٹتی ہوائیں جب ٹکراتیں تو بڑی مہیب آوازیں پیدا ہوتیں۔اس کے ملازم نے چائے کا پیالہ میز پر رکھا تھا۔وہ لکھنے میں مصروف تھا۔ہاتھ روک کر اس نے پیالہ اٹھایا۔گھونٹ بھرا اور اپنے آپ سے بولا تھا۔

''ڈیزی میری جان شاید میں تمہیں اب کبھی نہ دیکھ سکوں۔مجھے آج موت کے فرشتوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔میز پر پڑے پستول اور کارتوسوں سے بھری رائفل پر اُس کی نگاہیں جم گئیں تھیں۔

جارج ہائی ورڈ جنوری ۱۸۶۹ء میں گلگت پہنچا۔وہ وادی یاسین کے ۱۵۵۶۰ فٹ بلند درے درکوت سے بروغ (BAROGH) درے کو پار کرتا ہوا واخان کے راستے شادوین وین ۱۶۱۶۰ فٹ بلند درے تک پہنچنا چاہتا تھا۔گلگت ٹھہر کر اس نے مختلف ریاستوں کے راجاؤں سے تعاون مانگا۔انہیں تحائف بھی بھیجے۔اپنی ان کاوشوں کے نتیجے میں اسے صرف والئی یاسین میرولی کی طرف سے دعوت موصول ہوئی۔ہائی ورڈ جب یاسین پہنچا۔اس وقت سردی کا موسم اپنے عروج پر تھا اور درّے بند تھے۔میرولی نے اسے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔دونوں نے مارخوروں اور ہرن کا شکار کھیلا۔ان درّوں کی سیر کی جو کھلے تھے۔ہائی ورڈ نے ڈوگرہ حکومت کے ان مظالم کے بارے میں جانا جو انہوں نے یاسین کے لوگوں پر کئے۔اس نے موڈوری کے اس قلعہ کو بھی دیکھا جہاں ہزاروں عورتوں ،معصوم بچوں اور بوڑھوں کا ڈوگرہ فوج نے خون بہایا تھا۔اس نے میرولی سے وعدہ کیا کہ وہ

ان مظالم کے متعلق حکومت ہند کو تفصیلی رپورٹ پیش کرے گا۔

موسم بہار میں دوبارہ آنے کا پروگرام بنا کر ہائی ورڈ گلگت آ گیا۔ تفصیلی رپورٹ اس نے بذات خود پنجاب پہنچ کر گورنر پنجاب لارڈ مائیو کو پیش کی اور اخبارات میں بھی چھپنے کے لئے دیں۔ مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ انگریز افسروں کی ساری ہمدردیاں مہاراجہ کشمیر کے ساتھ تھیں۔ وہ حق اور سچ کے لئے کشمیر کے راجہ سے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لارڈ مائیو اور ڈوگرہ راجہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دوبارہ ان علاقوں کی طرف جائے۔ پر ہائی ورڈ فولادی عزم رکھنے والا انسان تھا۔

اور پھر اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

ساری رات اس نے لکھنے میں گزاری تھی۔ میر ولی کے انداز چغلی کھا گئے تھے کہ وہ بک گیا ہے۔ شام گہری ہو رہی تھی جب اس کے ایک ملازم نے اُسے سرگوشی کے انداز میں بتایا تھا کہ رات کسی بھی لمحے اس کی گرفتاری اور موت متوقع ہے۔ وہ جاگ رہا تھا۔ لندن کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ بچپن، جوانی ڈیڑی گھربار سبھی فلم کے کسی سین کی طرح آنکھوں کے سامنے متحرک تھے۔ وہ آنکھیں جھپکنا نہیں چاہتا تھا۔

یوں رات ایک کرب کے عالم میں گزرتی ہے۔

بس تو وہ لمحہ قیامت کا تھا جب سورج کی اولین کرنوں نے پہاڑوں پر جمی برف کو مسکرا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کو پپوٹوں نے چند لمحوں کے لیے سکون دینا چاہا تھا۔ اس کی پلکوں نے نیند کی دیوی کو گرفت میں لیا ہی تھا۔ اس کا بایاں فولادی ہاتھ رائفل پر دھرا ذرا ڈھیلا پڑا ہی تھا کہ وہ گرفتار ہو گیا۔

اور پھر اپنے آپ کو ان کے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''اتنی مہلت تو دو کہ آخری بار باہر نکل کر کائنات کو دیکھ سکوں۔''

وہ خیمے سے نکلا۔ نیچے وادی کے گھروں میں زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔

چولہوں سے اٹھتا دھواں فضا میں بکھر رہا تھا۔ اُس نے آسمان کی سمت نگاہیں اٹھائیں۔ سورج کی کرنیں اس کے سنہرے بالوں پر چمکیں۔ خوبصورت چمکتے بال اور خوابیدہ سی بے چین آنکھیں۔ برف سے ڈھکی ہوئی داسپور کے پہاڑوں کی چوٹیاں، نیلا شفاف آسمان، ٹنڈ منڈ درختوں پر پھوٹتی نئی نویلی کونپلیں۔

''زندگی حسن و رعنائی سے لبالب بھری ہوئی ہے''۔ اس نے اپنے آپ سے سرگوشی تھی۔ اب میں موت کی آغوش میں جانے کے لئے تیار ہوں''

وہ اپنے دشمنوں کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

فی الوقع اس چمکتی صبح ایک بہت بہادر آدمی قتل ہوا تھا۔

چڑی کے پنجے جتنا میرا دل اس المناک داستان کو سن کر عجیب سا ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ علاؤ الدین گھر جانے کے لئے بضد تھا اور میں گلگت کا سوئز رلینڈ نلتر دیکھنے کے لئے مری جاتی تھی۔ جاننے پر معلوم ہوا کہ سوزوکی والے کو گاڑی چاہیے تھی۔

''میاں کسی اور گاڑی والے سے بات کرو۔ وقت تو میرے پاس گنما منما ہے''۔

ایک جیپ والے سے بات طے ہو گئی۔ علاؤ الدین کو خدا حافظ کہتے ہوئے میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نلتر کی خوبصورت وادی گلگت سے چھتیس میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف سطح سمندر سے ۱۰۰۰۰ فٹ بلند ہے۔ دریائے ہنزہ ہمارے دائیں ہاتھ خاصی گہرائی میں بہہ رہا تھا۔ ڈرائیور لڑکا خاصا خوش اخلاق اور محبت والا۔ نلتر جانے کے شوق میں نماز کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

جب آیا تو لڑکے سے کہا

''کوئی موزوں جگہ دیکھ کر گاڑی روک لینا۔ نماز پڑھنی ہے۔''

''نومل میں میرا گھر ہے۔ یہاں ٹھہر کر پڑھیں گی!'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''لو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی''۔ میں خوش ہو گئی۔

نومل ہرے بھرے درختوں میں گھری بڑی شاداب اور حسین وادی ہے۔گلگت سے اس کا فاصلہ سترہ میل کے قریب ہے۔مشرق میں رحیم آباد اور جنوب مشرق میں جوتل کا گاؤں آباد ہے۔تقریباً چھ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی یہ وادی شین اور رہنزائی افراد پر مشتمل جن کی مادری زبانیں شنا اور بروشسکی ہیں۔

لڑکا اسٹیرنگ دائیں بائیں گھماتے ہوئے بولتا جا رہا تھا۔پولوگراؤنڈ خاصا بڑا تھا۔

''اس وادی کے لوگ بیلوں کی لڑائی بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔نومل میں تعلیم کا خاصا رجحان ہے۔لڑکوں کے لئے ایک مڈل اسکول اور لڑکیوں کے لئے پرائمری سکول کھل گئے ہیں''۔

ریسٹ ہاؤس کے قریب سپاہی کھن نامی کھنڈر جہاں سے قسم قسم کی چیزیں نکل رہی ہیں۔انسانوں اور حیوانوں کے ہسپتال۔لڑکے نے مجھے تفصیلی سیر کرا دی تھی۔کشادہ سی گلی میں اس گھر سے ملحقہ کھیت میں اس کا باپ اور بڑا بھائی گندم کی گٹھیں باندھ رہے تھے۔بڑے سے آنگن میں سیب اور خوبانیوں کے پیڑ پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔درخت کے نیچے مچھر دانی میں کوئی لیٹا ہوا تھا۔''میرا دادا۔یہاں مکھیاں بڑی ظالم ہیں۔''

دوسرے پیڑ کے متنے کے پاس ایک نوجوان عورت کوئی (خمیر گوندھنے والا برتن) صاف کر رہی تھی۔اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔لڑکا غالباً بروشسکی میں اسے کچھ بتا رہا تھا۔کیونکہ سننے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔سلام دعا ہوئی۔

گھر کے ایک کونے میں زمینی بیت الخلا تھا۔پاس ہی بھیڑ بکریوں کا بڑا کمرہ۔میں نے وضو کیا۔جائے نماز لڑکے نے کمرے میں بچھا دیا تھا۔صاف ستھرا کمرہ جس کی دیواریں رنگین نقش و نگاری سے مزین تھیں۔سومو (چھت کا سوراخ جس میں سے دھواں باہر نکلتا ہے)ان دنوں بند تھا لڑکا پیالے میں کچھ لے کر آیا۔پتہ چلا کہ بہلوئی ہے۔گائے

نے کل بچہ دیا تھا۔عورت چولہے کے آگے بیٹھی کالی چائے میں گول کالی مرچ ابال رہی تھی۔ بوڑھے کے پیٹ میں درد تھا۔اسے یہ تھوڑا سا نمک ڈال کر دینی تھی۔پیٹ درد کے لیے اکسیر ہے۔میری معلومات میں اضافہ ہوا تھا۔

سفر دوبارہ شروع ہوا۔تقریباً بیس میل کے بعد تنگ سی گھاٹی شروع ہوگئی۔دریا بہت پیچھے رہ گیا تھا۔آمنے سامنے کے پہاڑ بہت قریب معلوم ہوتے تھے۔کوئی آٹھ میل بعد یہ گھاٹی ختم ہوئی اور آسمان اپنی کشادگی کے ساتھ دکھائی دیا۔

پائین نلتر کو دیکھ کر خدا کی رعنائیوں کا شدت سے احساس ہوا۔دائیں سمت بہتی ندی کا پانی شیشے کی طرح شفاف تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے لان میں دو غیر ملکی اور ایک ملکی جوڑا بیٹھے ہوئے تھے۔مجھ اکیلی عورت کو دیکھ کر ملکی جوڑا ذرا چونکا۔پر میں ایسے معاملات میں بڑی ڈھیٹ ہڈی واقع ہوئی ہوں۔برآمدے میں عصر کی نماز پڑھی۔اور جیپ میں بیٹھ کر باہر کے نظارے کے لیے روانہ ہوئی۔یہ وادی بہت بلندی پر ہے۔سردی سے میرے دانت بجنے لگے تھے۔ چیل کے درختوں سے لدی پھندی' سرکاری عمارات جن میں مختلف دفاتر ہیں۔ یہاں کے جنگلوں میں مارخور اور رام چکور کا شکار بھی پایا جاتا ہے۔نلتر جھیل اپنی خوبصورتی اور ٹراوٹ مچھلی کے شکار کے لئے بہت شہرت رکھتی ہے۔

ریسٹ ہاؤس سے تین چار فرلانگ دور پاکستان ائیر فورس کا کیمپ اور بائیں ہاتھ اسکیٹنگ جھولا ہے۔جہاں فضائیہ کے نوجوان کو اسکیٹنگ کی تربیت دی جاتی ہے۔نلتر وادی سے کئی ایک پہاڑی راستے مختلف وادیوں کی طرف نکلتے ہیں۔ایک راستہ وادی بنیال دوسرا اشکومن کے گاؤں چٹھور کھنڈ اور تیسرا اشنی سے ہوتا ہوا نگر جا پہنچتا ہے۔

واپسی پر لڑکا مجھے ڈاکٹر حلیم کے اشعار سنا رہا تھا۔ڈاکٹر سید حسین جعفر حلیم اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔

وہ کوہ و دشت وہ سرسبز وادیِ ملتر
وہ برف اور وہ فضا وجد آفریں منظر
تری فضاؤں میں پا کر سکون قلب و دماغ
مٹائے کیوں نہ طبیعت سے کلفتوں کے داغ

☆☆☆

باب:9

وادی پھپال ۔ وادی سنگل کا حال احوال
ملکہ سے ایک اثر انگیز ملاقات

برآمدے میں ایک سرخ وسفید باریش معمر مرد چارپائی پر بیٹھا تھا۔صاحب خانہ اس سے باتوں میں مصروف تھے۔سبز اوڑھنی والی دوشیزہ پرچھائیوں کی طرح انگنائی اور برآمدے میں چل پھر رہی تھی۔دونوں خوبصورت لڑکیوں سے گھر خالی تھا۔خاتون اول چارپائی پر نیم دراز اخبار جہاں کے مطالعے میں گم تھی۔برقی روشنی آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ صاحب خانہ کے پاس پٹو کا فرغل، خشک انگوروں یعنی کشمش کا لفافہ، جوجی (درخت کی چھال جو کاغذ کی مانند ہوتی ہے) میں لپٹا مکھن جسے گلگت کی گرم حرارت پگھلا رہی تھی پڑے تھے۔

سبز اوڑھنی والی کا باپ وادی پھپال سے بیٹی کے گھر ان سوغاتوں کے ساتھ آیا تھا۔وہ بے چین تھا کئی بار کہہ بیٹھا تھا۔

''گلگت تو تنور بنا ہوا ہے۔پنیال میں تو جنت کی ہوائیں چلتی ہیں۔میری بیٹی اس گرم موسم کی کہاں عادی ہے؟

داماد کے چہرے پر خفیف سے غصے کے آثار تھے۔خاتون اوّل نے رسالے پر سے نظریں اٹھا کر طنزیہ انداز میں بڑا لمبا ''ہونہہ'' کہا تھا۔

میں نے ہمدردی سے اسے دیکھا تھا۔باپ تھا آخر۔بے شک غریب تھا۔جانتا تھا کہ لڑکی سکھ میں ہے۔اس کے گھر کی نسبت اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہے۔پر انسانی فطرت ہے ماضی تو اسے یاد ہی نہیں رہتا۔

میں چارپائی پر کمر سیدھی کرنے کے لیے ذرا لیٹی تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی جادو کے تکیے پر سر رکھ دیا ہو۔دو ڈھائی گھنٹے کسی مدہوش افیمی کی طرح پڑی رہی۔آنکھ کھلی تو ابھی برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔خاتون اول کی آنکھیں اس کمرے کے بند دروازوں پر جمی تھیں۔جہاں اس کا خاوند اس کی سوکن کے ساتھ شب بسری کر رہا تھا۔میں اٹھ بیٹھی۔ دھیرے سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔

منکوں جتنے موٹے آنسو اُن آنکھوں سے نکلے۔رخساروں پر لڑھکے لیکن گردن پر پہنچنے سے پہلے ہی میں نے انہیں ہاتھ کی پوروں سے صاف کر دیا۔

''مرد کے لئے آنسو بہانا اپنے آنسوؤں کی توہین ہے۔وہ کبھی عورت کے ایثار اور قربانیوں کی قدر نہیں کر سکتا۔مجھے اپنی ماں یاد آئی تھی چنبیلی کے پھولوں جیسی رنگ والی دھیکھے نقش و نگار والی جسے میرے باپ سے پیار ہی نہیں عشق تھا۔غصیلا اکھڑ مزاج انا کا مارا ہوا میرا باپ جو ذرا سی بات پر چیل کی جلتی لکڑی کی طرح بھڑک اٹھتا۔ہنڈیا اٹھا کر زمین پر مارتا۔پیالے گلاس دکنالی جو ہاتھ میں آتا توڑ دیتا۔وہ زندگی بھر ان ٹوٹے برتنوں کی کرچیاں سمیٹتے اس کے گھر کو سدا بناتی اور سنوارتی رہی۔

اپنی عمر کے درمیانی حصے میں وہ فالج اور دل کا مریض بن کر بستر پر پڑ گیا۔صاف ستھرے بستر پر چمکتے دمکتے دوا کنگ سٹک بجاتے نوٹوں سے ہر دم بھری جیب پر ہاتھ رکھتے اور اس کے وزن سے اپنے ڈوبتے دل کو تقویت دیتے اس نے اٹھ سال گزار دیئے۔

کمال صبر اور محبت سے اس کی تیمار داری کا بار اٹھاتے اس کا چنبیلی جیسا رنگ سرسوں کے پھولوں جیسا ہو گیا تھا اور پھر ایک دن اچانک ہی وہ برین ہیمبرج کا شکار ہو کر چل بسی۔اس کے مرنے کے چند دن بعد ہی ابا نے اپنے بینک بیلنس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''بندے کے پاس پیسہ ہونا چاہیے۔بیویاں بہتری۔''

وقت کا وہ لمحہ بڑا ظالم تھا۔جب میں نے اس کی یہ بات سنی تھی۔

''جانتی ہوں میں نے اس کمزور کلائی کو اپنی گرفت میں تھام لیا۔آپ کو وہ سارے دُکھ اور مشقتیں تڑپاتی ہیں جو اس گھر کو بنانے کے لئے کی گئیں۔بس ایسا ہی ہوتا ہے عورت کا دوسرا نام ہی قربانی ہے''۔

اپنی اور دوسروں کی مثالوں کے ڈھیر لگا کر اس موگھے کو بند کیا جہاں سے دھڑا دھڑ آنسوؤں کا ریلا بہہ رہا تھا۔

عشاء کی قضا نماز پڑھ کر جب دوبارہ سونے کے لئے لیٹی تو خیال آیا کہ کیوں نہ ان کے ساتھ پھنڈر کا ایک چکر لگا لوں۔قدرت موقع تو فراہم کر رہی ہے۔فائدہ اٹھانا میرا کام ہے۔

صبح جب میں نے صاحب خانہ سے بات کی تو وہ چہک کر بولے۔

''ضرور،ضرور پھنڈر گلگت کی بہت حسین وادی ہے۔ہماری ملنے والی ایک فیملی سنگل میں رہتی ہے۔ان کی بیٹی ملکہ آج کل وہاں آئی ہوئی ہے۔انتہائی زیرک خاتون ہے۔سارے پاکستان میں گھومی پھری ہے۔آپ کے لئے بہت معاون ثابت ہوگی۔

صبح خوشگوار تھی۔سبز اوڑھنی والی بے زبان خاتون دوم نے اپنا جوڑا زیب تن کیا۔سر پر خوبصورت کڑھت والی ٹوپی پہنی۔اوپر سے بڑی چادر اوڑھی جس میں سرخ وسفید چہرہ چھپ سا گیا تھا۔میں نے بھی کھلی موٹی ریشمی چادر میں اپنا جسم چھپا لیا۔یہ چادر میں نے گلگت پہنچ کر ایمر جنسی ضرورت کے تحت خریدی تھی۔

راجہ بازار سے ویگن میں بیٹھے۔ٹکٹ میں نے خریدے۔معمر مرد نے بہتیرا نہ نہ کیا پر میرا دل ہی نہ مانا۔مغرب کی طرف سفر کا آغاز ہونے والا تھا۔گاڑی پھٹیچر سی تھی۔کچھ لوگ بیٹھ چکے تھے۔کئی سیٹیں ابھی خالی تھیں۔نہ گاڑی بھر رہی تھی اور نہ چلنے کا نام لے رہی تھی۔ڈرائیور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہتا تھا۔

''لوابھی کہتے ہیں آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں گھنٹہ ہو گیا ہے انتظار کرتے ہوئے لوگ جانے کن کھڈھوں میں لگتے بیٹھیں''۔

مسافروں کے اصرار پر گاڑی نے چلنا شروع کیا۔ غالباً ڈیزل سے چل رہی تھی۔ دھواں بلاشبہ پیچھے کی طرف جاتا تھا۔ پر اس کا تھوڑا سا اثر اگلی طرف بھی نمایاں تھا۔ میری آنکھوں میں جلن سی شروع ہو گئی تھی۔

بسین گلگت سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ گلگت کا مضافاتی علاقہ جسے کارگہ نالہ دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ بسین پائین اور بسین بالا۔ کارگہ نالہ کو چنگھاڑتے، شور مچاتے، جھاگ اڑاتے ہوئے دیکھ کر مجھے درد زہ میں مبتلا ماں جانے کیوں یاد آئی تھی؟

بسین پائین سے ایک جوڑا سوار ہوا۔ جوڑیاں جگ تھوڑیاں تے نیڑ بہترے (یعنی زمانے میں جوڑیاں بہت کم ہوتی ہیں بس یونہی بندھن بندھے ہوتے ہیں) کی عملی تفسیر۔ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی جس کی فراخ پیشانی پر سیدھی مانگ کے ساتھ ساتھ کٹے ہوئے بال مڑ کر ہلالی صورت بنا رہے تھے۔ فاتح فرانس نیلسن کی محبوبہ ایما ہملٹن جیسی دل آویز شکل وصورت والی جس کا ساتھی ادھیڑ عمر کا مرد گاڑی میں بیٹھے لوگوں کی پروا کیے بغیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُسے دیکھنا نہ بھولتا۔

''ایمان تازہ کرتا ہے''۔

میرے ساتھ بیٹھی اُس اللہ میاں کی گائے خاتون دوم نے جب سرگوشی کے انداز میں مجھ سے یہ کہا تو میں حیران رہ گئی۔ سبز اوڑھنی والی بولی تو لاجواب بولی۔ اس صورت حال پر اس سے بہتر جملہ کہا نہیں جا سکتا تھا۔

''لڑکی ہے طرح دار'' میں نے گرہ لگائی۔

''نسائی خوبصورتی کے لئے وادی یاسین بہت شہرت رکھتی ہے۔''

ہینزل آیا تو پتہ چلا ابھی دس میل کا سفر طے ہوا ہے۔ ہینزل کے آخر میں ایک گھر

نظر آتا تھا ایک ہوٹل جس پر کشکاری ہوٹل لکھا ہوا تھا۔ چارپائیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ گرم گرم روٹیاں' میرا جی چاہا میں کھڑکی سے چھلانگ مار کر اس چارپائی پر جا بیٹھوں جس کے سامنے دھری میز پر سفید چینی کی رکابی میں سالن اور چنگیر میں روٹی دھری تھی۔ مجھے بھوک کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

دریا کے پانی سے آباد دہری پون چھوٹا سا گاؤں جس کے بالمقابل بارگو کی وادی ہے۔ درمیان میں پیدل چلنے والوں کے لیے لکڑی کا پل بنا ہوا ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ہزاروں فٹ نیچے دریائے گلگت چل رہا تھا۔ لیکن کسی محافظ کی طرح نہیں بلکہ اس مکار دشمن کی طرح جو ذرا سی غفلت اور کوتاہی پر شب خون مارتا ہے۔

ویگن ایک تواتر کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ ہمارے ساتھ معمر مرد نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ شروٹ' سڑک کے کنارے شروٹ ہائی اسکول تھا۔ شیکوٹ میں دو مسافر اترے اور تین سوار ہوئے۔

گلگت سے بائیس میل کے فاصلے پر گلاپور کی بہت بڑی وادی ہے۔ ننانوے فیصد سنی لوگوں کی آبادی، راسخ العقیدہ پڑھے لکھے لوگ جن کی ایک مثال فضل الرحمٰن جیسے پرانے اور ڈاکٹر شاہ فرمان جیسے نئے لوگوں کی ہے۔

دریا کے دوسری طرف گلاپور سے دو میل آگے شیر قلعہ ۹۵ فیصد اسماعیلی لوگوں کی وادی، جو لمبائی میں بہت زیادہ پر چوڑائی میں کم ہے۔ شیر قلعہ میں ہی راجہ پنیال کا محل ہے۔ راجگی نظام تو خیر اب ختم ہے۔ تاہم راجہ اور محل باقی ہیں۔ اندر کی طرف دلناٹی کا گاؤں ہے۔ دریا کے پار ہموچل' کوہر آباد' چپوکے' گیچ داس' کچھ چھوٹی چھوٹی وادیاں بالکل اسی طرح گزرتی جا رہی تھیں۔ جس طرح چڑھتی دوپہر سہ پہر میں ڈھل رہی تھی۔

وادی سنگل میں جا کر ویگن رک گئی۔ سنگل پنیال کی مرکزی وادی۔ چائے پانی اور دیگر ضروریات کے لئے مسافر اتر رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی سے میں نے منہ دھویا۔ یخ

پانی نے میرے چکریاں کھاتے سر کو ذرا سنبھالا دیا۔گندم کے کھیتوں پر سے آتی ہوا کی خوشگواری نے طبیعت کو کچھ تازگی دی۔

سنگل خاصی بڑی وادی ہے۔چار قدم آگے سنگل تھانہ اور آغا خان میڈیکل سنٹر ہیں۔دائیں بائیں دوکانیں' سرکاری دفاتر' اسٹنٹ کمشنر' تحصیل دار وغیرہ کی رہائش گاہیں ہیں۔ان سبھوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔

گلیاں کہیں تنگ' کہیں کشادہ' اخروٹ کے درختوں کی بہتات تھی۔گھروں کی دیواروں پر انگوروں کی بیلوں نے عام سے گھروں کے حسن کو بھی بڑھا دیا تھا۔گلیوں میں کھیلتے سرخ وسفید چہروں والے بچے منہ اٹھا اٹھا کر جب دیکھتے تو مجھے اپنے بچے یاد آتے۔

لفظ پونیال 'پوپال' سے نکلا ہے۔جو سنسکرت میں پھلوں سے بھری تھالی کو کہتے ہیں۔میرے ساتھ ساتھ چلتا معمر مرد مجھے بتا رہا تھا۔اس وادی میں پھلوں کی کثرت ہے۔اسکی آبادی تقریباً اٹھارہ ہزار کے قریب ہے۔اس کے مختلف گاؤں میں چار ہائی اسکول ہیں۔یہاں کی بیشتر آبادی اسماعیلی ہے۔

''کوئی لڑکیوں کا سکول بھی ہے''۔میں نے دریافت کیا۔

''ہاں ہاں مڈل سکول ہے۔یہیں سنگل میں ہی۔''

پھر ہم ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہوئے۔آنگن اتنا صاف ستھرا اور پھل پھلواری سے لدا پھندا تھا کہ سفر کی تھکاوٹ اور کلفت یوں اڑنچھو ہوگئی جیسے منڈیر پر بیٹھی چڑیا ذرا سی آہٹ پر اڑ جاتی ہے۔گھر میں صرف ایک خوبصورت سی جوان لڑکی تھی۔جس نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔بقیہ لوگ قریبی کھیتوں میں گندم کی کٹائی کے لئے گئے ہوئے تھے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب دو عورتیں اور دو مرد اندر آئے۔درمیانی عمر کی جس عورت نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا اور میرا ماتھا چوما تھا اس کے خدوخال

بلاشبہ "لیونارڈو" کی "پہاڑی دوشیزہ" جیسے تھے۔ نہایت شستہ اردو بول رہی تھیں۔ گلگت میں مجھے جس خاتون کے بارے میں بتایا گیا تھا وہ یہی تھیں۔ "ملکہ تاجور"۔

چائے نمکین تھی۔ لیکن سادی چائے کی تھرموس بھی موجود تھی۔ چینی الگ سے رکھی گئی تھی۔ اس صاف ستھرے گھر کے برآمدے میں پھلوں، پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں نیلے آسمان اور اپنے اردگرد خوبصورت چہروں سے آنکھوں کی سکائی کرتے ہوئے مجھے نمکین چائے کی چسکیوں نے بہت لطف دیا تھا۔ میں نے ملکہ تاجور کے بار بار کہنے پر بھی چینی والی چائے پینی پسند نہ کی تھی۔

عصر کی نماز پڑھی۔ ظہر کے قضا سجدے بھی کئے۔ پتہ نہیں مجھے اجنبی جگہوں پر سجدے کرنا کیوں اتنا پسند ہے؟ شاید میں ہر نئی مٹی پر ماتھا ٹیک کر اپنا کھاتہ وزنی کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ بوقت ضرورت کسی بڑی خواہش کی تکمیل کے لئے اس کا حوالہ دے سکوں۔ اس ضدی بچے کی طرح جو ماں سے اپنی کسی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے اگلے پچھلے کئی چھوٹے موٹے کاموں کا احسان اس کے سر پر دھرتے ہوئے مچلتا ہے۔

یہ خاصا کشادہ گھر تھا۔ بڑے کمرے کی دیواریں پتھروں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چھت بڑے بڑے تختوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کا درمیانی حصہ تکون نما گنبد کی شکل کا تھا۔ چھت کو اخروٹ کی قیمتی لکڑی کے چار موٹے موٹے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ ان ستونوں پر نقش و نگاری کا کام ایسا عمدہ تھا کہ میں کتنی دیر تک ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتی رہی۔

اللہ آرٹ کے یہ نادر شاہکار اگر شہر والوں کی نظروں میں آجائیں تو وہ ان سیدھے سادھے دیہاتیوں کو کیا نام دیں گے کیونکہ سب نام تو انہوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھے ہیں۔"

سردیوں میں گنبد کے نیچے آگ جلتی ہے۔ اس کے اردگرد گھر کے لوگ بیٹھتے

ہیں۔درمیانی جگہ کے آمنے سامنے گھر کے ضعیف افراد کے لئے لکڑی کے بڑے بڑے پلنگ نما تختے بچھے ہیں۔دونوں طرف لکڑی کی خوبصوت الماریاں جس میں گھریلو برتن اور کھانے پینے کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔

میرے ساتھ آنے والا باپ بیٹی کا جوڑا مجھے خدا حافظ کہنے کے بعد جا چکا تھا۔ان کا گاؤں ”گل حتی“سنگل سے تھوڑا سا آگے تھا۔

کبھی کبھی نام شخصیت کی کس قدر بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ملکہ تاجور کی چال ڈھال‘اٹھنے بیٹھنے کا انداز گفتگو کرنے کے طور طریقے سبھوں میں انداز دلربائی بھی تھی اور وقار بھی۔ذہانت آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔تجربۂ مشاہدہ اور علم کا خزانہ زبان کے راستے باہر آتا تھا۔

وادی سنگل کی سیر کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ وادی کے جلووں کا حال پنجاب کی اس الڑ مٹیار کی ناک میں لشکارے مارتے لونگ جیسا ہے۔جو چہرے کے ذرا سے رخ بدلنے پر یوں چمکتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔وہ ہوائیں جو دوپہر تک حرارت کے باعث خوشگوار اور سبک خرام تھیں۔اب وہ بوجھل ہوکر جسم میں کپکپی کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

سنگل کے چھوٹے بڑے گھر اُن گھروں میں کام کرتی خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں‘برآمدوں اور کمروں میں لٹکتی پرنس کریم آغا خان کی تصویریں۔آنگنوں میں شراب بنانے والی ہوزریاں‘خوبانی اور اخروٹ کے پیڑوں پر لٹکتے دل لبھاتے پھل‘فضا میں بکھرتا دھواں اور پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں سب کسی حسین خواب کی طرح دل موہ لینے والی تھیں۔ہوائیں گندم کے پکے خوشوں کی خوشبو چرائے پھرتی تھیں۔

مغرب کے وقت واپسی ہوئی۔نماز سے فارغ ہوکر میں اس چھوٹے سے کمرے میں آگئی جہاں لکڑی کے فرش پر گدے بچھے تھے۔رضائیاں دھری تھیں۔بجلی کا قمقمہ جلتا تھا پر

جلنے سے زیادہ شرارتیں کرتا تھا۔ ملکہ تاجور نے ایک البم میرے گھٹنوں پر دھری رضائی پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

انہیں دیکھو میں ذرا کھانے کا جائزہ لے آؤں۔

میں نے جلد کو پلٹا دیا۔ پہلے صفحہ پر پوسٹ کارڈ سائز میں کیمسن جیسے ایک جری نوجوان کی تصویر تھی۔ دوسرے صفحے پر اسی چہرے کے دو پوز تھے۔ قدیم دردنسل کا بہروپ۔ پاؤں میں پیزر کھلے پائینچوں کی پاجامہ نما شلوار لمبا چوڑا فرغل سر پر اونچی ٹوپی لمبی داڑھی ہاتھ میں پکڑا اگلدان نما حقہ۔ میں آگے بڑھی۔ راجہ کا درباری کامدار چوغہ کمر میں پٹکا۔ کھلی شلوار۔ ایک تصویر میں کرنل ڈیورنڈ بنا ہوا تھا۔ بند گلے کی کامدار جیکٹ جس کے سینے پر تمغے لٹکتے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں نفاست سے بنے ہوئے بال۔ صفحات پلٹے تو قدیم زمانے کا شکاری نظر آیا۔ کھسہ نما جوتا جس میں پھنسی سیاہ اونی جرابیں گھٹنوں تک چلی گئی تھیں۔ گھٹنوں سے کمر تک ہندوانہ سٹائل کی دھوتی نما شلوار کھلے بازوؤں کا کرتا جس پر تنگ بازوؤں کی اونی جیکٹ اوپر سے سر کو ڈھانپتا ہوا عمامہ ہاتھ میں تیر اور کمان۔

البم نہیں تھا لوک ورثہ میوزیم تھا۔ ایک عہد کی تاریخ محفوظ تھی۔

پھر اسی نوجوان کی شادی کی تصاویر نظر آئیں۔ یہاں ملکہ بھی تھی۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں مختلف جگہوں پر یہ جوڑا اپنے حسن کے جلوے بکھیر رہا تھا۔

''ہوں تو یہ تاجور خان ہے۔ بڑا فنکار نظر آتا ہے۔ ایسے شوہر کی بیوی ایسی ہی ہونی چاہیے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا''۔

رات کا کھانا خاصا پر تکلف تھا۔ مولی پودینہ سلاد کے پتوں اور ہرے دھنیے پر مشتمل سلاد گھر کی کیاریوں سے توڑ کر بنایا گیا تھا۔ سونے کے رنگ جیسے قہوے کی پیالی ہاتھوں میں تھام کر میں نے اپنی پشت پر رکھی رضائی سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک نظر سامنے دیوار پر ڈالی۔ جہاں مارخور اور ہڑیال کے سینگ لکڑی کے قلب میں لگے خوبصورت

ڈیکوریشن پیس بنے ہوئے تھے۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ بعض انسان اور بعض جانور کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ زندگی میں بھی لوگوں کو پیچھے لگائے پھرتے ہیں اور مر کر بھی گھروں کی زینت بن جاتے ہیں۔

ملکہ میرے پاس آ بیٹھی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھا اور ہنس کر کہا ''آپ کے شوہر تو بڑے فنکار آدمی معلوم ہوتے ہیں''۔

گھائل کر دینے والی مسکراہٹ اُن ارغوانی ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی۔ ملکہ اپنی جوانی میں کس قدر حسین عورت ہوگی۔ اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔ تصویریں بولی تھیں مگر اس شدومد سے نہیں جس کی ضرورت تھی۔ سرخی مائل قرمزی رنگ کی آنکھوں میں زیادہ دیر تک دیکھنا مشکل تھا۔ اپنا آپ اپنے آپ سے چھنتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سنہری دراز بالوں کا روکھا پن یہ بتاتا تھا کہ کبھی ان کی چمک اور رعنائی آنکھوں کو سحر زدہ کرتی ہوگی۔ رنگ و روپ تو ابھی بھی دیئے کی لاٹ جیسا تھا۔ جوانی میں تو آسمان پر اڑتے پرندے پھڑ پھڑا کر گرتے ہوں گے۔

''اتنی مختصر سی ملاقات کے باوجود آپ کی ذات کی انفرادیت کو میں نے پوری طرح محسوس کیا ہے۔ ایسی ذات جن حالات سے گزرتی ہے اور جو کچھ محسوس کرتی ہے وہ دلچسپ آپ بیتی کی شکل میں ایک خوبصورت کہانی بن جاتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس کہانی کو سننا چاہتی ہوں۔''

''اپنی دنیا کا چہرہ مجھے کسی کو دکھانا پسند نہیں۔ اس دنیا میں کسی کی شرکت خواہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہی کیوں نہ ہو مجھے گوارہ نہیں مجبوری یہ ہے آپ مہمان ہیں۔ بہت پیاری سی مہمان۔ آپ کی بات ٹالنا مناسب نہیں۔ چلئے آیئے۔

☆☆☆

باب:10

علاقائی ثقافتی رنگوں کی قوس وقزح
کہانی کے آئینہ خانے میں

یوٗرمس اگر شنا زبان کے نامور شاعر رحمت جان ملنگ کی محبوبہ تھی تو تاجورخان میرا محبوب تھا۔ یورمس کا چہرہ چاند کی کرنوں جیسا تھا تو تاجورخان کی پیشانی میں سے آفتاب پھوٹتا تھا۔

میں اپنی انگنائی میں سیب کے پیڑ پر چڑھی ہوئی انگور کی بیلوں سے خورستانی انگوروں کا گچھا اتارتی، پاؤں کی ایڑیوں سے زمین بجاتی، دوسرے گچھے کو ہاتھ میں پکڑ کر اپنا چہرہ ہندو کش پہاڑوں کی بانہوں میں سمٹے نیلے شفاف آسمان کی طرف کرتی، منہ کھولتی اور اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ سے خورستانی انگروں کا دانہ دانہ کھاتے کھاتے اپنے آپ سے کہتی۔

''ملنگ تم یوٗرمس کے لئے اپنی ٹوپی میں سرخ گلاب لگاتے تھے اور میں اپنے تاجورخان کے لئے آفتاب رنگی اوڑھنی اوڑھتی ہوں۔ پر ایک بات ہے تم جب آنکھیں بند کرتے ہوں گے تو یورمس کے حقیقی پیکر کے کتنے رنگین جلوے تمہاری ذہنی سطح پر تھرتھراتے ہوں گے۔ لیکن میرے پاس اپنے خیالی محبوب کے صرف خیالی پیکر ہیں۔

یہ پیکر کبھی حقیقت کا بھی روپ دھاریں گے یا نہیں میں نہیں جانتی۔ پر ایک دعا بھی ہے کہ تمہاری طرح میری محبت المیے کا شکار نہ ہو کہ تم نے اپنے جذبات کو شاعری میں ڈھال لیا لیکن میاں کیا کروں گی؟ ہاں کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ لیتے تو اپنی یورمس کو بھول جاتے۔

میں نے سوئزرلینڈ نہیں دیکھا لیکن وہ مووی میں نے کوئی دس بار دیکھی ہے جو میرا

چھوٹا بھائی وہاں کے حسین نظاروں پر بنا کر لایا ہے۔ میں یقیناً دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری وادی پنیال کے سامنے وہاں کی خوبصورتیاں ہیچ ہیں۔

ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔لیکن عجیب بات تھی کہ بھرے پڑے شور شرابے والے اس گھر میں میں اور میرا بڑا بھائی یامین عباس ہی سب سے الگ تھلگ اور مختلف تھے۔یامین نہایت ذہین ،ضدی،سرکش اور روایات سے ٹکرانے والا لڑکا تھا۔کچھ ایسی ہی عادت میری بھی تھیں۔ہم تب گلاپور میں رہتے تھے۔یامین کا معمول تھا کہ وہ جو کچھ اسکول سے پڑھ کر آتا مجھے سناتا بھی اور سمجھاتا بھی۔وہ اپنے ایک استاد دولت شاہ سے بہت متاثر تھا۔اکثر اس کی باتیں کرتا۔یہ دولت شاہ تھا جس نے اس کے دل میں عزت نفس کا احساس پیدا کیا۔ اپنے استاد کی طرح یامین کو بھی بچپن سے ہی راجگی نظام سے نفرت تھی جو ہمارے علاقے میں مسلط تھا۔

اس دن ابھی شام نہیں ڈھلی تھی۔بابو (باپ) تھوداس (وادی یاسین کا گاؤں) اپنی بہن کے پاس گیا ہوا تھا اور میں تھرنگی (بکری کے چمڑے کا مشکیزہ جس میں دودھ بلویا جاتا ہے) میں ہفتہ بھر سے سیب کے پتے بھر بھر کر اسے کوٹتی رہی تھی اس وقت اس کی مہندی رنگی کھال کو یہ جاننے کے لیے سونگھ رہی تھی کہ اس کی بو ختم ہوگئی ہے یا نہیں۔جب یامین گھر میں داخل ہوا تھا۔اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں لال بوٹی ہو رہی تھیں۔میں تھرنگی چھوڑ کر اس طرف بھاگی۔وہ بیٹھ گیا۔میں نے بے چینی اور اضطراب سے کہا۔

گاکو(بھائی کو جب پکارا جائے) تمہیں کیا ہوا ہے؟ کسی سے جھگڑ کر آئے ہو۔سچ بتاؤ کیا بات ہے؟

اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔مجھے اور مان (ماں) کو دیکھا۔ہماری تشویش کو محسوس کیا اور دھیرے سے بولا۔

پُنیال میں راجہ کے خلاف زبردست احتجاج ہوا ہے۔لوگوں پر گولی چلی ہے۔

آٹھ افراد شہید ہو گئے ہیں۔ شہید ہونے والوں میں امیر حمزہ کا باپ بھی ہے۔ امیر حمزہ یا مین کا دوست اور ہمارا رشتہ دار تھا۔ راجہ کے لوگ تحریک کے لیڈر منشی تخی غلام کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

مان (ماں) نے سینے پر دو ہتڑ مار کر کہا

''یا مین تیرے باپ کی خیر نہیں۔ وہ آج تیری پھوپھی سے ملنے گیا ہے''۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے یا مین کی سوچوں میں بغاوت پیدا کی۔ راجگی نظام سے اس کی نفرت میں شدت نمایاں ہوئی۔

ان دنوں جب درجہ حرارت منفی اعشاریہ صفر سینٹی گریڈ سے بھی نیچے ہوتا۔ وہ کمرے کے عین وسط میں بنے چولہے میں جلتی کائل کی لکڑیوں کے شعلوں کو گھورتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے کہتا۔

''میں بہت بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ لیکن بڑا بن کر چھوٹوں میں رہنے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آخر ایک طاقتور آدمی اتنے ڈھیر سارے بے کس و مجبور لوگوں پر محض اپنے مفاد کے لئے کیوں ظلم کرتا ہے؟ ایسا کب تک ہوتا رہے گا''؟

پھر وہ اپنا افسردہ اور مضطرب چہرہ اوپر اٹھا کر اُس چھوٹے سے سوارخ جو ہمارے گھر کی چھتوں میں روشنی اور دھوئیں کی آمدورفت کے لئے بنائے جاتے ہیں سے آسمان کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہتا۔

''اسخدا (اے اللہ) انہیں تیرا بھی ڈر نہیں''۔

گو میں اس سے دو سال چھوٹی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی سب باتیں سمجھتی اور کبھی کبھی جز بز ہو کر یہ ضرور کہتی

''اتنا مت سوچا کرو''

بٹیال کے مڈل سکول سے جب اس نے آٹھویں کا امتحان امتیازی نمبروں سے

پاس کیا تب تک اس کی اردو میں لکھی ہوئی کم و بیش بھی کتابوں کو میں پڑھ بیٹھی تھی ۔ انگریزی بھی تھوڑی تھوڑی جان گئی تھی ۔

ہم ان دونوں سنگل میں آ کر آباد ہو گئے تھے ۔ یہ بنیال کی مرکزی وادی ہے ۔ یہاں بیشتر آبادی اسماعیلیوں کی ہے ۔ یہاں دنیا کا بہترین انگور اور شراب دونوں کی کل بھی بہتات تھی اور آج بھی ہے ۔ ہم نے شراب کشید کرنے اور بیچنے کا کام شروع کر لیا تھا ۔

ایک دن بابو (باپ) کے لئے راجہ بنیال کا پیغام آیا ۔ اسے حاضر خدمت ہونے کے لئے کہا گیا تھا ۔ بابو جب ملاقات کے لئے گیا اس وقت میں یا مین اور دوسرے بہن بھائی صحن میں بیٹھے کسر یئی گندم کو صاف کر رہے تھے جس کا بابو نے کھیت میں بیج ڈالنا تھا ۔

کل ڈیڑھ بیگھہ زمین جس پر سال کے سات مہینوں میں ہم زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کی کوشش میں کولہو کے بیل بنے رہتے ۔ لگان ، مالیہ راجہ کے نذرانے اور دس افراد پر مشتمل خاندان کی کفالت ۔ بابو حالات سے مردانہ وار لڑے جاتا تھا ۔ پر یا مین دل گرفتہ تھا ۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ حالات کے اس بدترین پہلو کو کیسے اور کیونکر پلٹا دے دے ۔

تبھی بابو تھکے تھکے قدموں سے ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا ۔ یا مین نے اُس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور کہا ۔

''بابو راجہ نے کہیں اپنے محل کی پہرہ داری کے لئے تیری ڈیوٹی تو نہیں لگا دی'' ۔

بابو کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی تھکی تھکی تھی ۔

''راجہ بنیال نہیں چاہتا تم پڑھنے کے لئے گلگت جاؤ ۔

یا مین نے ایک پل کے لئے حیرت سے بابو کو دیکھا ۔ وہ کھڑا ہوا پر لڑکھڑا یا یوں جیسے بصرہ کھیلتے ہوئے لڑکوں کا کبھی کبھی توازن برقرار نہیں رہتا ۔ پھر جیسے برفانی چیتے کی مانند اچھلا اور جب اس کے منہ سے غلیظ گالیاں نکل رہی تھیں ۔ ہمارے چھوٹے سے گھر کی فضا پر

موت کا سناٹا طاری تھا۔ہم سب بہن بھائی دم سادھے بیٹھے تھے۔یامین کی آواز کی گھن گرج شیر قلعہ کے پہاڑی نالے جیسی تند و تیز تھی۔اس کا چہرہ چنار کے پھولوں جیسا سرخ تھا۔

ماں نے سہم کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھنا چاہا کہ اردگرد کوئی سن نہ لے۔راجہ کی عداوت مول لینے کا مطلب گویا خاندان کو پن چکی میں پسوانے والی بات تھی۔بابو(باپ) بیرونی دروازے کو تالہ لگانے دوڑا۔

لیکن بابو کا لگایا ہوا وہ مضبوط تالہ شام کو ٹوٹ کر دور جا گرا تھا اور وہ کندھے پر ایک چھوٹے سے تھیلے کے ساتھ گولے کی مانند دروازے سے نکل گیا تھا۔

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو امنڈے تھے جب اس نے میرے ہاتھ کے کڑھے ہوئے تھیلے میں اپنا ایک جوڑا کپڑوں کا اور چند کتابیں ڈالی تھیں۔اپنے رخ پھیر کر مجھے دیکھا۔میری آنکھوں میں چمکتے آنسو بھی اسے نظر آئے تھے۔تب اس نے میرے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا تھا۔

''یامین کی بہن کو بہت دلیر ہونا چاہیے۔آنسو بزدلی کی علامت ہیں''۔

بس تو میرے امنڈے ہوئے آنسو میری گھنی سیاہ پلکوں میں یوں اٹک گئے تھے جیسے برفانی چوٹیوں سے نیچے کی طرف پھسلتے برف کے ٹکڑے اچانک سرد ہواؤں کے چلنے سے وہیں کہیں ٹھہر جائیں۔

میں نے سر کو پشت کی طرف پھینکا اور آنسوؤں کو واپس آنکھوں میں لا کر انہیں جذب کرنا چاہا۔پتہ نہیں میرے اندر نے کیوں یہ سرگوشی کی تھی کہ یہ آنسو اگر بہہ گئے تو یامین اپنی جدوجہد میں ہار جائے گا۔

وہ چھ ماہ گلگت میں رہا۔دن کو سکول جاتا اور رات کو گھروں سے روٹیاں مانگتا۔چھ ماہ بعد وہ کراچی چلا گیا۔

راجہ بنیال نے بابو پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ کسی طرح بیٹے کو واپس بلائے۔یامین

جیسے دلیر اور ذہین لڑکے سے اس کے اقتدار کو غالباً خطرہ تھا۔ راجہ یہ کب برداشت کرسکتا تھا کہ میرے بابو جیسے غریب کسان کا بیٹا پڑھ لکھ کر کسی اونچی جگہ بیٹھ جائے۔ تم گے کے ممبروں نے گلگت تک تعاقب کیا۔ لیکن وہ تھا کب جوان کے ہاتھ آتا۔

جب خوبانی کے پیڑوں پر شگوفے کھلتے۔ جب چیری کی سبز شاخوں پر عنابی پھل لشکارے مارتا۔ جب انگوروں کی بیلوں سے اترے ہوئے ''گچوچی'' انگوروں کے ٹوکرے اٹھا اٹھا کر شراب بنانے والی ہوزری میں ڈالتی۔ جب نوروز کے تہوار کی گہما گہمی شروع ہوتی۔ جب میں پنوشا (کولنگلو ساگ) پکاتی۔ جب میرا دل کچھ پڑھنے کو چاہتا اور مجھے کچھ نہ ملتا۔ تب میں اُسے یاد کرتی اور میری آنکھیں اس کے لئے آنسو بہاتیں جو میرا بھائی تھا۔ میرا دوست اور میرا اہم راز تھا۔ بس تو ایسے ہی چار سال گزر گئے۔ چار سال جو انگوروں کے ترش دانوں جیسے تھے۔ جنہوں نے ہماری آنکھوں کو صبر کے کا تحفہ دیا تھا۔

اور جس دن ہم لوگ شیشو کوٹ کا تہوار منا رہے تھے۔ شام کی ٹھنڈی، خوشگوار ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں اور بابو شرک (روغنی روٹیاں) لئے اپنے جَو کے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ تقریباً سبھی گھروں کے بزرگ اور ان کے بچے رنگ برنگے کپڑوں میں ہنستے کھیلتے آگے پیچھے کھیتوں کی طرف رواں دواں تھے۔ میرے بہن بھائیوں نے بھی اودھم مچا رکھا تھا۔

رواج کے مطابق بابو اپنے کھیت کے ایک کونے میں قبلہ رُو ہو کر دعائیں پڑھنے لگا۔ میری نظریں دور سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یامین یاد آیا تھا اور میں نے کہا تھا۔

''پروردگار کیا ایسا نہیں ہوسکتا آج میں یامین کی صورت دیکھوں یا اس کی طرف سے کوئی سندیسہ پاؤں''۔

یقیناً وہ دعاؤں کی قبولیت کا وقت تھا۔

دعائیں پڑھنے کے بعد بابو نے جو کی پکی فصل کے چند خوشے توڑے اور دو روغنی روٹیاں وہاں رکھیں۔ جب وہ کھیت سے باہر آیا میں نے دیکھا تھا وہ کچھ افسردہ سا تھا۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔"

میں نے اللہ سے کہا ہے وہ مجھے یامین کی خیر خبر دے۔

تب وہاں خوب ہلا گلا ہوا۔ ایک دوسرے کے کھانوں کو چکھا گیا۔ ہنسی مذاق ہوا۔ گھر آ کر دودھ کی پیالیوں میں ان خوشوں سے چار چار پانچ پانچ دانے نکال کر ڈالے گئے جنہیں ہم کھیتوں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پیالیاں بابو اور مان کے ہاتھوں میں تھما کر میں نے ابھی رخ سیدھا کیا ہی تھا۔ جب ایک دراز قامت نازک اندام درمیانی عمر کا مرد جس کی نیلی آنکھوں میں بڑا ٹھہراؤ اور بڑی گہرائی تھی ہمارے گھر کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا۔

وہ بھمانی سے آیا تھا جو بنیال کی آخری وادی ہے۔ درمیانے سائز کا ایک بند پیکٹ اور ڈیڑھ سو روپیہ آنے والے نے بابو کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ اس کے بیٹے یامین نے میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ بھیجے ہیں۔ یامین اس کے کراچی میں مقیم بھتیجے تاجور خان کا دوست ہے۔"

بابو اور مان کا اگر بس چلتا تو یقیناً وہ اپنی کھال اتار کر اس کے قدموں تلے بچھا دیتے۔ ایک تو وہ ان کے لئے وہ پھوار بن کر آیا تھا جس نے ان کے دکھوں کی آگ میں جلتے جسم و روح کو ٹھنڈک اور سکون بخشا تھا۔ دوسرے آنے والا "رونو" قبیلے کا ایک معزز فرد تھا۔ رونو قبائل کے لوگوں کا باپ کی طرف سے تعلق شاہی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ اسی لئے وہ معاشرے میں بہت محترم خیال کئے جاتے ہیں۔ اس نے چھوٹے کوٹ پر دیسی پٹو سے بنی ہوئی فرغل اور رہند پائینچوں کی شلوار پہن رکھی تھی۔

ہمارا جی چاہتا تھا کہ اس پیکٹ کو پھاڑ کر دیکھ لیں کہ یامین نے کیا بھیجا ہے؟ لیکن

ایک معزز مہمان کا رعب مانع تھا۔اس کی خاطر مکھن والی نمکین چائے اور اُس تازہ چھپٹی (کیک نما روٹی) سے کی گئی جو میں نے ابھی ایک دن پہلے بنائی تھی۔

اس کے گھر سے نکلنے کی دیر تھی جب ہم پیکٹ پر یوں جھپٹے جیسے جنگلی بلی سیاہ خرگوش کو شکار کرنے کے لئے اس پر جھپٹتی ہے۔پیکٹ گویا تحائف کا پٹارہ تھا۔گھر کے ہر فرد کے لئے کوئی نہ کوئی چیز تھی۔میرے لئے دس کہانیوں کی کتابوں کا سیٹ اُس زمرد کی طرح تھا جو بھیڑ بکریاں چراتے کسی چرواہے کو اچانک پہاڑ کی کسی کھوہ سے مل جائے اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر دیکھے کہ یہ خواب تو نہیں۔

پیکٹ میں سے خط بھی نکلا تھا۔یامین کے ہاتھوں کا لکھا ہوا جسے ماں اور بابو نے کوئی دس بار چوما ہوگا۔پندرہ بار کلیجے سے لگایا ہوگا۔میں نے خط پڑھ کر انہیں سنایا اور پہلی بار ماں کو احساس ہوا تھا کہ یامین نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھا کر کتنا بڑا کام کیا تھا۔وگرنہ اس ٹھٹھرتی شام میں وہ غلام رسول کے گھر جاتی جو وادی کے آخری سرے پر تھا۔

یامین کا خط آدھے سے زیادہ تاجور خان کے ذکر سے بھرا ہوا تھا۔وہ اس کا ممنون تھا جس نے اس اجنبی شہر میں اس سے محبت بھرا سلوک کیا تھا۔بابو اور ماں کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔یامین ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔محنت مزدوری کرتا تھا۔اس کے خط میں اچھے دنوں کی آمد کا پیغام تھا۔

خط میں نے تُون (لکڑی کا بڑا صندوق جس میں گندم رکھی جاتی ہے) میں رکھ دیا۔سونے تک کے وقفے میں چھوٹے بہن بھائیوں نے کوئی دس بار مجھ سے ڈانٹ کھائی ہو گی۔کیونکہ وہ ہیر پھیر کر کتابیں دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

پھر میں نے کتابیں اپنے پہلو میں رکھیں۔رضائی سے انہیں بھی یوں اچھی طرح ڈھانپا جیسے کوئی زچہ اپنے نومولود بچے کو سردی سے بچانے کے لئے مری جاتی ہے۔

یہ وہ پہلی رات تھی جس میں تاجدار خان میرے خوابوں کے افق پر روشن ستارے

کی مانند طلوع ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا گیا۔ یامین کے کبھی کبھار کسی کے ہاتھ بھیجے گئے خط میں تاجدار خان کی محبت اور خلوص کی خوشبو مشک نافہ کی طرح مجھے مدہوش کر دیتی۔ ماہ و سال کے یہی وہ دن تھے۔ جب میں نے رحمت جان ملنگ کی شاعری کو سمجھا اس کے درد کو جانا۔ اپنا اور رومیؔ رمس کا مقابلہ کیا۔

شنا شاعری کو سمجھنے میں میرے بابو نے بھی بہت ساتھ دیا۔ بابو نے اپنی جوانی کا کچھ وقت اس کے مطالعے میں گزارا تھا۔ ہمارے علاقے بنیال پر وادی اشکومن اور یاسین کا بہت اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں بولنے والی زبانیں فارسی' کھوار' بلتم اور رواخی ہماری شنا زبان پر خاصی اثر انداز ہوئی ہیں۔

آتی سردیوں کے پر بہار دنوں میں جب بابو انگوروں کو اپنے پاؤں سے کچلنے کے لیے ہوزری میں چھلانگ لگاتا۔ انگوروں کے حسن و جوانی کو تہ تیغ کرتے ہوئے وہ ہماری قومی شخصیات کے کارناموں کو منظوم صورت میں لہک لہک کر گاتا۔ اس کی پاٹ دار آواز سارے گھر میں بکھری ہوئی ہوتی۔ چترالی شاعری نے شنا شاعری پر کیا کیا اثرات مرتب کئے یہ میں نے بابو سے ہی سمجھا تھا۔

اور وقت کے بہتے پانیوں میں دو سال اور بہہ گئے تھے۔ دو سالوں کے بے شمار دن جن کے ہر دن میں میں نے تاجدار خان اور یامین کے بارے میں سوچا تھا۔ ایسا بھی ہوتا جس دن میں نہاتی صاف کپڑے پہنتی۔ بالوں میں تیل لگاتی۔ اپنے سنہری لمبے بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھتی۔ نئی کاڑھی ہوئی ٹوپی اوڑھتی۔

برآمدے کے چوبی ستون سے ٹیک لگا کر بیرونی دروازے کو دیکھتی۔ تب میرا جی چاہتا کہ یامین اور تاجدار خان بھی بادام کے پیڑ کے شگوفوں سے پھوٹتی خوشبو کی طرح کہیں سے آجائیں اور ہمیں مہکا دیں۔

وہ بڑی پیاری شام تھی۔ سورج کی کرنیں کوہ ہندوکش کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر

غمبوری (اخروٹ کے درخت سے پھوٹنے والے پہلے پتے جن کا رنگ سنہری ہوتا ہے) جیسی خوبصورت لگتی تھیں۔ بابو اور میں کھیتوں سے لوٹے تھے۔ صحن میں بندھی خوش گاؤ نے مجھے دیکھتے ہی آوازیں نکالیں۔ میں نے اس کی تھوتھنی پر پیار کرتے ہوئے بابو سے کہا۔

''بابو نسالو کے تہوار پر خوش گائے کو ذبح کرنے پر میرا دل نہیں۔ اس بار چھوٹا جانور کرلیں گے۔''

نسالو کا تہوار پورے شمالی علاقہ جات میں دسمبر کے پہلے ہفتے سے آخری ہفتے تک بہترین جانور ذبح کرنے سے منایا جاتا ہے یہ ایک طرح سردیوں کے لئے گوشت سٹور کرنے کا تہوار ہے)

ماں ہنستے ہوئے بولی: ''اسے تو جو پال رہی ہے۔''

تبھی اچانک گھوڑے کی تیز ٹاپیں سنائی دیں اور پھر ایک صحت مند گھوڑا عین ہمارے دروازے کے سامنے رکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان کے اس ٹکڑے سے جو میرے سر کے اوپر تھا۔ یکا یک بجلی کڑکی ہو اور اس نے کٹھپور (راجاؤں کی اولاد) نسل کے دو شہزادوں کو ہمارے آنگن میں کھڑا کر دیا ہو۔ میری آنکھوں کی چندھیاہٹ جب کم ہوئی میں نے جانا آگے والا میرا دُلارا بھائی یامین تھا۔ اونچا لمبا خوبصورت۔ اس کے پیچھے یقیناً تاجور خان تھا۔ میرے خوابوں سے کہیں زیادہ بانکا سجیلا۔ وہ شاہ بلوط کے پیڑ کے پاس تنا کھڑا تھا۔ وہ سورج جسے میں ابھی اپنے کھیتوں میں دیکھتی آئی تھی اب جیسے میرے گھر کے دروازے سے طلوع ہو گیا تھا۔

مجھے نہیں پتہ ایسا کیوں ہوا؟ لیکن یہ ہوا۔ میں دوڑ کر کمرے میں گئی اور کونے میں پڑی رضائیوں پر گر گئی۔ میرے سانس کی اتھل پتھل عجیب سی تھی۔ باہر بجر کے دنوں کی خشک سالی کیسے اور کس انداز میں سیراب ہو رہی تھی؟ مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور میرے کانوں کی شائیں شائیں کے شور و غوغا نے

سب کچھ اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

تبھی یامین کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اٹھایا اور محبت بھری آواز میں کہا۔

''کیا ہوا تمہیں؟ کیا تم میرے آنے سے خوش نہیں ہوئیں''؟

میں اس کے سینے سے چمٹی اور بلک بلک کر روئی۔ چار پانچ سال کے دکھوں اور اذیتوں کا لاوہ پھوٹ پھوٹ کر میرے آنسوؤں کی صورت میں باہر نکلا۔ یامین میرے بالوں پر پیار اور میری آنکھوں سے زار زار بہتے آنسوؤں کو خشک کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''چلو چلو جلدی سے چھپھاؤں (بڑے چھلکے) بناؤ۔ میں تو انہیں کھانے کے لئے ترس گیا ہوں''۔ اس دن میں نے پنو دیتوشا (ایک طرح کا ساگ جس میں خوبانی کی گریوں کا گاڑھا دودھ اور آٹے کے باریک ٹکڑے ڈال کر پکائے جاتے ہیں) پکایا تھا۔

اس وقت جب وہ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے اپنے چھپر نما برآمدے میں روشنی کم محسوس ہوئی تھی۔ میں نے کمرے سے ایک اور روخ (چیل کے درخت کی لکڑی جسے چراغ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے) لا کر روشن کر دی تھی۔ چولہے پر ساوار میں قہوے کے لئے پانی پک رہا تھا۔ کیونکہ دونوں نے نمکین چائے کی جگہ قہوے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

رات تاریک تھی۔ فضا پر چھائے ہوئے سناٹے کو معمول کی طرح جھرنوں اور آبشاروں کا شور ہی توڑ رہا تھا۔ میں نے شاہ بلوط کے درخت سے پرے دیکھا۔ اس سمے مجھے تاریکی بولتی اور سناٹا جیسے گنگناتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

وادی پھمانی کا تاجور خان کم عمری ہی میں گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے تخت ہزارے کے رانجھے جیسا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ دونوں میں بھابھیوں کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر گھر چھوڑنے کی مشترکہ وجہ کے سوا اور کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ اس وقت یہ خوبصورت شاہراہ ریشم نہیں بنی تھی۔ وہ مختلف غیر ملکی ٹورسٹوں کے ساتھ درہ بابوسر سے کاغان'

ماران کے ہوٹلوں پر چھوٹا گیری کرتا کرتا کہیں نیچے پہنچا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں تجربات نے اُسے سرد گرم سبھی ذائقے چکھا ڈالے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی جیسے شہر میں اُس نے یامین کے دکھوں کو اپنے دکھ اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنی مسرتیں جانا تھا۔

اور جب وہ گھونٹ گھونٹ قہوہ پیتے تھے۔ یامین نے پوچھا تھا

''بابو فصل باڑی کا کیا حال ہے''؟

اور بابو نے ٹھنڈا سانس بھر کرا تنا کہا۔

''بچہ کل جو اور گندم کی کٹائی شروع ہو گی۔ پون بیگھہ زمین پر گندم اور جو کی فصل کھڑی ہے۔ چوتھائی پر شفتل (جانوروں کا چارہ) سوچتا ہوں اب مکئی زیادہ بووں۔ کنگنی اور چینا بھی کاشت کرنا پڑے گا۔ تمہاری ماں اس بار چاول کا بھی کہہ رہی ہے۔ میں ہنستا ہوں۔ ایک بیگھہ پر کیا کیا ہو سکتا ہے؟ بس زندگی تو ایک بوجھ ہے۔ اٹھاتے اٹھاتے کمر دوہری ہو گئی ہے۔ لیکن اسے پٹخ کر نہیں پھینک سکتا۔ تبھی یامین نے کہا۔

''بابو یہ شراب کشید کرنے والا کام اب بند کر دیں''۔

اور بابو نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا۔

تمہارا مطلب ہے ہم جو دو وقت کا روکھا سوکھا کھاتے ہیں اس سے بھی محروم ہو جائیں۔

یامین نے دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی بابو کی گود میں ڈال دی یہ کہتے ہوئے:

''ہمارا مذہب اگر شراب پینے کو حرام کہتا ہے تو اسے بنانے اور بیچنے کے عمل کو کیسے پسند کر سکتا ہے''؟

بابو کی آنکھیں یقیناً پھٹنے کی حد تک پھیل گئی ہوں گی۔ اس کے دل کی دھڑکن یقیناً غیر معمولی تیز ہو گئی ہو گی۔ اس کے ہاتھ ضرور کانپتے ہوں گے۔ جب اس نے گڈی کے نوٹوں کو چھوا ہو گا۔ میں اس کے جسم و جاں اور دل و دماغ پر وارد ہونے والی سب کیفیات کو

محسوس کرسکتی تھی ۔بے شک وہ میری طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔

اگلی شام جب میں اپنی کوٹ (مکان) سے مشرقی ہاتھ بہتی کوہل (چھوٹی کھال یا نالہ) سے پانی بھر رہی تھی ۔میں نے یامین اور تاجور خان کو سامنے سے آتے دیکھا تھا۔آج سارا دن دونوں گھر کے سب افراد کے ساتھ کھیتوں کی کٹائی کرتے رہے تھے۔صرف میں کھانا پکانے کے لئے گھر میں تھی ۔یہ اور بات ہے کہ میرا دل وہاں جانے کو تڑپا تھا۔پر یامین اپنے جگری یار کو اچھا کھانا کھلانے کا خواہش مند تھا۔

یامین ہماری ایک معمر رشتہ دار سے جو اپنے کھیتوں سے واپس آ رہی تھی ۔بات چیت کرنے رک گیا۔تاجور خان آگے بڑھ آیا۔وہ مجھ سے ڈھائی تین گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔میرے ہاتھ پانی سے کھیلنے لگے تھے۔

تب اس نے اچانک کہا۔

''تم کل مجھے دیکھ کر بھاگ کیوں گئی تھیں؟ کیا تمہیں میرا آنا برا لگا''۔

میں نے جواب نہیں دیا۔اس وقت میرا چہرہ سرخ تھا۔میرا دل اور میرا وجود درخت کے کسی پتے کی طرح کانپتا تھا۔میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

''میں تمہارے لئے اجنبی ہوں ۔لیکن تم میرے لئے نہیں ۔بخدا میں نے یامین سے تمہارے بارے میں اتنا کچھ سنا ہے کہ میرا خیال ہے میں تمہیں تم سے بھی زیادہ جاننے لگا ہوں''۔

میں نے پانی سے بھری بالٹی اٹھائی اور یہ کہہ کر رخ پھیر لیا۔

''بخدا میں بھی تمہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں''۔

ذرا آگے جا کر میں نے پلٹ کر جب پیچھے دیکھا تو وہ وہاں سنگی بت کی طرح کھڑا تھا۔غالباً اسے سنگل جیسے گاؤں کی ایک نوعمر لڑکی سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی ۔شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی کسی غیر ترقی یافتہ ماحول میں ایسے بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن

کے ذہنی افق میں اتنی بلندی اور کشادگی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی دنیا میں منفرد نظر آتے ہیں۔

یقیناً میرا اور یامین کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔میں نے گھر آ کر چائے چولہے پر رکھی۔زمینی چولہے میں چھپٹی (کیک نما روٹی) تیار ہو رہی تھی۔میں نے سلور کے کٹورے کے ڈھکن پر پڑے کوئلوں کو نیچے گرایا اور چھپٹی کو بڑی تھالی میں نکالا۔

وہ دونوں آ کر برآمدے میں لکڑی کی پیڑیوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے پیالوں میں چائے ڈالی۔نمکین چائے جس کی سطح پر مکھن تیرتا تھا۔تازہ گرم خوشبو دیتی چھپٹی۔تاجدار خان نے ہنس کر کہا۔

''یار میں نے کوئی دس سال بعد ایسی ذائقہ دار چھپٹی کھائی ہے۔میری ماں بہت بہترین بناتی تھیں''۔

چائے پیتے پیتے انہوں نے سنگل کے قریبی گاؤں ''دماس'' جانے اور وہاں کے مشہور ٹھنڈے پانی کے چشمے پر مرغابی کے شکار کا پروگرام بنالیا۔

اگلی صبح جب ہم ابھی سوتے تھے وہ چلے گئے اور دوپہر کو مرغابیوں سے لدے پھندے واپس آئے۔

میں یامین کی شکر گزار تھی کہ وہ اپنی مروجہ روایات سے جی داری کے ساتھ ٹکرایا تھا۔تاجدار خان وادی یاسین کے قلعہ موڈوری اور بوبر گاؤں میں قدیم یادگار ڈمورا دیکھنے کا خواہشمند تھا۔

اس وقت جب میں خوبانی کی گریوں کا تیل نکالنے کے لئے انہیں بھون رہی تھی میں نے یونہی کہا تھا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔میں پھپھی (پھوپھی) کے پاس ٹھہر جاؤں گی۔عرصہ ہو گیا ہے انہیں ملے ہوئے۔''

اوراس نے بے نیازی سے کہا تھا۔

''بھئی اس میں پوچھنے کی کونسی بات ہے' تیاری کرو۔''

لیکن یہ بات جب ماں کو معلوم ہوئی تو اس نے خشمگین نگاہوں سے بیٹے کو گھورا۔

''کیا باؤلے ہو گئے ہو۔ جوان بہن کو غیر مرد کے ساتھ لے جاتے ہو''۔اس وقت وہ کمرے میں اپنے بریف کیس کو کھولے بیٹھا تھا۔تڑپ کر اُس نے رخ پھیرا اور غصے سے بولا۔

''ماں تاجدار خان کے لئے غیر کا لفظ کبھی استعمال نہ کرنا۔سمجھو وہ میں ہی ہوں''۔

بیٹے کی اس بات پر ماں کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے پر بیٹے لوگ کیا کہیں گے''۔

اور یامین نے بس اتنا کہا

''مجھے لوگوں کی ذرہ پروا نہیں''۔

رات کو دو تندرست اور رپلے ہوئے گھوڑے ہمارے دروازے پر بندھ گئے تھے۔ یہ یامین کی فرمائش پر اس کے ایک دوست نے بھجوائے تھے۔ان دنوں ذرائع آمد و رفت دشوار ترین تھے۔ہنزہ سے بینپال سے کوپس تک اور بینپال سے گلگت تک اتنی چوڑی سڑک تھی کہ اس پر جیپ چل سکتی تھی۔لیکن جیپ تھی کس کے پاس؟ایک بار کسی سرکاری افسر کی گاڑی گاؤں میں آئی تو پورا گاؤں اُسے دیکھنے دوڑا تھا۔

بابو چپ سا تھا۔میں جانتی تھی۔میرا جانا اسے بھی ناپسند تھا پر وہ کماؤ بیٹے کے سامنے مجبور تھا۔البتہ رات کو کھانا کھانے کے بعد اس نے یہ ضرور کہا تھا۔

''بیٹے اتنی سادگی اچھی نہیں۔ سیانے لوگ کہتے ہیں۔ دنات مکرے ساں تی کھتہ (دنیا کو مکر کے ساتھ کھا)

لیکن یہ بات یامین کے سر سے ہوا کی طرح گزر گئی تھی۔

ہم تینوں منہ اندھیرے جب وادی ابھی سوتی تھی بوبر جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔میں یامین کے پیچھے گھوڑے پر سوار تھی۔

یہ حیرتوں کا سفر تھا۔ایک ایسی لڑکی کے لئے جس کی دنیا کتابوں کے گرد آباد تھی۔

اس میں مسرتوں کی آمیزش تھی۔

میں نے اپنا چہرہ اور جسم بہت بڑی چادر میں چھپا رکھا تھا۔گھوڑے سرپٹ بھاگتے تھے اور میں خوف زدہ تھی۔تاجدار خان اچھا گھڑ سوار جان پڑتا تھا۔بابوسر اور کاغان کی وادیوں میں اس نے کافی گھڑ سواری کی تھی۔البتہ یامین کو اپنے بچپن میں اس کا موقع بہت کم ملا تھا۔پھر بھی ان چند دنوں میں اس نے اچھی خاصی پریکٹس کر لی تھی۔

بوبر وادی پنیال کا ایک گاؤں ہے۔یہاں ہمارا ایک رشتہ دار رہتا تھا۔اس کے گھر پڑاؤ ڈالا۔دونوں میاں بیوی بوڑھے تھے۔تعجب سے انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ایک جوان لڑکی کا اپنے بھائی اور بھائی کے دوست کے ساتھ پھرنا معاشرتی اقدار کے مطابق گویا سنگین جرم تھا۔انہوں نے برا منایا اور برملا اس کا اظہار بھی کیا۔

یامین نے قدرے سنجیدہ ہو کر کچھ سوچا اور کہا

''اب ڈمورا کے کھنڈرات تو اسے دکھلائیں۔بیچاری اتنا پینڈا مار کر آئی ہے۔

گاؤں کے شمال میں یہ قدیم یادگار ریت کے ایک ٹیلے پر واقع ہے۔زمین دوز کمروں کا ایک سلسلہ مسمار ہوا پڑا تھا۔سوائے اوپر والی منزل کے ایک کمرے کے۔کمرے کی دیواروں میں قطار در قطار الماریاں ہیں۔فرش پر جابجا بکھرے انسانی ہڈیوں کے پنجر رگ و پے میں دوڑتے خون کو منجمد کرتے تھے۔

یامین نچلے کمرے میں اترنے والے راستے کے عین درمیان رک کر دفعتاً میری طرف مڑا تھا کیونکہ میں نے دہل کر اس کا بازو پکڑ کر کہا تھا۔''نیچے کہاں جاتے ہو۔نکلو یہاں سے باہر۔میرا تو دل ڈوب رہا ہے''۔

''لو دیکھنے کے لئے بھی مری جاتی تھی۔ اب دلیر بنو۔''

لیکن میں اتنی بہادر نہیں بن سکتی تھی۔ سر کی کھوپڑیاں، بازوں کی ہڈیاں اور انسانی اجسام کے پنجر بندے کو اس کا انجام بتا رہے تھے اور میں بالی عمریا کے اس دور میں اپنے بارے میں کسی ایسے اختتام کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور یہی وجہ تھی کہ میں ہڈیوں کو پیروں تلے روندتی باہر آ گئی تھی۔ کھلی فضا میں جہاں سورج چمکتا تھا اور آسمان نیلا شفاف تھا۔ تاجدار خان کی نتھری ہوئی نیلگوں آنکھوں جیسا۔ برف سے لدی پھندی پہاڑوں کی چوٹیاں سورج کی کرنوں سے کیسے کیسے نقش بناتی تھیں۔ ٹیلے پر بیٹھ کر یہ سب دیکھنا بہت دلفریب تھا۔

مجھے نہیں پتہ تاجدار خان کب مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا؟ میری نگاہوں کو برفانی چوٹیوں میں پھنسا دیکھ کر اس نے یہ کہنا بہت ضروری سمجھا تھا۔

''مت دیکھو اس طرح۔ برف بہت سفید اور چمکدار ہے۔ دھوپ میں شدت ہے۔ آنکھوں کی بینائی پر اثر پڑ سکتا ہے۔'' میں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ پر میری آنکھوں کے گرد نیلے پیلے دھبے رقصاں تھے۔

تبھی تاجدار خان پھر مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔

''بتاؤ تو ذرا تمہارے سامنے بھلا کون سے پہاڑ ہیں؟''

مسکراہٹ نے میرے چہرے کو ٹہنی پر کسی شگفتہ پھول کی طرح کھلا دیا تھا۔ میرے چہرے پر تاجدار خان کی نظریں تھیں۔ ان نظروں میں محبت بھی تھی اور وارفتگی بھی۔

میں نے دونوں کی زبان کو سمجھا تھا۔ اٹھلا کر ایک ادائے ناز سے اسے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

''بتا دوں تو کیا انعام دو گے''؟

اس نے اپنی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کو شوخ انداز میں پھیلایا۔ فضا کو دیکھا

اور کہا تاجدار خان جیسے بیبے لڑکے کو تمہیں سونپ دوں گا‘‘۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اپنے گھٹنوں میں سر دے کر میں اتنا ہنسی کہ میرا سارا وجود کسی چلبلی نار کے کانوں میں پہنے خوبصورت جھمکے کی مانند لرزنے لگا تھا۔ جب میں نے سر اٹھایا۔ اس وقت یامین بھی وہاں آ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں پانی دیکھ کر اُس نے پوچھا تھا۔

’’ارے اسے کیا ہوا ہے‘‘۔؟

تاجدار خان نے کہا: ’’میں اسے ایک کہانی سنا رہا تھا۔‘‘

تبھی وہاں ایک نوجوان لڑکا اپنی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چراتا اپنی لگن میں گیت گاتا آ گیا۔ اس کی پاٹ دار آواز نے اس ویرانے میں جہاں خوف و دہشت اور موت جیسی ظالم شے کا کربناک احساس پھیلا ہوا تھا کو ختم کر کے حسن و عشق کی ایک لطیف و سرور آگیں کیفیت کو جنم دیا۔

اس نے سرنئی بجائی اور ہم لوگوں نے دل کھول کر نہ صرف داد بلکہ پیسے بھی دیئے۔

وہ ابدونامی قبیلے کا ایک فرد تھا۔ ڈمورا کے متعلق اس نے بے شمار حیرت انگیز اور انوکھی باتیں بتائیں۔ پر دو میرے ذہن سے چپک گئیں۔

پرانے وقتوں میں لوگ جب شادی کرتے تھے تو دولہا دُلہن کے کپڑے اور زیورات یہاں کسی محفوظ مقام پر رکھ جاتے تھے۔ ان کی موت کے بعد ان کے لواحقین یہ کپڑے اور زیورات انہیں دوبارہ پہنا کر اسی زمین دوز عمارت کے کسی حصے میں چھوڑ جاتے تھے۔

میں نے اس حماقت اور جہالت سے لبریز روایت پر ہنسنا چاہا پر میں ہنس نہ سکی۔ ہنسی میرے گلے میں مچھلی کے کسی کانٹے کی طرح پھنس گئی تھی۔ وہ بدنصیب دُلہنیں اور

دو لہے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے جن کی ہڈیاں یہیں کہیں پڑی ہونگی۔ کیا انہوں نے پہننے اوڑھنے بننے سنورنے کے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔ ایک دن کی بیاہی دلہنیں جن کے سینوں میں جانے کیے کیسے بھانبڑ مچے ہوں گے۔ جب روایات سے بندھے ہاتھوں نے ان نوخیز تنوں سے زیورات اُتارے ہوں گے۔ آنسو آنکھوں سے ٹپکے ہوں گے۔ اور کیا پتہ کسی منچلی نے، کسی شوقین مزاج نے صرف دوبارہ یہ کپڑے اور زیور پہننے کے شوق میں ہی موت کی تمنا کی ہو اور خودکشی جیسی ظالم شے کو سینے سے لگایا ہو۔

بوبر گاؤں میں آباد ابدو قبیلے کی ایک اور خوفناک روایت اب چرواہے کے ہونٹوں پر تھی۔ اس برادری کا کوئی شخص جب مرتا ہے تو ایک شب پہلے اس کھنڈر سے ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔ رشتہ دار اس کے مرنے کا انتظار کئے بغیر قبر کھودنا شروع کر دیتے ہیں۔

یامین نے بحث کی۔

''بابا اگر وہ بچ جائے تو۔''

''بابو ایسا کبھی نہیں ہوتا''۔ چرواہے نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ڈھول کی آواز موت کی پیش گوئی ہے۔

''اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہو''۔

میں نے فوراً یامین کا ہاتھ پکڑ کر خفگی سے کہا۔

''احمقوں والی باتیں مت کرو۔ عقیدہ ہے ان کا۔''

ڈمورا اپنے اندر کیسے کیسے خوفناک اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہاں غیر ملکیوں کی آمد و رفت کا بڑا غلغلہ رہتا ہے۔

ڈمورا کی اس یادگار کو دیکھنے کے بعد ہم جب اپنے اس عزیز کے گھر آئے دوپہر کے سائے ڈھل گئے تھے۔ تاجدار خان نے واپسی کے لئے کہا تھا۔ یامین کا خیال تھا آگے

''یاسین'' کی طرف نکلتے ہیں ۔لیکن تاجدار خان نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ دیار پھر کبھی سہی۔''

ہم لوگ رات ڈھلے واپس سنگل اپنے گاؤں آ گئے ۔

مجھے شدید غصہ تھا۔وادی یاسین جانے کی تمنا اس آ کاس بیل کی طرح تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں پھیلتی ہی جا رہی تھی۔

میرے حالات نے یاوری کی تھی مگر تاجدار خان پہار کی چوٹی سے ڈھلکا ہوا گلیشیر کا وہ تودہ بن گیا تھا جو اچھے بھلے رواں دواں دریا میں گر کر اس کے بہاؤ کے سامنے بند لگا دیتا ہے۔مجھے سمجھ نہیں آتی تھی اس نے ایسا کیوں کیا؟

میں کھانا کھائے بغیر سو گئی تھی۔

میری پلکوں کی چھاؤں میں آرام کرتی وہ سب کہانیاں جو میں ''وقتاً فوقتاً'' پڑھتی اور سنتی آئی تھی،دھیرے دھیرے میری آنکھوں میں اترتی آئیں۔

پتہ نہیں یہ رات کا کونسا پہر تھا جب میں وادی یاسین کے مشہور گاؤں تھوداس کے قلعہ ڈورکھن کی بھول بھلیوں میں تاجور خان کو ڈھنڈوتی پھر رہی تھی؟وہ پتہ نہیں کہاں تھا؟میں اسے آوازیں دیئے جا رہی تھی۔

میری آنکھ کھل گئی۔رات بہت تاریک اور خوفناک تھی۔ڈر کر میں نے چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔

نیند کا ہلکورا آیا تو میں پھر اس کے ساتھ تھی۔درتھوئی میرے قدموں کے نیچے تھا۔میرا دل چاہا میں واخان کی پٹی میں داخل ہو جاؤں۔مایون پرندے کے اس گیت کو سنوں جو وہ چترال کی وادیوں میں بہار کے دنوں میں سناتا ہے۔

میری ساری رات اضطراب میں کٹی تھی۔جان لیوا اور گھائل کر دینے والا اضطراب۔صبح روشن اور چمکدار تھی پر میرے لئے عجیب سی اداسی میں ڈوبی ہوئی۔میں

ناراض تھی۔ میرے گال یوں پھولے ہوئے تھے جیسے کسی نے ان میں مٹھی مٹھی بھر مکئی کے دانے بھر دیئے ہوں۔ دن میں دو بار سامنا ہوا۔ پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اگلے دن دوپہر کو میں باغیچے میں شفتل (جانوروں کا چارہ) اور مکئی کے ڈنٹھل دھوپ میں سوکھنے کے لئے پھیلا رہی تھی تا کہ انہیں سکھا کر سردیوں کے لئے محفوظ کر لیں جب تاجدار خان وہاں آیا۔

میں بے نیازی سے کام کرتی رہی اور وہ میرے قریب کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''ملکہ تم مجھ سے ناراض ہو''۔

میرے جذبات اور احساسات کی شدت آنسوؤں کے موتی بن کر میری آنکھوں میں چمکنے لگی۔ تاجدار خان نے انہیں دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''تمہارے دل میں جو کچھ ہے مجھے بتاؤ''۔

چمکتے موتی میرے رخساروں سے پھسلتے میری چادر میں آ گرے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں اس آسمان، زمین، درختوں، پرندوں اور جگہوں کو دیکھنے کی آرزومند تھی جو میری اس چھوٹی سی دنیا سے مختلف تو نہیں پر نئے ضرور تھے۔ مگر تم نے مجھے یہ سب دیکھنے نہیں دیا۔

تاجدار خان گم سم کھڑا تھا۔ کتنی دیر وہ ایسے ہی کھڑا رہا۔ پھر جُھکا۔ شفتل کے گھٹے پر دھرے میرے ٹھنڈے ہاتھوں پر اس نے اپنے سنہری بالوں والے سخت ہاتھ رکھے اور یوں بولا جیسے چیری کے درختوں سے پھول گر رہے ہوں۔

''مدتوں بعد اپنی سرزمین پر لوٹا ہوں۔ اس لئے چپے چپے کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کی

پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ پر میں اور یامین کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر میں مدتوں رہ کر اپنی معاشرتی اقدار کو بھول سے گئے تھے۔ تمہیں ساتھ لے جانا تو مناسب ہی نہ تھا۔

وہ رکا پھر مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

پر میں وعدہ کرتا ہوں کہ نئے آسمان نئی زمینیں نئے رنگ و روپ تمہاری معیت میں ہی دیکھوں گا۔ بہت جلد۔

پھر وہ اٹھا مڑا اور باغیچے کی چاردیواری سے باہر نکل گیا۔ بیرونی دروازے تک پہنچنے کے لئے اس نے انیس قدم اٹھائے تھے۔ اعتماد عزم اور حوصلے سے بھرے پرے یہ قدم سکندر اعظم کے ان قدموں جیسے ہی تھے جب وہ اپنے گھر سے دنیا کی تسخیر کے لئے نکلا تھا۔

کوئی ہفتے بعد ایک جوڑا ہمارے گھر آیا۔ تاجدار خان کا بھائی اور بھاوج ۔اس کی یہ بھارج خوبصورت تو تھی پر آنکھوں سے مار کھا گئی تھی۔ باز جیسی مدقوق آنکھیں جو دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ ہی عجیب سی کوفت کا احساس دلاتی تھیں۔

یامین کی موجودگی نے ہر مسئلے کو عمدگی سے حل کر دیا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ جونہی فصل کی کٹائی وغیرہ سے فرصت ملے ۔شادی کی رسم ادا ہو جائے۔

ماں سنگل کی کپڑے کی ایک دوکان سے میرے لئے سفید سوتی کپڑا خرید کر لائی تاکہ اس پر مقامی رواج کے مطابق کڑھائی کر کے اسے عروسی جوڑا بنایا جائے۔ یامین نے اسے دیکھ کر کہا ''ہٹاؤ اس کفن کو۔ میں تو اِسے سرخ جوڑے میں رخصت کروں گا''۔

اخروٹ اور انگور پک گئے اور جونہی ان کی اترائی کے دن شروع ہوئے۔ یامین نے اس کام میں خاص دلچسپی لی۔ اخروٹوں کو بوریوں میں اور انگوروں کو ٹوکروں میں بھر کر وہ انہیں گلگت شہر لے گیا۔ جہاں ان کی فروخت سے اس نے معقول پیسے کمائے۔

میں نے اس سرخ ریشمی کپڑے کو جو یامین میرے لئے لایا تھا دن کی تنہائیوں

میں ہزار بار دیکھا تھا۔ سُر سُر کرتے ریشم جیسا سکے وجود پر ہاتھ پھیرے تھے۔ اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر اپنے آپ کو تاجدار خان کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے خود پرواری صدقے ہوئی تھی۔

جس دن اس کی کتائی ہوئی ، آنگن میں میری سکھیاں اور رشتہ دارنیاں جمع تھیں۔ فراک نما قمیص، شلوار، چادر گلے اور بازوؤں کے کفوں پر خوش رنگ دھاگوں سے کڑھائی کی۔ چادر ، کو فیتہ لگایا۔ ٹوپی کو نفیس کڑھت سے مزین کیا۔

اکتوبر کا درمیانی ہفتہ شادی کے لئے طے پایا۔ رشتہ داروں کو سدا بھیجا گیا۔ یہ میرے بابو کے گھر کی پہلی شادی تھی۔ عزیزوں نے پندہ (شادی کے لئے نقدی ، جنس کپڑا) میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری پھوپھی من گندم اور کپڑوں کا جوڑا لائی تھی۔ دونوں چچا دو بھیڑوں اور تین بکریوں کے ساتھ آئے تھے۔ خالہ پندرہ سیر چاول، بیس روپے اور پٹھور (خشک خوبانی) کا ٹوکرہ لائی۔ بیاہ کی تقریب کا آغاز ہو گیا تھا۔

اندر باہر مہمانوں کی گہما گہمی تھی۔ تاجدار خان بارات کے ساتھ ہمارے گاؤں پہنچ چکا تھا۔ بارات کش (بارات کے ٹھہرانے کے لئے ایک گھر مخصوص کیا جاتا ہے) میں مقیم تھی۔

آنے والے دنوں کے حسین تصورات نے میرے وجود کو دھنک رنگوں سے سجا دیا تھا۔ میں یوں چمکتی تھی جس طرح مرغ زریں کے جسم پر حسین رنگی کلغی لشکارے مارتی ہے۔ میرے بھائیوں نے گھر کی دیواروں میں جگہ جگہ روخ (لکڑی کے چراغ) لگا دیئے تھے۔ ان کی تیز بھڑکتی روشنیوں میں عورتوں کی پیشانیوں پر لٹکتے سلسلے (چاندی کا زیور جو ٹوپی کے ساتھ سلا ہوا ہوتا ہے) کس قدر چمک رہے تھے۔

رات کا کھانا خمیری روٹی اور گوشت کے شوربے پر مشتمل تھا۔ کھانے کی سینیاں ابھی اٹھائی بھی نہ گئی تھیں کہ باہر ڈوم (ناچنے بجانے والے) لوگوں نے ڈھول کھڑکانے اور

سرنئی بجانی شروع کر دی تھی۔اس آواز نے گویا کھلبلی مچا دی۔رسم تاؤ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔آنگن کے ایک کونے میں پڑتل کی لکڑیاں جلا دی گئیں۔بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں رقص وموسیقی کا کھیل شروع ہو گیا۔

بابو ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ دائرے میں آیا۔اس نے اپنی چھوٹی بہن محبوب النساء اور اس کے شوہر کو رقص کی دعوت دی۔میری پھوپھی کا عنابی سوٹ ،اس کے گلے میں چمکتا مشٹی (گلے کا زیور) کانوں میں ہلکورے کھاتے چاندی کے کسوار بالے سینے پر سجے طوطے (بروچ نما زیور) ان طوطوں سے لٹکتے لونگوں کے ہار ،ان ہاروں میں الجھتی پھنستی اس کی دو چوٹیاں ،آنکھوں میں گلابی کاجل کے ڈورے ،سبھوں نے مل جل کر اسے کوہ قاف کی پری بنا ڈالا تھا۔

اور میں کھڑکی سے اُسے دیکھتے ہوئے سوچتی تھی کہ خالی خولی حسن سردیوں کی چاندنی راتوں جیسا سوگوار ہوتا ہے۔بناؤ سنگھار اور آرائشی چیزیں اسے گرما کی چاندی رات بنا دیتے ہیں جسے دیکھنے اور سراہنے کے لئے ہر کوئی باہر نکلتا ہے۔

میرے پھوپھا چمکدار چوغے پر سرخ کمر بند (پٹکا) باندھے سر پر توار رکھے رقص کرتے ہوئے جونہی دائرے میں داخل ہوئے ،سیٹیوں اور تالیوں کا وہ شور مچا کہ کان پھٹنے والی بات ہو گئی تھی۔لڑکے پھڑکتے گیت گا رہے تھے۔توا میری پھوپھی کے ہاتھوں پر آ گیا تھا۔وہ اسے رقص کے انداز میں صحن کے چولہے تک لے گئی۔اسے اس پر رکھا۔تین بار اُس پر سوکھا آٹا ڈالا پھر واپس ناچتے ہوئے دائرے میں مل گئی۔اب باقی لوگ باری باری دائرے میں آ کر اپنے کمال دکھا رہے تھے۔

رات ختم ہو رہی تھی۔پر نہ ساز بجانے والوں نے ہمت ہاری تھی اور نہ ہی لوگوں کی ٹانگوں نے تھکن کا اظہار کیا تھا۔قہوے اور نمکین مکھن والی چائے کا دور چل رہا تھا۔جب کہیں صبح کا ستارہ آسمان کے سینے پر چمکا تب محفل اپنے اختتام پر پہنچی۔

دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تھی اُس وقت تلاوَ گی کی رسم ادا ہوئی۔ میں ساری رات جاگتی رہی تھی۔صبح کے قریب آنکھ لگی تو سرنئی بجانے والوں نے ایسی ایسی دلکش دھنیں بجائیں کہ فوراً آنکھیں کھول کر اُٹھ بیٹھی۔گھر کا ہر فرد اپنی جگہ ساکت بیٹھا یا کھڑا یہ دھن سن رہا تھا۔پندرہ بیس منٹ تک یہ دھنیں بجیں۔ان کا مقصد رات بھر کے جاگے ہوئے لوگوں کو تازہ کرنا تھا۔

دوپہر کو تاجدار خان اپنے بھائیوں اور چچاؤں کے ساتھ ہمارے گھر داخل ہوا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا میری چھوٹی بہن بتاتی تھی کہ وہ سفید شلوار ، ریشمی چمکدار سفید قبا ، کامدار کھسے ، اور کلاہ میں اتنا خوبرو لگ رہا تھا کہ ماں نے آگے بڑھ کر اس پر پھونکیں ماریں کہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔رشتہ دار عورتوں نے انہیں اونی دری پر بٹھایا اور اشپری کی رسم شروع ہوگئی۔لکڑی کی تھالیوں میں پتلے پتلے پھلکے جن پر دیسی گھی پگھلا کر ڈالا گیا تھا ، ان کے آگے رکھے گئے۔رواج کے مطابق انہوں نے تین تین نوالے توڑے اور کھائے۔تاجدار خان پر میدانی علاقوں میں رہنے کا اثر تھا۔اُس نے اُس پلیٹ میں جو میری بہن لائی تھی پانچ کا نوٹ رکھا تھا۔

''یہ تمہارے لئے ہے''۔وہ محبت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

میری بہن تھالی اور نوٹ اٹھا کر بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔اس کا چہرہ تپ رہا تھا اور بار بار کہے جاتی تھی۔

''گاکی (بہن کو بلاتے وقت) تاجدار گا کو یا مین سے بھی اچھا ہے''۔

دراصل ان دنوں تھالیوں میں پیسے رکھنے کا رواج نہیں تھا۔تاجدار کی اس حرکت کو سبھوں نے پسندیدگی سے دیکھا تھا اور اسے دریا دل کا نام دیا تھا۔

پورے گاؤں کا ایک ایک فرد کھانے پر مدعو تھا۔سینیوں میں گوشت کا شوربہ ، اس میں ڈالی گئی خمیری روٹیوں کے ٹکڑے اور بوٹیاں یہ بابو جیسے غریب آدمی کی بیٹی کی بارات کا

کھانا تھا۔نکاح ہوا۔تاجدار خان قبول ہے۔قبول ہے۔قبول ہے۔ان الفاظ کی تکراریوں ہوئی کہ میرا سراپا پگھل کر کھولتا ہوا وہ پانی بن گیا جس میں تاجدار خان کے نام کی پتی ڈالی تو قہوے کی دم اڑاتی مسحور کن خوشبو نے مجھے پاگل سا کر ڈالا۔

''ہاں'ہاں''۔

میرے ہونٹوں نے اونچی آواز میں کہنا چاہا پر جیسے کسی غیر مری طاقت نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شاید جذبے شدت پکڑ جائیں تو انسان پر پاگل پن کے دورے سے پڑنے لگتے ہیں۔حواس کی گمشدگی شروع ہو جاتی ہے۔

سرخ جوڑا کیا پہنا میں چنار کا سرخ پھولوں سے لدا ہوا درخت بن گئی تھی۔سلسلے کی زنجیروں نے میری پیشانی پر گویا تاج سجا دیا تھا۔دائیں بائیں سینے پر صدف کے ساتھ لونگ کے لٹکتے ہاروں کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھستی ہوئی بہت سے پیغام دے رہی تھی۔

مشٹی کا زیور میرے گلے میں پہناتے ہوئے میری گہری دوست زینب نے کہا تھا۔

''تو خوش قسمت ہے ملکہ جسے چاہا اسے پالیا۔''

''اپنا چہرہ دیکھو'' لطف النساء بولی۔پنور کی سبز پری نظر آتی ہو جسے ترکستان کا گلفام شہزادہ بیاہنے آیا ہے۔

باہر میری بہنوں اور بھائیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔وہ نال (دلہن کے ساتھ جانے والے لوگ) میں شامل ہونے کے لئے ضد کر رہے تھے اور ماں انہیں ڈانٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کمبختو دم لو۔سارا گھر نال بن جائے گا تو رشتہ دار کیا کہیں گے''۔

میں رونا چاہتی تھی۔لیکن میرے دل کی زمین خوش رنگ پھولوں سے یوں کھلی ہوئی تھی کہ اگر چند لمحوں کے لئے ماں'بابو اور بہن بھایوں سے جُدا ہونے کے دکھ بھرے

احساس کا کوئی چھینٹا ان پر گرتا بھی تو پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ کہاں گیا ہے؟

ایک شور مچا تھا۔ رخصتی کا سمے آن پہنچا تھا۔ ماں روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اندر باہر کے چکر کاٹ رہی تھی۔ باہر سازندوں نے ''چلاہو'' کی دردناک دھنیں چھیڑ دی تھیں۔ میری چچیوں' پھوپھی اور دیگر رشتہ دار عورتوں نے یاماگی (بابل کے گیت) گانے شروع کر دیئے تھے۔ اس وقت میری آنکھوں سے آنسو یوں بہے جیسے بکرے کی کٹی گردن سے خون بہتا ہے۔ میں پالکی میں بیٹھی جسے کہاروں نے اٹھایا۔ میری دسکھیاں سہلیاں بہت دور تک میرے ساتھ ساتھ چلیں۔

ہولو سے آگے دریا تھا جسے جالو (مقامی کشتی) کے ذریعے پار کیا گیا۔ اِس کی وادی پھمائی بیٹیال کا آخری گاؤں ہے۔ آگے اشکومن کی وادی شروع ہو جاتی ہے۔ دو میل کے فاصلے پر چٹور کھنڈ کا بازار ہے۔

میں ایک ایسے گھر کے سامنے کھڑی تھی جس کے بڑے بڑے دروازوں کو نیلا رنگ کیا ہوا تھا۔ میرے اردگرد باراتی اور رنال کے لوگ کھڑے تھے۔ تاجدار خان کے چچا نے زور سے آواز لگائی تھی۔

''میری بیٹی ملکہ کے لئے تم گھر والے کیا دان کرتے ہو''؟

اندر سے آواز آئی تھی:

''وادی کے شمال کی سمت اترائی میں دو کھیت اس کے ہیں''۔ تب میں اندر داخل ہوئی۔ مجھے اور تاجدار کو اکٹھا بٹھایا گیا۔ لکڑی کی تھالیوں میں اشپری آئی جسے ہم دونوں نے تین تین بار کھایا۔

اس کے بعد تاجدار کی بہن مل (گندم کے آٹے کا نمکین حلوا) پکا کر لائی۔ تاجدار خان نے چکھا اور اسے پیسے دیئے پھر میں نے چکھا اور اسے نیگ دیا۔

''اچھا گھر ہے''۔ میری بہن نے میرے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

صبح میری پھوپھی نے میرا ٹرنک کھولا۔ تاجدار خان کے بڑے بھائی اور بھاوج کو سوٹ دیئے۔ دوسری بھاوجوں کو ٹوپیاں اور چادریں۔ چھوٹے بچوں کے لئے خوبانیوں کی گریوں کے ہار اور کانٹے جو میں نے خود بنائے تھے۔ لڑکیوں کے لئے ٹوپیاں بھی کاڑھ کرلائی تھی۔ بچیاں مجھ سے یوں چمٹی ہوئی تھیں جیسے شہد کی مکھیاں چھتے سے۔

شادی کے اس ہنگامے کے ہر ہر لمحے سے میں نے لطف اٹھایا تھا۔ سرشاری محسوس کی تھی۔ مگر وہ لمحے اس کا عروج تھے جب شام ڈھلے مجھے بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ آگ جلتی تھی۔ کمرے میں خوشگوار سی حدت محسوس ہوتی تھی۔ میرے عزیز و اقارب اور اردگرد کے سب لوگ وہاں موجود تھے۔ جلتے چولہے پر توا دھرا تھا اور مجھے روٹی پکانا تھی۔

ہو ہا کا شور، گیتوں کی آوازیں، قہقہوں کی برسات، سب میرے اوپر برف باری کی پھوار کی مانند گر رہے تھے۔ میرے بالکل قریب بیٹھا تاجدار خان مجھے شوخ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے ایک بار اتفاقیہ ٹکراؤ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ یہ بوکھلاہٹ مزید بڑھ گئی جب اس نے میری چادر میری پشت پر سے کھینچ کر میرا گھونٹ چھوٹا کرتے ہوئے کہا۔

''جانم روٹی ایسی پکنی چاہیے کہ آج تک کسی کی دلہن نے نہ پکائی ہو۔ اسکی اس بات نے مجمع کو گویا پھلجڑی بنا دیا تھا۔

سسرالی لڑکیوں نے میرے بازوؤں کو بہانے بہانے سے کھینچا تا کہ روٹی خراب ہو جائے۔ میں نے اڑتے حواس ٹھیک کئے اور کمال ہوشیاری سے اُن کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ دونوں بازوؤں کو دونوں گھٹنوں میں سمیٹتے ہوئے میں نے روٹی آہستہ آہستہ بنائی توے پر جب ڈالی تو اس کی وضع قطع بہت اچھی تھی۔ میرے رشتہ داروں نے تالیاں بجائیں۔

اب تاجدار خان کی باری تھی۔ اسے روٹی کو پلٹا دینا تھا۔ پلٹتے وقت روٹی اگر ٹوٹ

جاتی تو گویا اس بازی میں یہ اس کی ہار تھی ایک عورت کے ہاتھوں ہار۔

اس نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی۔ ہنسا اور بولا۔

''دلہن مجھے بہت پسند ہے۔لیکن زندگی میں میں نے ہارنے سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔بے شک یہ ہار ملکہ جیسی خوب رو دلہن کے ہاتھوں مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔''

اور اس نے برق رفتاری سے مہارت کے ساتھ روٹی کو پلٹا دیا۔پھر وہاں تاجدار خان کے نام کا وہ شور مچا کہ یوں لگتا تھا کمرہ اڑ جائے گا۔

اس شب کے پہلے پہر تارجدار خان کی بھاوج مجھے جس کمرے میں لے کر گئی وہ اگر چہ تھا تو چھوٹا سا پر صاف ستھرا تھا۔چھت اور فرش لکڑی کے تھے۔فرش پر دری اور دری پر موٹا گدا بچھا تھا۔لالٹین کا شیشہ اتنا صاف تھا کہ اُس نے اندر کی روشنی کو دو چند کر دیا تھا۔ کھونٹیوں پر تاجدار کے کپڑے لٹک رہے تھے۔

میں نے نمکین چائے کا پیالہ پیا۔رضائی کو اپنے گھٹنوں پر اچھی طرح پھیلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تاجدار خان جب کمرے میں آیا۔میں نے باہر قہقہوں کی آوازیں سنی تھیں۔یہ یقیناً اس کی بھاوجیں اور گاؤں کی شوخ و شریر عورتیں تھیں۔

تاجدار خان میرے پاس بیٹھا۔اس نے گھٹنوں میں دیا میرا سر اٹھایا اور بولا ''تمہارا گھونگھٹ تو میں یاسین کی کسی وادی میں اٹھانا چاہتا تھا پر رسم و رواج کے ہاتھوں تھوڑا سا مجبور ہو گیا ہوں''۔

میں نے بند آنکھیں کھولیں۔اس کی آنکھوں میں میرے لئے محبت کا سمندر تھا۔ جذبوں کی تڑپ تھی۔بے اختیار میرا سر اس کے شانے سے جا لگا تھا۔روایتی لڑکیوں کی طرح شرمانے دبکنے نہ نہ کرنے کو میرے اندر نے پسند نہیں کیا تھا۔وہ ساری رات اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر ان کہانیوں کو سنانے میں گزاری تھی جو اس نے ان سالوں میں

میرے متعلق سنی اور فرض کی تھیں۔

میں نال والوں کے ساتھ واپس اپنے میکے نہیں آئی۔تیسرے دن ایک صحت مند پولو کھیلنے والا گھوڑا باہر خوبانی کے پیڑ کے ساتھ بندھ گیا۔تاجدار نے مجھے اونی پاجامہ، اونی ٹوپی اور گرم سوٹ پہننے کو دیا جو وہ نیچے سے لایا تھا اور اس کے بکس میں بند تھا۔اس نے خود بھی گرم کپڑے پہنے۔بندوق کو صاف کیا۔کارتوس کی پیٹی کمر میں ڈالی۔ضروریات کی سب چیزیں ایک بڑے تھیلے میں رکھیں۔

ہم یاسین جانے کے لئے تیار تھے۔

گھوڑے پر پہلے میں بیٹھی پھر وہ۔اس کی بھاوجیں ٹکر ٹکر میری صورت دیکھتی تھیں۔شاید میرے نصیبے پر رشک کرتی تھیں۔بھائی بھی پاس کھڑے تھے۔کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اسے کوئی بات کہہ سکے۔وادی سے باہر آنے کے بعد تاجدار خان نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''ملکہ تمہیں یہ سب کیسا لگ رہا ہے''؟

میں نے بازو اس کی کمر کے گرد پھیلا کر سر اس کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا تھا

''میرے خوابوں کو تعبیر مل رہی ہے''۔

چمکتا سورج ہمارے سر پر تھا۔دکنی ہواؤں میں تیزی تھی۔گھوڑا سرپٹ بھاگے جاتا تھا۔وادیاں گزر رہی تھیں اور میں اس کی پشت سے سر ٹکائے اپنے مقدر پر رشک کر رہی تھی۔تاجدار میری کہانیوں کے ہیرو جیسا تھا۔

یاسین کے لئے گاہکوچ اور گوپس سے جانے کی بجائے اس نے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا۔ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ وہ سب سے پہلے یاسین میں کوہرامان کے مزار پر اپنی عقیدتوں کے پھول چڑھائے گا۔

شام کے وقت ہم نے ایک چھوٹی سی وادی میں پڑاؤ کیا۔تاجدار خان گھوڑے

سے چھلانگ مار کر اترا مگر میری ٹانگیں شل تھیں ۔میں نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ اس نے میری مشکل کو سمجھا۔اپنے بازو بڑھائے۔میں اس کے بازوؤں میں سما کر اتری مگر میرے قدموں نے زمین پکڑنے سے انکار کر دیا۔

''مجھے چھوڑنا مت''میں چلائی۔

وہ ہنسا اور اس نے کہا

''ملکہ بھلا تمہیں چھوڑنے کو تھوڑی پکڑا ہے میں نے''۔

دیر تک وہ مجھے اپنے آپ سے لگائے کھڑا رہا۔جب پیروں کی سنسناہٹ کم ہوئی تب اسنے مجھے چھوڑ کر گھوڑے کا رخ کیا۔

یہ چھوٹا سا گھر تھا جہاں ہم نے رات گزاری۔مخلص اور مہمان نواز لوگ تھے۔ جنہوں نے ہمیں سفر کے لئے انڈے ابال کر دیئے اور تھرموس کو چائے سے بھر دیا۔علی الصبح ہم نے سفر کا آغاز کیا۔اور جب سورج نصف النہار پر تھا۔ہم یاسین میں گوہرامان کے مزار پر کھڑے تھے۔

گلگت اور یاسین کا راجہ گوہرامان جس کی دہشت سے کبھی زمین کانپتی تھی۔مٹی کا ڈھیر بنا پڑا تھا۔مزار کے ارد گرد دیودار کے درختوں کا ایک جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔قبرستان یوں تو ہوتے ہی ویران ہیں۔پر یہاں اداسی اور ویرانی دوچند تھی۔درختوں کے پتے اپنے اپنے ٹھکانوں سے بے گھر ہو رہے تھے۔آسمان شندھور جھیل کے پانیوں جیسا نیلا اور شفاف تھا۔ مزار کے اطراف میں لگے ہوئے پتھروں میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔بیشتر اپنی جگہ سے سرک کر دور نزدیک پڑے تھے۔مزار کے چاروں کھونٹ گڑی لمبی باریک لکڑیوں پر زائرین کے رومال ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

میں نے فاتحہ پڑھی۔تھیلے میں سے سرخ رومال نکالا اور اسے لکڑی کے ساتھ ٹانگ دیا۔تاجدار خان کی فاتحہ خوانی بڑی لمبی تھی۔بہت کچھ پڑھنے کے بعد جب وہ اس جگہ

آیا جہاں دھوپ کے رخ پر میں بیٹھی فضا کو دیکھتی اور دھوپ میں اپنے جسم کو پگھلا رہی تھی جو مکھن کے پیڑے کی مانند ٹھنڈا اور ماش کے آٹے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔

تاجدار نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

راجہ گوہر امان کے بارے میں کیا جانتی ہو؟

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

''یہ تم ہمہ وقت میرا امتحان لیتے رہتے ہو۔ میں راجہ غازی گوہر امان کے بارے میں بہر حال تم سے زیادہ جانتی ہوں''۔

''خوب! اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسا پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اس کے قہقہے اس ویران فضا میں بہت دور تک گونجے۔ وہ میری بات سے محظوظ ہوا تھا۔

میں نے تھیلے سے چھچھتی نکالی۔ انڈے چھیلے۔ انہیں چھوٹے سے کپڑے پر رکھا اور تھرموس کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''پہلی بات تو یہ کہ وہ صاحب سیف و قلم تھا۔ چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے بات کو جاری رکھا

دوسری بات ایسا دلیر، ایسا بہادر، ایسا جیالا اور شہ زور تھا کہ سکھوں اور ڈوگروں کو نتھ ڈال دی تھی۔ اس کی ہیبت کی دھاک اس درجہ تھی کہ ڈوگرہ عورتیں اُپنے رُوتے ہوئے بچوں کو اس کا نام لے کر چپ کرواتی تھیں۔ اسلام کا سچا داعی جس نے ایک سو سال قبل اس چھوٹے سے خطے کو بیرونی دشمنوں سے محفوظ کر کے ایک چھوٹے سے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی''۔

تاجدار خان گنگ بیٹھا میری صورت دیکھتا تھا۔

اونی تھیلے میں سے گھر سے لائی ہوئی چھچھتی نکالتے ہوئے میں زیر لب مسکراتی تھی۔ اس نے جب چائے کی پیالی اٹھائی تو کہا۔

''مجھے تم پر فخر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ رابعہ کو ہرامان کی شخصیت پر اس سے بہتر الفاظ میں خراج پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔''

اور جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ میں وادی یاسین کے مرکزی گاؤں تھوداس میں کھڑی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ میل چوڑی اور چار میل لمبی یہ وادی زمانوں سے میرے حواسوں پر سوار تھی۔ قلعہ ڈورکھن اب خستہ حالت میں ہے۔ اس کی سیر کرتے ہوئے میرے تصورات اور حقائق میں تصادم ہوا تھا۔ جو تصویریں میرے ذہن نے سن کر تراشی تھیں وہ یکسر فرق تھیں۔ اس کی بھول بھلیوں میں میں نے ایک پل کے لئے بھی تاجدار خان کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے یونہی وہم ہونے لگا تھا کہ کہیں میرا اس رات کا خواب سچا نہ ہو جائے۔

پولو گراؤنڈ اور ڈسپنسری کے اوپر سے ہوتے ہوئے ہم اس گھر میں آ گئے جہاں میری رشتے کی پھوپھی رہتی تھی۔

وادی یاسین دفاعی اعتبار سے وادی اشکومن کی طرح خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے شمال اور شمال مشرق میں سطح مرتفع پامیر، روسی ترکستان اور واخان کا علاقہ، مشرق میں اشکومن، آگے نکل کر چینی ترکستان، جنوب میں گلگت اور مغرب میں چترال واقع ہے۔

یہ بہت خوبصورت شام تھی۔ میری زندگی کی چند حسین شاموں میں سے ایک حسن اور راگ و رنگ سے لدی پھندی شام، جب وادی کے کئی لوگ ہم سے ملنے آئے تھے۔ بیٹھک کے درمیانی حصے میں عین گنبد کے نیچے آگ جل رہی تھی اور اردگرد ہم سب بیٹھے تھے۔ اس ادھیڑ عمر آدمی نے جو درکوت درّے کی کسی وادی کا رہنے والا تھا جس کی مادری زبان پرانی فارسی تھی۔ اُسنے کس مہارت سے ستار بجایا تھا۔ اس کی پرسوز آواز، فارسی جیسی شیریں زبان کا گیت اور ستار کی دلنواز دھنیں۔

میں تھکی ہوئی تھی۔ پر وہ گیت اور ساز میری تھکاوٹ کے لئے ٹکور جیسے ثابت

ہوئے تھے۔یاسین کی مقامی زبان بلتم اور کھوار ہے۔ویسے فارسی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ موسیقی سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔شام کے وقت تقریباً ہر گھر سے ستار کی دلنواز دھنیں سنائی دیتی ہیں۔ساری شام گیتوں کی نذر ہوئی تھی۔نہ سنانے والا تھکا تھا اور نہ سننے والوں کی تشنگی مٹی تھی۔

سندھی کا گاؤں یاسین سے صرف دو تین میل اوپر شمال کی طرف ہے۔قلعہ موڈوری دیکھنے کے لئے ہم دونوں اس پہاڑی ٹیکرے پر کھڑے تھے جہاں قلعے کے آثار ملتے ہیں۔

''مسلمان قوم ہمیشہ اپنوں کی غداری سے تباہ ہوئی''۔

تاجدار خان کی نظریں دور کھنڈرات میں کھٹن گھیریاں کاٹ رہی تھیں۔موڈوری کی لرزہ خیز داستان جائے عبرت ہے۔

اس کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔

راجہ گوہر امان کے مرنے کی دیر تھی کہ نگر کے راجہ نے ڈوگروں کو گلگت پر حملے کی دعوت دے دی۔انہوں نے گلگت کو فتح کیا تو یاسین پر نظریں جم گئیں۔یاسین کے جیالوں نے سندھی میں قلعہ موڈوری تعمیر کیا۔تمام لوگ اس میں قلعہ بند ہو گئے۔آنے جانے کے لئے یہ طے ہوا تھا کہ رات کے وقت جس کی ٹوپی پر پھول ہو گا وہی قلعے میں داخل ہو سکے گا۔ یہ راز بھی ڈوگرہ فوج کو بنیال کی راجہ فیملی کے ایک شخص ارسلا خان کی غداری کے ہاتھوں پہنچا۔راتوں رات ڈوگرہ سپاہی ٹوپیوں پر پھولوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گئے۔بڑی خوفناک جنگ ہوئی۔پانچ ہزار یاسینی شہید ہوئے۔بے شمار عورتوں کو ڈوگرے اور سکھ اپنے ساتھ لے گئے۔حاملہ عورتوں اور بچوں پر اس قدر ظلم وستم ہوئے کہ ہلاکو خان کی یاد تازہ ہو گئی۔

''اے میرے رب۔ نیلے چمکتے آسمان کے نیچے تاجدار خان نے اپنی آنکھیں

بند کر کے دونوں ہاتھ دعائیں انداز میں اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے ملک کو سازشیوں غداروں اور دشمنوں سے اپنی پناہ میں رکھنا''۔

۴۵۷۵ میٹر بلند درکوت درے پر پہنچ کر مجھے اپنا اور یامین کا بچپن یاد آیا تھا۔ جب وہ اپنے سبق کو گھوٹا لگا کر یاد کیا کرتا۔ دو پہاڑوں کے درمیان بننے والے تنگ راستے کو درہ کہتے ہیں۔ درکوت دتھوئی اور شندھور وادی یاسین کے درے ہیں جہاں سے واخان میار خون داور چترال کو راستے نکلتے ہیں۔

میں آج اسی درکوت دڑے کے دہانے پر کھڑی تھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اس جگہ کو بھی دیکھا تھا جہاں وہ انگریزی سیاح جارج ہائی ورڈ قتل ہوا تھا۔

بیچارہ ہائی ورڈ ایک عظیم انسان کیسے منفی سیاست کی بھینٹ چڑھا۔

درکوت میں ہی وہ گرم چشمہ بھی دیکھا۔ جس کے گرم پانی میں انڈا ابلنے کے لئے صرف ڈیڑھ دو منٹ لیتا ہے۔ بھاپ اڑاتے اس چشمے کے کنارے بیٹھ کر تاجدار خان نے مجھے شہری انداز کی چائے بنانا سکھائی۔ انڈے کھائے اور چائے پیتے فضا کے سناٹے کو اپنی رگوں میں اُتارتے ہوئے دفعتاً تاجدار نے مجھ سے پوچھا۔

''جانتی ہو شہروں میں شادی کے بعد جب نو بیاہتا جوڑے ایسے سیر سپاٹوں کے لئے نکلیں تو کیا کہا جاتا ہے۔

میں ہنس پڑی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے قہوے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور بولی ''میرے جسم کا ہر مُو یامین کا شکر گزار ہے کہ اس نے مجھے ہر موضوع پر کتابیں بھیج کر میرے ذہن کو وسعت اور کشادگی دی''۔

''تاجدار خان ہم اپنا ہنی مون منا رہے ہیں''۔

اس نے مجھے اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا تھا۔

''سچ تو یہ ہے بابا تم کسی سقراط بقراط سے کم نہیں ہو''۔

نازبر کے اس چشمے کو دیکھنے کے لئے میں نے تاجدار خان سے خود فرمائش کی تھی۔ جس کا رنگ خون سے ملتا جلتا ہے۔لیکن وہاں پہنچ کر بڑی دہشت طاری ہوئی۔ بڑا ڈروانا ماحول تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں مار دھاڑ ہوگئی ہے اور انسانی خون یوں فراوانی سے بہنے لگا ہے۔ہم لوگ زیادہ دیر نہیں وہاں ٹھہرے۔

گھر سے نکلے کتنے دن ہو گئے تھے میں نے انگلیوں پر گنے۔''اب واپسی ہونی چاہیے''۔پر جان شندھور جھیل دیکھے بغیر نہیں''۔

تاجدار خان نے میرے سنہرے بالوں کی لٹوں کو سنوارتے ہوئے کہا تھا۔

سات آٹھ میل لمبی پانچ میل سے زیادہ چوڑی یہ خوبصورت ترین جھیل چترال اور گلگت کی سرحد کے قریب چاروں طرف پہاڑوں سے گھری آنے والوں کو اپنے حُسن کے سحر سے مسحور کرتی ہے۔اس کے کنارے پر برطانوی دور کا تعمیر شدہ ریسٹ ہاؤس بہت اچھی حالت میں ہے۔ہم لوگ اس میں ٹھہرے۔دن چڑھتا اور ہماری کشتی نیلگوں سطح پر تیرنے لگتی۔اس کا پانی میٹھا نکھرا ہوا اور آئینے جیسا شفاف ہے۔تہہ میں کون کون سے جانور ہیں؟ سب دکھائی دیتے ہیں۔یہاں ٹراؤٹ مچھلیاں دل بھر کر کھائیں۔تاجدار نے مارخور کا شکار کیا اس کے گوشت کو ریسٹ ہاؤس کے عملے نے ضیافت کے طور پر اڑایا۔

''کاش اس جھیل سے نہریں نکالیں جائیں۔یہ چترال اور گلگت کے علاقوں کی خوشحالی کی ضامن بن سکتی ہیں''۔تاجدار خان نے کہا تھا۔

ہم پورے بیس دن بعد لوٹے تھے۔سنگل میں اپنے گھر جہاں بابو یامین اور ماں تھے۔چھوٹے بہن بھائی تھے۔جنہوں نے مسرتوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا تھا۔ہمیں خوش دیکھ کر نہال ہوئے تھے۔پندرہ دن ان کے پاس رہنے کے بعد میں کراچی آگئی تھی۔جہاں تاجدار خان نوکری کرتا تھا۔پڑھتا تھا۔محنت مزدوری کرتا تھا۔جہاں اس کے شب و روز کولہو کے بیل کی طرح تھے۔

سلمیٰ اعوان نے رضائی پرے پھینکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ملکہ کی گفتگو کا سحر ایسا تھا جس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ آپ بیتی میں اتنی دلکشی اور حسن تھا کہ ذہن اسی زمان و مکان میں قید ہو گیا تھا۔ انداز بیان کسی کامیاب داستان گو جیسا تھا کہ میں کہیں پیچھے چھپ گئی تھی۔

سچی بات یہ بھی تھی کہ اس کہانی میں مجھے اپنے وجود کا احساس دلانا کچھ ایسا لگا تھا جیسے لذیذ کباب کھاتے کھاتے اچانک ہڈی آ جائے یا کسی سنجیدہ سی محفل میں کسی فرد کی خواہ مخواہ ہی مداخلت پر کہا جائے۔ ''پرے ہٹ تو کی لُچ پیا تلدا ایں''۔ (یعنی تم کیا بیچ میں فضول حرکتیں کرتے ہو)

لیکن کراچی پہنچ کر ملکہ کو جو فل اسٹاپ لگا اس نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے رضائی پرے پھینکی اور اٹھ بیٹھی۔ باہر ٹھنڈی ہوائیں دف بجاتی پھرتی تھیں۔

''آگے چلیں نا۔

تب سے اب تک کی زندگی میں تو بہت سے نشیب و فراز آئے ہوں گے۔ کچھ کہیں، کچھ بتائیں''۔

فراز کہاں؟ نشیب ہی نشیب تھے۔ تاجدار خان بہت بڑا افراڈ ثابت ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ہی گود میں پانچ ماہ کا بچہ دے کر فرار ہو گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دف بجاتی یخ ہوائیں دروازہ توڑ کر اندر آ گئی ہیں اور سارے میں انسانی حسیات کو سُن کر دینے والے عمل جاری ہو گیا ہے۔ میرے اوپر دورے کی سی کیفیت طاری تھی۔

''کیا ہوا تھا؟'' میرا ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

روڈ ایکسیڈنٹ میں اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہ دی۔ چھ فٹی گھبرو جوانی کو منوں مٹی تلے دبا کر مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ میں کیسے زندہ ہوں؟ وادی سنگل کی خاموشی میں ڈوبی ہوئی وہ رات میرے لیے بڑی ہنگامہ خیز تھی۔

میرے ذہن میں اتھل پتھل تھی۔ ایک ٹک میں کھڑکی کے راستے باہر تاریکیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس اتنی خوبصورت کہانی کا انجام اتنا المناک کیوں ہے؟ پیدا کرنے والا بھی کبھی کبھی اذیتوں کی عنایت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔

پھر میں نے اس خوبصورت چہرے کو بار بار دیکھا یہ جاننے کے لئے کہ سفر کیسے کٹا؟ پہاڑوں کی بیٹی تھی۔ پہاڑوں جتنا حوصلہ کرلیا۔ اس کے ساتھ گزرے ہوئے پانچ سو اڑتالیس دن رواں دواں ماہ و سال پر پھیلا دیئے۔ جس دن کو چاہتی منہ میں رکھی چیونگم کی طرح کھینچ کر لمبا کیے جاتی۔

یامین میرے پاس تھا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا گھر۔ ہر روز کمرہ اسی انداز میں سجاتی جو اُسے پسند تھا۔ شام کو اپنا کھانا اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آتی۔ خود کلامی کی عادت میرے اندر یہیں سے پروان چڑھی۔ میں بالکل ایسے ہی باتیں کرتی جیسے وہ میرے سامنے بیٹھا ہو۔ دن بھر کی کارگزاری کی ایک ایک تفصیل دینے کی شرارتوں کا ذکر، اڑوس پڑوس کی باتیں۔ سب کچھ کہہ دینے کے بعد آنکھیں موند کر سو جاتی۔ بس تو یونہی اتنی عمر گزر گئی اور باقی بھی گزر جائے گی۔

ہاں مالی تنگی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ پہلے یامین نے سنبھالا دیا۔ بیٹا بڑا ہوا تو میں نے سلائی کڑھائی کا کام سیکھا اور سکول چلایا۔ بہت پیسہ کمایا۔ بیٹا ہارٹ سرجری میں سپشلائزیشن کے لئے باہر گیا تو میں یہاں آئی ہوں۔ دیکھو مستقل ڈیرے ڈالتی ہوں یا واپس چلی جاتی ہوں۔

''اور یامین'' میں نے پوچھا۔

''رحیم یار خان کا ڈپٹی کمشنر ہے آج کل۔

میں نے رضائی میں منہ دے کر آنکھیں موند لی تھیں۔ مگر میں جانتی تھی مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میرا ہر مُو سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

باب:11

ہنزہ

مصری بانو سے ملنا۔ہنزائی بڈھوں سے ذراٹُوٹُو میں میں

التت اور بلتت

علی مدد اور ہنزہ ان دو ناموں سے میرے کان پہلی بار ۱۹۵۸ء کی اس ٹھنڈی شب کو آشنا ہوئے تھے۔جب میرے ماموں علی حسن غضنفر نے بڑے کمرے میں رضائیوں اور کمبلوں میں لپٹے افراد خانہ کے درمیان ان خوبانیوں کو تقسیم کیا تھا جن کی اندرونی گٹھلی نکال کر انہیں چوڑا کر کے درمیان میں بادام کی گری رکھنے اور اس پر ایک اور خوبانی کی تہہ جمانے کے بعد انہیں خشک کیا گیا تھا۔

یہ تحفہ اُن کا بے حد وفادار ملازم علی مدد ہنزہ سے لایا تھا جسے وہ رخصت پر پیچھے آتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئے تھے اور اب اہل خانہ کو بھی علی مدد اور اس کے آبائی گاؤں ہنزہ کے بارے میں بتا رہے تھے۔پہاڑوں، جھرنوں، گلیشروں اور لوگوں کی ایسی پرتحیّر باتیں تھیں کہ کسی الف لیلوی داستان کا گمان گزرتا تھا۔

اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اتنا قریب آ کر اس وادی کو دیکھنے نہ جاتی جس کے بارے میں اس شب سنتے سنتے میں نے اس کے بے شمار تصوراتی خاکے اور شکلیں بنا ڈالی تھیں۔وہ شکلیں وہ خاکے کہیں میرے لاشعور میں محفوظ تھے۔

مجھے بچوں کی ہڑک اٹھی تھی۔انجانے وسوسوں اور اندیشوں نے میرے دل کو بوٹیوں میں کاٹنے کی کوشش بھی کی تھی۔پر میں نے سب کچھ اللہ کے توکل پر چھوڑتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ہنزہ تو ہر صورت جانا ہی ہے۔''

لیکن پریشانی یہ تھی کہ ہنزہ میں کوئی واقف فیملی نہ تھی اور تن تنہا کسی ہوٹل میں رات گزارنا گویا اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے والی بات تھی۔ پر یہ بھی تو تھا کہ گزشتہ ہفتہ بھر سے میں ہر روز اپنے آپ کو نت نئے تجربے میں سے گزار رہی تھی۔

''یہ تجربہ بھی سہی۔ میں نے دل کو تسلی دی۔ خدا سبب الاسباب ہے۔''

ہنزہ جانے کے لئے اڈے پر پہنچی تو ایک عمر رسید ڈرائیور کو اپنی نئی نویلی گاڑی کا شیشہ صاف کرتے ہوئے پایا۔ صفائی کچھ اس دلار سے ہو رہی تھی جس دلار سے ماں اپنے بچے کو چمکاتی دمکاتی ہے۔ میرے استفسار پر کہ ہنزہ جانا ہے اس نے ہاتھ روک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''اکیلی ہیں کیا؟''

میں نے جواب میں ''ہاں'' کہا تھا۔

''میں دراصل ایک ہوٹل والے کا سامان لے جا رہا ہوں۔ جگہ تو ہے مگر گاڑی اس نے بک کی ہوئی ہے۔''

''جگہ ہے تو مجھے بٹھا لینے میں کیا ہرج ہے''۔

''کوئی ہرج نہیں ہم آپ کو لے چلیں گے۔ عقب سے ایک نحیف سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں فی الفور گھومی اور دیکھا۔ ساٹھ ستر کے ہیر پھیر میں جو مرد مجھے نظر آیا تھا وہ قامت اور صحت کے اعتبار سے قابل رشک تھا۔

میں نے فی الفور شکریہ ادا کیا۔ مگر کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ گو دونوں کے ساتھ قبر میں پاؤں لٹکانے والی صورت حال تو ہرگز نہیں ہے۔ ویسے کناروں پر ضرور بیٹھے ہیں کہیں ایسا نہ ہو اپنے ساتھ میرا بھی بیڑہ کر دیں۔ میرے شعور کے کسی گوشے میں یہ بات برسوں سے گڑی ہوئی تھی کہ سفر ہمیشہ زیادہ لوگوں کی ہمراہی میں کرنا چاہیے۔ بسا اوقات کوئی

اللہ کا نیک بندہ بہت سے اوروں کی بھی سلامتی کا ضامن بن جاتا ہے۔

مجھے اپنے اس خدشے کے بھونڈے پن کا احساس بہت جلد ہو گیا۔

''بھلا میں نے زندگی اور سلامتی کا کوئی پٹہ لکھوایا ہوا ہے''۔

بہر حال دو بوڑھوں کی ہمراہی میں سفر شروع ہوا۔ یہ بوڑھے ایسے باتونی ، ایسے چرب زبان ایسے گالڑی کہ ہنزہ تک ان کی زبانیں تالو سے نہ لگیں۔ ہر مقام اور ہر بستی کی نشان دہی کرتے گئے۔ جٹیال کے بارے میں بتایا کہ بیشتر آبادی ہنزہ کے لوگوں کی ہے۔ لوگ پہلے زمین نہیں خریدتے تھے۔ اب کال پڑ گیا ہے۔ پچھتر فی صد فوجی ہیں۔

دینور کی درختوں سے گھری وادی گزر گئی۔ سلطان آباد بھی خالص ہنزہ والوں کی بستی ہے۔ یہاں سے آگے بنجر پہاڑ شروع ہوئے۔ سبزہ ختم تھا۔ دریائے ہنزہ چھوٹی سی نالی کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ شاہراہ ریشم کی کشادگی اور پختگی نے راستے کی دشوارگزاری کو نسبتاً بہت کم کر دیا ہے۔ دریا پار پرانی سڑک کچھ یوں نظر آتی تھی جیسے پہاڑوں کے جگر کو تیز دھار کا کوئی آلہ ایک سیدھ میں چیرتا ہوا چلا گیا ہو۔

رحیم آباد میں انہوں نے گاڑی روکی اور مجھے علی شاہ کاکس کی مشہور خوبانیاں کھلائیں۔ ایسی لذیذ اور ذائقہ دار کہ منہ میں رکھو اور گھلتی ہوئی پل میں عین حلق سے نیچے۔

رحیم آباد اور گلگت کے درمیان چوبیس میل کا فاصلہ ہے۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل جہاں کھانے اور چائے کا انتظام ہے۔ تمام گاڑیاں یہاں آکر چائے پانی کے لئے رکتی ہیں۔ وہ دونوں تو چائے پینے بیٹھ گئے ہیں میں اِدھر اُدھر گھومنے نکل پڑی۔ خوبانیاں درختوں کے نیچے یوں بکھری پڑی تھیں جیسے کسی بچی کا پیارا سا موتیوں کا ہار ٹوٹ کر بکھر گیا ہو۔ سڑک پار چشمے کا پانی شور مچاتا شوخ گیت گاتا چھوٹی سی ندی میں بہہ رہا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا پانی جسے پی کر فرحت اور تازگی کا احساس ملا۔

رحیم آباد کی زمین میر آف ہنزہ کی جائیداد ہے۔ سڑک کے ساتھ چند گھر تھے۔

میں جس گھر میں داخل ہوئی وہ گری خان اور مصری بانو کا تھا۔

کشادہ آنگن میں خوبانیوں اور سیب کے پیڑوں تلے بیٹھی مصری بانو بچے کو پنگھوڑے میں سلا رہی تھی ۔اخروٹ کی قیمتی لکڑی سے بنا ہوا یہ پنگھوڑا عجب ساخت کا تھا۔ باہر مرد کھیتوں میں گندم کے گٹھے اکٹھے کر رہے تھے ۔کواچی کی پہاڑیوں پر جمی برف نالوں کی صورت میں بہتی دکھائی دیتی تھی ۔دریائے ہنزہ کا پاٹ یہاں بہت چوڑا تھا۔وادی چھلت دریا کے پار تھی ۔عظیم الشان راکاپوشی پہاڑ کی خوبصورت اور پروقار بلند چوٹی کا منظر یہاں سے نظر آتا ہے۔

خضر آباد میں پہاڑ ایسے لگے جیسے شیش محل کی دیواریں ہوں ۔سکندر پل سے آگے دریا کے دائیں طرف نگر اور بائیں طرف ہنزہ ہے ۔سکندر آباد کے عین اوپر راکاپوشی دنیا کی آٹھویں بڑی چوٹی ۷۷۸۸ میٹر بلند برف سے ڈھکی مسکراتی تھی ۔سکندر آباد کی زمین کیا تھی؟ آرٹ بکھرا پڑا تھا۔گندم کی سنہری فصلیں ،سبزے کے قالین ،چھوٹے چھوٹے کھیت ،شاہ بلوط کے جھنڈ اور ان میں گھر چھوٹے چھوٹے مکان ۔

اردگرد کے نظاروں سے مخظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ میں ان دونوں بوڑھوں سے بھی باتیں کئے جاتی تھی جب دفعتاً ایک نے پوچھا۔

''عمر کتنی ہوگی آپ؟''

یہ سوال بڑا تیکھا اور چبھنے والا ہے کہ کوئی بھی خاتون خواہ وہ سچ گوئی کی کتنی بڑی دعویٰ دار کیوں نہ ہو اس سلسلے میں ضرور ڈنڈی مار جاتی ہے ۔چار پانچ سال کا ہیر پھیر تو میرے جیسی بھی سدا ہی کرتی ہے پر پتہ نہیں اس خالص لمحے میں سچ کا کوئی جن مجھے چمٹ گیا تھا۔جس نے ماہ چھوڑ دن کی بھی ہیرا پھیری نہیں کرنے دی۔میرے جواب دینے پر اسی بوڑھے نے بغور میرے چہرے کو دیکھا اور قطعیت سے کہا۔

''نہیں بھئی۔اتنی عمر نہیں ہے آپ کی''۔

مجھے عجب سی خوشی کا احساس ہوا۔شاید ہر عورت کے اندر کم عمر نظر آنے کا فطری رجحان ہوتا ہے۔اسی لئے میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں کتنی ہو سکتی ہے''؟

بھئی آپ پینتالیس سے کم تو ہرگز نہیں۔

میرے تن میں جیسے آگ لگ گئی۔جی چاہا گردن سے پکڑ کر سڑک پر پھینک دوں۔''کمبخت کہیں کا''۔یہ درست تھا کہ میں نے اپنا حلیہ بگاڑا ہوا تھا۔بال سفید ہو رہے تھے۔انہیں رنگا نہیں تھا۔موٹی سی چادر سے سر کو ڈھانپا ہوا تھا۔چہرے پر کوئی لیپا پوتی نہیں تھی۔پر اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں اپنی عمر سے نو سال بڑی نظر آؤں۔

مجھے شدید قسم کی چُبھن ہو رہی تھی۔سچ بھی بولا اور جھوٹی بھی بنی۔

پر میں بھی اول درجے کی کمینی ہوں۔اب اس کی عمر کا پوچھ بیٹھی۔جاننے پر اتنا ہنسی کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

''آپ سمجھتی ہیں میں پچاس سال کا نہیں''۔قدرے خفگی سے کہا گیا۔

''ارے بھئی آپ کہاں پھرتے ہیں؟ کسی طور بھی ستر بہتر سے کم نہیں''

میں نے بھی اپنے پھپھولے پھوڑ دیئے تھے۔

''آپ نے بہت غلط اندازہ لگایا ہے''۔وہ غصے سے بولا۔

''واہ غلط کیسے ہے؟ آپ کی گردن کی لکیریں ہاتھوں کی بیرونی سطح اور آنکھوں کے گرد پیدا شدہ لکیریں سب بول رہی ہیں۔آپ نے کیا مجھے احمق اور گاؤدی سمجھا ہے؟

''دیکھئے خاتون آپ زیادتی کر رہی ہیں''۔

بیچارا تلملا رہا تھا۔میں نے محظوظ ہوتے ہوئے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔وہ بھی ہماری اس نوک جھونک سے لطف اٹھا رہا تھا۔

جب تکرار بڑھی میں نے دونوں ہاتھ اس کی طرف جوڑ دیئے۔

''ارے بھائی کوئی بیاہ رچانا ہے ہم نے ۔چلو ستر کے نہیں پچاس کے سہی ۔اب تو خوش ہیں نا''۔

بعض مردوں کو بھی عورتوں کی طرح کم عمر بننے کا کتنا خبط ہوتا ہے۔ میں نے سوچا۔

دریا کے دائیں ہاتھ تنگ داس آباد ہے۔ یہ تھول کی وادی۔ ہم گلگت سے چھیالیس میل کے فاصلے پر ہیں۔ہندی پل دیکھئے انجینئر نگ کا بہترین شاہکار پل۔ یہاں سے نگر چھوٹ گیا اور ہم ہنزہ میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ ہندی کی خوبصورت وادی۔''ہاں ایک لوک کہانی اس وادی۔سے متعلق سنیں گی!''

میرا بوڑھا ہم سفر جس کے ساتھ ابھی ابھی میری خوشگوار سی جھڑپ ہوئی تھی۔ میری طرف متوجہ تھا۔''ارے کیوں نہیں'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ سب سننے کے لیے ہی تو پینڈا مار رہی ہوں۔

ایک بار روادی ہندی کے بارہ مہم جوؤں کی ایک پارٹی سونا نکالنے کے لئے کشش کے پار جزیرے میں پہنچی۔قسمت مہربان تھی۔خوب سونا نکل رہا تھا۔سارا سارا دن وہ ریت چھانتے سونے کی ڈلیاں اکٹھی کرتے اور خوش ہوتے۔اچانک ایک دن شدید طغیانی آئی اور سونے والوں کا راستہ پانی کی نذر ہو گیا۔انہیں کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ اب کیا کریں۔وہ اب فاقہ کشی کی نوبت تک پہنچ رہے تھے۔

پارٹی میں بھبوتن نامی ایک شخص نے رائے دی کہ دو دو آدمیوں میں کشتی کروائی جائے جو ہار جائے اسے غذا بنا لیا جائے۔گیارہ سونے والے جب اسی طرح ایک دوسرے کی خوراک بن گئے تو آخری آدمی بھبوتن تھا۔اس دوران جزیرے کا پانی اتر چکا تھا۔بھبوتن انسانی خوراک کی تلاش میں حسن آباد کے اس پہاڑ پر آیا جہاں سورتو گڈریا اپنے ریوڑ کے ساتھ رہتا تھا۔بھبوتن جب پہاڑی پر پہنچا۔اس نے دیکھا کہ باڑے کا دروازہ مضبوط اور

تنگ ہے۔ وہ باہر بیٹھ کر سورتو کا انتظار کرنے لگا۔ سورتو بھی خطرہ بھانپ گیا۔ اس نے چمڑے کے مشکیزے میں لسی بھری چھوٹا سا اس میں سوراخ کیا۔ اسے چھت سے لٹکایا۔ نیچے لکڑی کا تھال اور چمچ رکھا۔ جب قطرہ گرتا آواز پیدا ہوتی سورتو چلاتا شہ کھپن شہ (یعنی کھاؤ چمچ کھاؤ) چلانے کے ساتھ ساتھ وہ عقبی دیوار سے پتھر اکھیڑ کر باہر نکلنے کا راستہ بھی بناتا رہا اور جب پو پھٹ رہی تھی سورتو باہر نکل کر گاؤں کی طرف بھاگا۔ وہ خوشی سے چلاتا جارہا تھا۔ بھبوتن اس کے پیچھے لپکا۔ گاؤں کے لوگ بھی اسے دیکھ کر مارنے دوڑے بھبوتن ایک درخت کی کھوہ میں جا چھپا۔ لوگوں نے اسے آگ لگا دی۔ آج بھی جب ہندی میں طوفان آتے ہیں تو بھبوتن کی یاد دلاتے ہیں۔

ڈرائیور نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

''بس عام سی کہانی ہے۔ مائیں راتوں کو اپنے بچوں کو سناتی ہیں''۔

''یہ عام سی کہانیاں ہی ہماری ثقافتی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ میں نے ہواؤں میں خنکی کی لطیف لہروں اور ان میں رچی بسی شفتالو خوبانیوں اور سیبوں کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں گھسیڑتے ہوئے کہا تھا۔

ہندی میں خاصی آبادی ہے۔ اب فضا میں گندھک کی بو محسوس ہوئی۔ مرتضیٰ آباد، حسین آباد، علی آباد یہ ہنزہ کا میدانی علاقہ ہے۔ سڑک کے چکر اب کم ہو رہے تھے۔ زمرد اور یاقوت کی کانوں کا باہر سے نظارہ کیا۔

قیمتی پتھر نکالنے کا کام بند پڑا تھا۔

''کیوں؟''

میں نے جاننا چاہا تھا۔

''حکومت کی تحویل میں آنے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ شاید کوئی فنی مسائل ہوں''۔

ہم صدر بازار سے گزر رہے تھے جہاں ریستوران اور ہوٹل تھے۔ڈور کھن کے بعد گنش جا کر گاڑی رک گئی۔میں اتر کر یادگار دیکھنے لگی۔

اب کریم آباد جانے کا مسئلہ تھا جو راستے میں ہی حل ہو گیا۔ہوٹل اوپر کریم آباد میں بن رہا تھا۔سامان وہیں جانا تھا۔گنش سے کریم آباد تک سڑک زیرِ تعمیر تھی۔کو میں دھیلہ پولا خرچ کئے بغیر اوپر پہنچی پر کیسے؟ یقیناً خوف و دہشت کی دیوی کے حضور ایک سیر خون نذرانے کا ضرور چڑھا ہو گا۔ٹوٹی پھوٹی عمودی سڑک۔گاڑی دو قدم چلتی رکتی۔پھر چلتی، نیچے کھائیاں اپنے آپ میں سمیٹنے کے لئے مشتاق میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔راکاپوشی کے ان سینکڑوں جلوؤں کو اپنے تصور میں لاتے ہوئے جن کا میں دیدار کرتی آ رہی تھی میں نے ان نظاروں کے خالق سے کہا تھا۔

''میں یہاں ہرگز مرنا نہیں چاہتی۔مجھے کچھ ہوا تو خون تیری گردن پر ہوگا''۔

اور جب میرے قدموں نے گاڑی سے نکل کر زمین کے سینے پر اپنا آپ رکھا۔میری خوشی قابل دید تھی۔راکاپوشی ہوٹل کے مینجر کے نام ایک کارڈ میں گلگت سے لائی تھی۔میں نے بیگ سے اُسے نکالا اور ہوٹل ڈھونڈنے نکلی۔مینجر صاحب سے تو ملاقات نہ ہوئی البتہ اس کے اسٹنٹ نے کافی تسلی اور دلاسا دیا۔

ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو ہوٹل کے ملازم نے ایک کمرہ کھول دیا۔برآمدے میں ایک جوڑا بیٹھا تھا جن کی پشت میری طرف تھی اور جو سبز جالیوں سے نیچے بکھری خوبصورت وادی کے نظاروں میں گم تھا۔

میں نماز میں مصروف تھی جب اچانک دو آوازیں میرے کانوں میں پڑیں ایک بچی کی اور دوسری غالباً ماں کی۔بیٹی نے کچھ پوچھا تھا اور ماں نے جواباً کہا تھا۔

''کمال ہے تم نے پچھلے ماہ کے اردو ڈائجسٹ میں ناگا سا کی پر نہیں پڑھا تھا''۔

میں نے سلام پھیرا۔سکھ اور طمانت سے لبریز سانس بھرا۔چلو مسئلہ حل ہوا۔اردو ڈائجسٹ

کے قاری ہیں تو مجھے بھی جانتے ہوں گے''۔

میں نے جائے نماز لپیٹ کر اٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔

تعارف ہوا۔ یہ ایم اے قدوائی اور ان کی بیگم تھے۔ حیدر آباد سے سیر سپاٹے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ چائے چلی' کچھ باتیں ہوئیں اور پھر میں ان سے اجازت لے کر محاذ پر نکلی۔

ہنزہ زمانوں سے ایک خود مختار و نیم مختار شاہی ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب دو تحصیلوں پر مشتمل ضلع گلگت کا ایک سب ڈویژن ہے۔ اس کی شمالی سرحدیں عوامی جمہوریہ چین اور افغانستان سے ملتی ہیں۔ یہ روس سے بھی قریب ہے۔ پاکستان کی عظیم تاریخی شاہراہ قراقرم یا ریشم ہنزہ سے گزر کر سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر درہ خنجراب سے ہوتے ہوئے چین کے صوبے سنکیانگ سے جاملتی ہے۔

ہنزہ جغرافیائی اور لسانی لحاظ سے تین بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ مرکزی ہنزہ یہ مرتضی آباد سے لے کر احمد آباد تک کا علاقہ ہے۔ یہ گنجان آباد جگہ ہے۔ تقریباً تیس ہزار نفوس پر مشتمل لوگ بروشسکی بولتے ہیں۔

ہنزہ بالا۔ اسے گوجال کہتے ہیں۔ نظیم آباد سے لے کر مسگر و چپورسن تک کا علاقہ ہے۔ گیارہ بارہ ہزار کی آبادی زراعت پیشہ ہے اور بھیڑ بکریاں پالتی ہے۔ گوجال آگے دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ گوجال بالا اور گوجال پائیں۔ بالائی گوجال مسگر چپورسن تک کا علاقہ دیہ مختلف دروں کے ذریعے چین اور افغان پامیر سے ملا ہوا ہے۔ گوجال پائیں میں نظیم آباد سے لے کر پھسو تک کا علاقہ۔ یہاں زیادہ وخی لوگ آباد ہیں۔ ان کی زبان بھی وخی ہے۔

ہنزہ پائین' یہ خضر آباد سے ہندی تک کا علاقہ ہے۔ اکثریت شین اور زبان شنا۔ ہندی بہت قدیم گاؤں ہے۔ پرانی تہذیب و تمدن کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔

مختلف نسلوں کے میل جول اور رہن سہن سے ہنزہ کی موجودہ قوم ابھری ہے۔ ابتدائی قوموں میں ہن تو رانی' ایرانی' یونانی اور مغل نمایاں رہے ہیں۔ ہن کی ابتدائی آبادی کی وجہ سے ہنزہ نام پڑا۔ ہنزہ کے باشندے قدیم زمانے سے بڑے بہادر اور جنگجو رہے ہیں۔ سنکیانگ (چین کا صوبہ) اور واخان کے لوگ ان سے ہراساں رہتے تھے۔ سکھوں کو بھی کئی بار شکست ہوئی۔ ۱۸۴۸ء کی ایک لڑائی میں سکھ گورنر نتھو شاہ مارا گیا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں ڈوگروں کو بھی منہ کی کھانا پڑی۔ مگر ۱۸۹۲ء میں انگریزوں کی چالبازی اور ان کی حکمت عملی سے ہنزہ ان کے قبضے میں چلا گیا۔ جسے بعد میں اندورنی خودمختاری دے کر ریاست کی حیثیت بحال کر دی گئی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں اصلاحات کی وجہ سے اسے گلگت ڈسٹرکٹ میں ضم کر دیا گیا ہے۔

جناب جی ایم بیگ صاحب کی تحریر کردہ تاریخ ہنزہ میں سے بھی ابھی اتنا ہی پڑھ پائی تھی جب ایک اونچی پتھروں کی دیوار کے پاس شہتوت کے درخت تلے میں نے اسے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ چڑھتی جوانی' نیلے کانچ کے بٹنوں جیسی آنکھیں۔ گرد سے اٹے پڑے سنہری بال' میلی بدرنگ نیکر جس کے نچلے کنارے لیر لیر ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی قمیص میں سے جھانکتا ہوا اس کا بدن یوں چور آنکھوں سے دیکھتا تھا جیسے کوئی دیہاتی دولہا اپنے سہرے کی لڑیوں میں سے تاک جھانک کرتا ہو۔

اسے میں نے گنش کے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ میں چائے کا ایک کپ پی کر اٹھی تھی۔ ہنگر ہنگر (Hunger) کہتا ہوا جب وہ اندر داخل ہوا۔ اس وقت وہ مجھے اس دیو کی مانند نظر آتا تھا جو آدم بو آدم بو کہتا اپنے ٹھکانے میں قدم رکھتا ہے۔ چند مقامی لڑکے بالے اسے دیکھ کر ہنستے تھے۔ ایک نے کہا۔

''احمق۔ گلگت سے پیدل ہنزہ آیا ہے درختوں کے پھل کھاتا اور دریائے ہنزہ کا پانی پیتا۔ منگتا کہیں کا''۔

اس فقرے پر میں نے اُسے پھر دیکھا تھا۔نوخیز شاہ بلوط جیسا لمبا اور تر و تازہ۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی مگر مجھے باہر سے پکار پڑی تھی۔گاڑی مزید لدلدائی کے بعد کریم آباد جارہی تھی۔اس لئے اسکی طرف مزید توجہ کئے بغیر باہر نکل آئی تھی۔

پتھروں پر اب چپ چاپ بیٹھا وہ فضاؤں کو گھورتا تھا۔میں ڈھلانی راستے سے اوپر چڑھ کر اس کے پاس گئی۔اس کا رک سیک اس کے سامنے پڑا تھا۔میں اس کے پاس کھڑی تھی۔

جب دفعتاً ایک عجیب سے احساس نے میری ساری حسیات کو یوں جھنجوڑ کر رکھ دیا جیسے کسی گرجے کی بے وقت بجتی گھنٹیاں قریبی آبادی کو حیرت زدہ کردیں۔

ہزاروں میل دور بیٹھی اس کی ماں کیا جانتی ہے؟ کہ اس کا بیٹا اس وقت شدید بھوکا ہے۔اور سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹا فقیر بنا دوسرے ملکوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔تب میرا جی چاہا تھا کاش میں اسے نہلا سکتی۔صابن مل مل کر اس کا سارا گندا تار کر اس کی شہزادے جیسی صورت چمکا سکتی۔

میں نے اپنا رک سیک (تھیلا) اپنے کندھے سے اتارا۔اس میں سے کشمش ملے چنے نکالے۔اسے دیئے۔

وہ آسٹریلیا کے کسی چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔سیاحت اس کا جنون تھی۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد میں اٹھی اور دوبارہ نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔پل کراس کرنے کے بعد پکی سڑک پر آگئی۔یہاں ایک سونڈ بونڈ آدمی کو دونوں ہاتھوں میں تربوز اٹھائے جاتے دیکھ کر میں نے اسے روک لیا یہ کہتے ہوئے کہ میں ہنزہ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔اس کے ہونٹوں پر بڑی نرم اور شفیق سی مسکراہٹ ابھری تھی اور وہ بولا تھا۔

''بھئی ہوں تو میں ہنزائی پر ساری زندگی فوج اور میدانی علاقوں میں گزار کر چند

ماہ پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔میں اتنا کچھ آپ کو نہ بتا پاؤں گا کہ آپ کی تشفی ہو سکے"۔

پر اتنا کرم ضرور رہوا کہ اس نرم خو شخص نے مجھے ایک ایسے لڑکے کے سپرد کر دیا جو اس علاقے کے بارے میں بڑے مستند حوالوں سے بات کرتا تھا۔دبلے پتلے وجود کا مالک دیدار علی شیرازی ہندی (ناصر آباد) کے اسکول میں ٹیچر تھا اور ہنزہ سے متعلق ہر قسم کے اعداد و شمار اس کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

ہم دونوں میر آف ہنزہ کے نئے محل کو دیکھنے ہل ٹوپ ہوٹل کے پاس آ کر رک گئے۔میں نے اپنے نیچے دیکھا تھا۔گردوپیش پر نظریں دوڑائی تھیں۔میرے چاروں طرف قراقرم اور راکاپوشی کی چوٹیوں کے دلفریب مناظر تھے۔خوبصورت چبوتروں کی شکل میں کھیت اور شاہ بلوط کے سر سبز جھومتے درخت وادی کی ڈھلوانوں پر پھیلے آنکھوں کو روح پرور آسودگی بخش رہے تھے۔خوشگوار ہواؤں کے جھونکے چہروں سے ٹکراتے پھولوں اور پھلوں کی خوشبو سے دماغ معطر کئے جاتے تھے۔

ہر چی نالے اور حیدر آباد نالے کے درمیان کا علاقہ **بلتت** کہلاتا ہے۔**التت** میں وہ قلعہ نما محل ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ بالتی یُل (موجودہ بلتستان) کے بادشاہ می زوس عبدا خان نے اپنی بیٹی شاہ خاتون کی نسبت ہنزہ کے راجہ عیاشو دوم سے کر دی۔اس وقت معاشرتی لحاظ سے ہنزہ ریاست بہت کمزور تھی۔اس لئے بادشاہ می زوس عبدا خان نے اپنے معمار اور آدمی بھیج کر ہنزہ میں **التت** کے مقام پر ایک قلعہ نما محل بنوایا جس کے صدر دروازے پر بدھ مت کے پیروکاروں کا قدیم مقدس نشان کندہ ہے۔یہ محل تیار ہونے پر بادشاہ نے اپنی بیٹی کو بہت سارے ساز و سامان خادموں اور کنیزوں کے ساتھ ہنزہ روانہ کیا۔راجہ ہنزہ نے ان خادموں اور کنیزوں کو جس جگہ آباد کیا جو **بلتت** کے نام سے مشہور ہوئی۔

"**بلتت** کا موجودہ نام کریم آباد ہے۔دیدار علی اب کچے راستے پر چل رہا تھا۔

آگے بلتت کھن تھا۔میرے قدموں نے عجیب سی مقناطیسی کشش محسوس کی تھی۔رک کر میں نے پھر ادھر ادھر دیکھا تھا۔خوبصورت چہروں والے بچے،غیر ملکی ٹولیاں نیچے سے آئے ہوئے میدانی لوگ مقامی مرد اور کہیں کہیں گھومتی پھرتی کوئی بوڑھی عورت اپنے مقامی لباس میں سب نظروں کو بار بار نظر بازی کرنے پر اکسا رہے تھے۔

اس نظر بازی میں ایک معجزہ رونما ہوا۔میں نے دیکھا تھا۔میرے ابتدائی سفر کے ساتھی عروج اور اس کا خاوند زمان بڑی سڑک پر بھاگتے ہوئے میری طرف آرہے تھے۔

''یا میرے پروردگار کس زبان سے تیرا شکر یہ ادا کروں''۔

میں نے عروج کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ساتھ ہی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جانے کی وجہ دریافت کی۔عروج تنک کر بولی۔

''ارے ہم تو اسی دن یہاں بھاگ آئے تھے۔گلگت تو مار تنور بنا پڑا تھا۔میں چھ سوئیٹر ساتھ لائی تھی ان کی نمائش کیسے ہوتی''؟

وہ لوگ نیو جوبلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔رات ان کے پاس گزارنے کا وعدہ کر کے میں نے انہیں خدا حافظ کہا۔

اس وقت جب آسمان کا پچھمی حصہ شفق سے لال گلال بنا ہوا تھا۔جب پرندوں کی ڈاریں اپنے گھونسلوں کی طرف رواں دواں تھیں۔جب وادی کے گھروں سے دھواں اٹھ کر فضا میں بکھر رہا تھا۔

عین ان لمحوں میں میرے دماغ میں اٹھتا ایک اچھوتا خیال میرے پاؤں کی حرکات پر اثر انداز ہوا تھا۔میں رک گئی تھی۔توکل کی حقیقی روح اور اس کی ماہیت کو سمجھنے میں آگہی نے بہت سی دشوار منزلیں طے کر لی تھیں۔دل کی سرزمین پر میرے ماحول کے ہاتھوں لگائے گئے توکل کے پودے کی جڑیں کبھی گہری نہیں ہوئی تھیں۔وسوسوں،تفکرات اور الٹے سیدھے اندیشوں کی تیز ہوائیں اسے جڑ پکڑنے نہیں دیتی تھیں۔

پر وادی ہنزہ کی اس کشادہ سڑک پر جس کے ایک ہاتھ آغا خان اکیڈمی اور دوسرے ہاتھ بروشل محلّہ تھا اس کے تنے کی رگیں بہت نیچے اتر گئی تھیں۔ میں نے ہر معاملہ کلی طور پر اس کے سپرد کرتے ہوئے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا جیسے ہوا میں اڑتا ہوا ایک غبارہ یا پتنگ۔

☆☆☆

باب:12

پون صدی قبل کے ہنزہ کی ایک جھلک ۔
پرنس عبداللہ: جنگ آزادی کے جیالے ہیرو
قدیم محل: پولو کا میچ

سات آٹھ سیڑھیاں اترنے میں میں نے خاصی دیر لگائی تھی ۔ پوڈے کافی اونچے اور چھوٹے سے زینے کی ترتیب تقریباً سیدھی تھی ۔ گر پڑنے کا خطرہ تھا ۔ فوراً بعد ایک چھوٹا سا کمرہ دیکھنے میں آیا ۔ اس سے آگے بھی ویسا ہی ایک اور کمرہ تھا ۔ دونوں کمرے ایک طرح سردیوں میں برفانی ہواؤں کے سیلاب کو روکنے کے لئے حفاظتی بند کا کام دیتے تھے ۔ بڑے کمرے میں داخل ہونے سے قبل جوتے اتار دیئے گئے ۔

یہاں خوبصورت چہروں والے مردو زن اور بچے لالٹین کی روشنی میں مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے ۔

یہ دیدار علی کے دوست کا گھر تھا ۔ ہنزہ میں بجلی ضرور ہے پر اس کی حالت اس تنک مزاج غصیلی بہو جیسی ہے جس کا جب اور جس وقت جی چاہے منہ اٹھا کر گھر سے نکل جاتی ہے اور پھر کہیں گھر والے کے سوتر لے منتوں سے واپس آتی ہے ۔

نمکین چائے کے پیالوں سے اٹھتی بھاپ اور ذائقہ دار چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مجھے مشہور کوہ پیما اور سیاح ڈونلڈ کنگ یاد آیا تھا جس نے کہا تھا ہنزہ آنا گویا ایک قدیم دیرامن دپراسرار اور انتہائی خوبصورت دنیا میں داخل ہونا ہے ۔

اس وقت میں اسی دنیا کا ایک حصہ بنی بیٹھی تھی ۔

لپا پتا صاف ستھرہ سلیقے اور قرینے جیسی خوبیوں سے سجا سنورا کمرہ جس کی دیواروں پر ہز ہائی نس پرنس کریم آغا خان اور شہزادی سلیمہ مسکراتے تھے۔

میں نے معمر مرد کی طرف دیکھا تھا۔میری نگاہوں میں پھیلتے سوال کو اس نے میرے ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی چھین لیا تھا۔

آج کا ہنزہ نصف صدی قبل کے ہنزہ سے بہت مختلف ہے۔پرانی میرے جیسے لوگوں کی نسل ان دشواریوں مسائل اور تکلیف کی چشیدہ ہے۔نئی نسل بہت کچھ پانے کے باوجود مضطرب ہے۔

انگریز جب ہندوستان میں آئے تو انہوں نے ہنزہ اور نگر پر بھی قبضہ کرنا چاہا۔نگر اور ہنزہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے۔مگر اس دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے متحدہ محاذ بنایا۔کئی بار مقابلے ہوئے۔انگریزوں کو منہ کی کھانا پڑی۔مگر ان کی حکمت عملی اور جدید سامان ان کی بالادستی کا موجب بنا۔کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھ کر انتظام مقامی میر کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ زمانے دکھوں کے تھے۔آمد ورفت اتنے دشوار گزار تھے کہ سفر کا تصور محال تھا۔گلگت جانے کے لئے چھلت کی چوکی پر باقاعدہ راہداری کا پروانہ حاصل کرنا پڑتا۔مذہبی تعصب اتنا تھا کہ ہنزہ کے لوگوں کو شہر میں رات گزارنے کی اجازت تک نہ تھی۔سردیوں کی یخ بستہ راتیں بھی شہر سے باہر غاروں میں گزارتے۔آوارہ کتے آتے اور ان کے کپڑے جوتے تک اٹھا کر لے جاتے۔

غربت' پریشانیوں' فکر وغم اور تفکرات نے کئی دلچسپ روایتوں اور کہانیوں کو جنم دیا۔تقسیم سے پہلے ہنزہ کے ایک شخص قدیر نامی کو کسی جرم کے سلسلے میں سزا ہوئی۔اسے گلگت لا کر قید کر دیا گیا۔جیلوں میں قیدیوں کو جو سرکاری راتب دیا جاتا تھا اس کا معیار نہایت پست تھا پر قدیر کو تو اس بات پر حیرت تھی کہ یہ کیسی قید ہے؟ کہ دونوں وقت کھانا ملتا ہے۔اپنی

دانست میں وہ عیش کر رہا تھا۔ اب اسے بیوی بچوں کا خیال پریشان کرنے لگا۔ ان کی بھوک کا خیال اسے ستانے لگا۔ اس نے سوچا کہ انہیں بھی قید کرا دو۔ بھوک سے تو نجات مل جائے گی۔ چنانچہ اس نے متعلقہ حکام سے گڑگڑا کر درخواست کی کہ اس کی بیوی بچے بھی جیل بھیج دیئے جائیں۔ حکام بڑے حیران ہوئے کہ ماجرا کیا ہے؟ بہر حال تحقیقات پر عقدہ کھلا کہ قدیر صاحب جیل نہیں کاٹ رہے ہیں بلکہ داد عیش دے رہے ہیں۔

زمین اور پانی کی قلت کو ابھی بھی ہے لیکن ایک وقت ایسا تھا جب پیٹ کے ہاتھوں مجبور انسانوں نے موت کو بھی وقت کا پابند بنا دیا تھا۔ جان توڑ محنت کرنا پڑتی تھی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد لوگ بستروں پر گرتے تو صبح کی خبر لیتے۔ مختلف امور کے لئے انہوں نے مختلف مہینے مقرر کئے ہوئے تھے۔

سورج جب سنبلہ برج میں چلا جاتا تو موت کا مہینہ آجاتا۔ یہ عموماً ستمبر کے آخر میں شروع ہوتا۔ لوگ فصل باڑی سے فارغ ہو کر موت کی تیاریاں شروع کر دیتے۔ قبرستانوں میں قبریں کھودی جاتیں۔ بیمار اور بوڑھوں کی خوب خاطر تواضع کی جاتی۔

یہ حقیقت تھی کہ اس ماہ کے علاوہ کسی کے مرنے کا واقعہ شاذ ہی رونما ہوتا۔ بد عاؤں میں ایک بد دعا یہ بھی تھی کہ تجھے سنبلہ برج نصیب نہ ہو۔ یعنی تو ایسی موت مرے کہ لوگ مصروفیت کی وجہ سے تیری تجہیز و تکفین نہ کر سکیں۔

پیداوار کی شدید قلت تھی۔ نمک کھا کر حلال کرنے کا محاورہ دراصل ہنزہ کے اس دور کی تخلیق ہے جب یہ شاذ ہی استعمال ہوتا تھا۔ مٹی کو چھان پھٹک کر حاصل کیا جاتا۔ روزمرہ کی اشیائے خوردنی میں اس کے استعمال کا تصور بھی نہ تھا۔ کسی جان بلب مریض کے لئے طبیب نمک تجویز کرتا تو اس کی تلاش شروع ہوتی جس کے پاس ہوتا وہ ڈلی کو پانی کے گلاس میں دو تین بار ڈبوتا۔ یہ اس کا ناقابل فراموش احسان شمار کیا جاتا تھا۔

اور عین اس وقت ایک نوجوان نے اس معمر مرد کی گفتگو کو کاٹ دیا۔ اس کی آواز

میں جوشیلی جھنکار تھی۔

فطرت اور ماحول کے ان دکھوں اور چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ کچھ عذاب انسانوں کی صورت میں بھی غریبوں پر نازل تھے۔ میروں (راجے) کی خدمت میں نذرانے، ان کے کھیتوں پر بلا معاوضہ کام' نیا اور پرانا محل جنہیں یقیناً آپ نے دیکھا ہوگا ان کی تعمیر ہمارے ہی باپ داداؤں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ ان کی ایک ایک اینٹ میں ان کا وہ پسینہ جذب ہے جس کی مزدوری ادا نہیں ہوئی۔

اور اب کمرے میں مباحثے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ نوجوان لڑکے اعتراضات کے تیروں سے لیس تھے۔ جبکہ بوڑھے نہ صرف مدافعت کرتے تھے بلکہ میروں اور راجاؤں کے لئے ان کی گفتگو میں احترام کے جذبات بھی تھے۔ میر جمال (موجودہ میر آف ہنزہ کے والد) کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہ لوگوں کے معاشی' سماجی اور خانگی جھگڑوں کو بہت مدبرانہ اور احسن انداز میں نمٹاتے تھے۔ میر غضنفر بھی علاقے کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کی اہلیہ عتیقہ غضنفر سماجی مسائل میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔

''جی ہاں''

ایک خوش شکل لڑکا مسکرایا۔ غریب کا بچہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اگر اس کی ذہانت اور تقدیر نے اسکا ساتھ دیا اور وہ کسی طرح باہر نکل گیا تو جب تک اسے واپس نہیں لایا جاتا تھا۔ میر بیچارے کا کھانا' ہضم نہیں ہوتا تھا۔

ہاں آپ نے وہ مشہور زمانہ کہانی تو سنی ہوگی۔ ''پرنس عبداللہ کی''۔ اس وجیہہ صورت لڑکے نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''ارے کہاں۔ سناؤنا''۔ میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

وہ میری طرف ہلکا سا جھکا۔ مسکرایا اور بولا۔

''غور سے سنیئے گا''۔

یہ پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔میر آف ہنزہ کے ایک منشی کا چرواہا یہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بہت بڑا آدمی بنے۔وہ کچھ عالمانہ ذہن کا مالک تھا۔اپنے بیٹے کو اس نے تعلیم دینی اور دلوانی شروع کی۔اس وقت ہنزہ میں صرف ایک ہی پرائمری سکول تھا۔ وہاں سے پڑھنے کے بعد باپ نے اسے گلگت بھیج دیا۔میر کو اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے بہت برا منایا۔چرواہے کو بلا کر کہا۔

''تم سمجھتے ہو کہ وہ چار جماعتیں پڑھ کر ڈپٹی کلکٹر بن جائے گا یہ تمہاری بھول ہے۔وہ گڈریا کا بیٹا ہے اسے گڈریا ہی رہنے دو۔دو لفظ پڑھ کر دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا والی بات ہو جائے گی''۔

پر اس ڈانٹ کا چرواہے پر الٹا اثر ہوا۔اس نے بیٹے کو کہلا بھیجا کہ بڑے لوگ تمہاری پڑھائی کے دشمن ہیں۔مرد کا بچہ بننا۔ہنزہ مت آنا۔یہاں سے آگے نکل جانا۔

لڑکا مڈل پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے سری نگر چلا گیا۔اب اس پر خود پڑھائی کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔وہ فارغ وقت میں ٹیوشنز کرتا اور یوں اخراجات پورے کرتا۔

''انہیں وہ رضائی والی بات بھی سناؤ''

خوش شکل لڑکے کے ایک ساتھی نے اسے ٹہوکا دیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔جوانی کی بے ساختہ اور من موہنی ہنسی۔

ضرور ضرور۔

پرنس عبداللہ ایک ذہین اور فطین طالب علم تھا۔اس نے بہت جلد اساتذہ کی نظروں میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔اپنے اخراجات پورا کرنے کے لئے وہ ٹیوشنز کرتا۔ ضروریات پوری کرنے کے بعد کچھ پیسے بچا بھی لیتا۔دو سال بچت سے اس نے رضائی بنائی۔جب پہلی بار اس رضائی کو اوڑھ کر لیٹا تو لطف اندوز کی ایک ایسی کیفیت سے سرشار

ہوا جس کا اس سے قبل اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل تین دن رضائی میں لیٹا سرشاری کی پھوار میں بھیگتا رہا۔

اب ظاہر ہے کہ ایک ذہین اور لائق طالب علم کلاسوں سے غائب ہو تو اساتذہ کی پریشانی اور تشویش حق بجانب تھی۔ اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ سکول حاضری میں بھی اپنا ایک ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ جب تحقیق ہوئی تو بھید کھلا کہ موصوف رضائی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

بہر حال یہ تو اضافی باتیں ہیں جو ہم نے آپ کو سنا دی ہیں۔ اسی من موہنے سے لڑکے نے مجھے کہا اور سلسلہ گفتگو پھر شروع ہو گیا۔

ہنزہ جیسی پس ماندہ جگہ کا رہنے والا سری نگر کی عمارتوں، سڑکوں، پارکوں اور رنگ برنگے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ ہوتا۔ ایک دن ایسے ہی جب وہ منہ اٹھائے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مہاراجہ ہری سنگھ کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ پرنس عبداللہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ بند ڈبہ کیا عجوبہ ہے جو سڑک پر پھسلتا جا رہا ہے۔ ہری سنگھ کو گاڑی رکوانی پڑی۔ اسکی آنکھوں سے مترشح حیرت کو اس نے دلچسپی سے دیکھا۔ نیچے اترا۔ اب اس پر ہری سنگھ کے پرشکوہ لباس کو دیکھ کر حیرانگی کا ایک اور دورہ پڑا۔

''کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو اور یوں ٹکر ٹکر میری صورت کیا دیکھتے ہو؟''

اس نے گھگھیا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

یہ جاننے پر کہ وہ غریب لڑکا غربت کا مقابلہ کرتے ہوئے اتنی دور صرف تعلیم حاصل کرنے آیا ہے۔ اس نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

اب جونہی اس واقعے کی اطلاع میر آف ہنزہ کو ہوئی۔ اس نے فوراً چپڑاسی کو بلوایا۔ اسکے کان کھینچے اور حکماً کہا کہ لڑکے کو واپس بلاؤ۔ ہم خود اس کے تعلیمی اخراجات کا بار

اٹھائیں گے۔مرتا کیا نہ کرتا۔باپ نے بیٹے کو ہنزہ بلالیا۔مگر بعد میں میر آف ہنزہ نے نہ صرف پیسے دینے سے انکار کردیا' بلکہ دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ کی تو انجام اچھا نہ ہوگا۔لڑکا موقع پا کر پھر بھاگ نکلا۔بمبئی پہنچا۔آغا خان سے ملا۔انہوں نے اس کا تعلیمی شوق دیکھتے ہوئے اسے انگلینڈ بھجوا دیا۔جہاں اس نے بار ایٹ لاء کیا اور اپنے آپ کو پرنس کہلوایا۔

تین ہزار آٹھ سو چالیس مربع میل کے پھیلاؤ میں گھری ہوئی ہنزہ وادی تقریباً پینتالس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ننانوے فیصد اسماعیلی' ایک فیصد شیعہ اور چند گھرانے سنی لوگوں کے ہیں۔معاشی لحاظ سے یہ وادی خاصی عروج پر ہے۔آغا خان کے بہت سے ترقیاتی منصوبے یہاں زیر تکمیل ہیں۔آغا خان دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت بہت کام ہو رہا ہے۔ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لئے مختلف سطحوں پر کونسلیں قائم ہیں۔یہ کونسلیں ایسے افراد پر مشتمل ہیں جو معاشی اور مذہبی دونوں طرح مضبوط ہیں۔ان کونسلوں کے سربراہوں کے احکامات مذہبی سپرٹ سے تسلیم کئے جاتے ہیں۔

موجودہ میر غضنفر علی ترقیاتی کاموں میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ہنزہ کے پہاڑی سلسلے قیمتی معدنیات اور جواہرات سے مالا مال ہیں۔معدنیات کی تلاش کے لئے ہنزہ مائننگ کارپوریشن بنائی گئی ہے۔جس میں ۲۵ فیصد حصص ہز ہائی نس کریم آغا خان ۲۵ فیصد میر صاحب اور باقی حکومت کے ہیں۔

چائے کا دوسرا دور چلا۔میں نے گھڑی دیکھی اور اجازت چاہی۔لڑکوں کی پوری ٹولی مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئی۔رات اتنی تاریک اور ستارے اتنے روشن تھے کہ دو متضاد کیفیات کا احساس ہوتا تھا۔

انہیں خدا حافظ کہہ کر میں اندر آئی۔بیچاری عروج میرے انتظار میں بھوکی بیٹھی تھی۔کھانا کھایا۔گنش کی کسی عورت نے اُسے لفافہ بھر گلاس (چیری) دیئے تھے۔ہم تینوں

نے کھائے۔

دفعتاً شور شرابے کا ایک ریلا بہتا ہوا آیا۔ کھٹے میٹھے گلاسوں کو چھوڑ کر میں نے چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر آ گئی۔ دس بارہ غیر ملکیوں کا ٹولہ جن میں وہ دوپہر والا تہنگ ملنگ لڑکا بھی شامل تھا، برآمدے میں کھڑا قہقہے لگاتا اور شور مچاتا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ درّہ خنجراب جا رہے تھے۔ مسگر سے آگے گلیشیر کا ایک تودہ سڑک پر آ جانے سے راستہ بلاک ہو گیا۔ پاکستان آرمی کے جوان اسے ہٹانے میں مصروف تھے۔ دو دن بعد راستہ کھلنے پر ان کا دوبارہ جانے کا پروگرام تھا۔

''آپ بھی چلیں''۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

میرا دل اس وقت ان دو لکھی کبوتروں کی طرح بن جانے کو چاہا جو اس ٹولے میں موجود تھیں اور اطمینان سے برآمدے میں پڑے رک سیکوں پر بیٹھی چنگموں کی جگالی کر رہی تھیں۔

ایسے من چلے کھلنڈروں اور جنونی لوگوں کے ساتھ سفر کرنا بھی کیسا دلچسپ اور حسین تجربہ ہوگا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

پر میں دل مسوس کر رہ گئی۔ اتنے دن نہیں تھے میرے پاس۔ پل پل قیمتی تھا۔ رات یوں کٹی کہ میں اور عروج سرہانے اور پائنتی کے چکروں میں ہی چکر کھاتی رہیں۔ صبح نماز کے لئے اٹھی باہر نکلی۔ کمپاؤنڈ میں لگے نل سے وضو کرنا چاہا۔ ابھی پانی کا چلو میری ناک تک ہی پہنچا تھا کہ میرے سارے سر نے یوں جھٹکا کھایا جیسے ناگہانی زلزلے کے اثر سے کوئی اچھی بھلی عمارت ڈولنے لگتی ہے۔

میں دہل کر اندر بھاگی تھی۔ میرا سانس لوہار کی دھونکنی کی مانند چلتا تھا۔ عروج اور اس کا میاں زمان دونوں خوابِ سحری کے مزے لوٹ رہے تھے اور میں عین کمرے کے وسط

میں کھڑی اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش میں تھی۔

واقعہ یہ تھا کہ چلو بھر پانی میں ناک ڈوبنے سے پہلے ہی اچانک میری نظریں سامنے کے کمروں کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ جالی کے دروازے کے ساتھ مادرزاد برہنہ ایک پٹی کھڑا سگریٹ کے مرغولے اڑا رہا تھا۔

میں نے غسل خانے کا نل کھولا۔ شُوں شُوں نے میری پذیرائی کی۔ سرخ پلاسٹک کی سیاہ ہینڈ والی بالٹی اندر سے یوں خالی تھی جیسے لنڈے بازار کے پینٹ کوٹ سے سجے کسی قلاش نوجوان کی جیب۔

میں دروازے سے باہر ہیبت پہاڑوں کو دیکھتی تھی۔ ان کی چوٹیوں پر جمی برف کے سلسلے خدائے واحد کی تجلیوں کے نمائندہ تھے۔ میں ہنزہ کی سرزمین پر اس سہانی صبح اس کے حضور ہر صورت سجدہ ریز ہونا چاہتی تھی۔ میں نے ہمت کی اور دروازے سے باہر جھانکا۔ صد شکر کہ وہ منحوس غائب تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر میں نے مسٹر و مسز قدوائی کے پاس جانے کا سوچا۔ بھلا کیا سوچتے ہوں گے کہ پلٹ کر انہیں اطلاع تک نہ دی۔

صنوبر کے درختوں سے ٹکراتی خوشگوار ٹھنڈی ہوا پہاڑی جھرنوں کا مستقل راگ پرندوں کی چہکار اور الوہی سکون میں لپٹی وادی۔ میں فطرت کے اس حسین منظر سے لطف اٹھاتی ڈھلانی راستے پر اترتی گئی۔ راکاپوشی ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں وہ لوگ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

''آپ نے حد کر دی۔ بہت پریشان تھے ہم لوگ۔ یہ نوکر البتہ ہمیں کہتا تھا چھوڑو جی''۔

میری اور نوکر کی نظریں چار ہوئیں۔ چائے کی ٹرے اس کے ہاتھوں میں تھی اور وہ چیڑ کے درخت کی طرح تنا کھڑا میری طرف دیکھتا تھا۔ کمبخت کی چمکتی آنکھوں نے کھلم کھلا

جیسے کہا تھا۔

''عورت کا ایک نام ٹیکسی بھی ہے''۔

میرے اندر بھانبڑ تو ضرور مچا۔ پر گنے کی کھوری کے اس بھانبڑ کو میں نے فوراً مصلحت کوشی کے پانی سے بجھا دیا۔

میاں بیوی کی طرف سے دی گئی دعوت کو قبول کرتے ہوئے چائے پی اور کھڑی ہوگئی۔ پر باہر نکلنے سے پہلے آگے بڑھی عین اس جگہ جہاں وہ کھڑا تھا اور برتنوں کو سمیٹنے میں مصروف تھا۔

ہم دونوں نے ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''انسانوں کو پہچاننا سیکھو۔ ہر عورت ٹیکسی نہیں ہوتی۔ میں ایک اچھی ماں ہوں۔ یاد رکھنا ایک اچھی ماں ہمیشہ کردار کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھی ہوتی ہے''۔

میں نے پلٹ کر اس کا ردعمل دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

باہر سورج کی طلائی کرنوں نے وادی کی چوٹیوں کو سنہری جامے پہنانا شروع کر دیئے تھے۔

رنگین دھاگوں کی کڑھائی سے سجی ٹوپیاں اوڑھے بہت سی عورتیں جماعت خانے سے آتی دکھائی دی تھیں۔ میں علی مدد کے گھر جانا چاہتی تھی۔ 1965ء کی جنگ کے ایک جیالے ہیرو کے گھر جس نے کیل کے جنگلوں میں اس اہم چوکی کو بچانے میں دشمن کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ جس پر قبضہ ہماری دفاعی صلاحیتوں کو شدید متاثر کرتا۔

''کیا اتنے سویرے سویرے کسی کے گھر جانا مناسب رہے گا''۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

میں اوپر چڑھتے ہوئے کومگو کی حالت میں تھی۔ سرخ وسفید رخساروں والے بچے رک رک کر میری صورت دیکھتے تھے کیونکہ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد میرا پھولا ہوا سانس

مجھے رکنے اور چند لمحے ستانے پر مجبور کرتا تھا۔ جماعت خانہ کے پاس کہیں گھر تھا۔ کسی سے پوچھا تو اس نے کہا۔

''وہ تو فوت ہو گئے ہیں۔ ہاں البتہ ان کا بڑا بیٹا سلطان مدد یہیں ہنزہ میں ہی ہے''۔

پہلے سوچا یہیں سے لوٹ جاؤں۔ پھر خیال آیا اب آ گئی ہوں تو مل لیتی ہوں۔ باپ نے شجاعت اور دلیری کی جو داستان رقم کی بیٹا اس سے واقف تو ہو گا۔ اسی سے سن لوں گی۔ گھر اور جماعت خانہ کے درمیان پانی کا کنواں ہے۔ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ مین گیٹ خاصی بلندی پر تھا۔ کئی سڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ الٹے ہاتھ پرانے گھر کا بڑا دروازہ تھا۔

نئے گھر کے جدید انداز میں سجے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں سے میں نے جھانک کر نیچے دیکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قدموں کے نیچے ایک ایسا سبز غالیچہ بچھا ہوا ہے۔ جس پر مختلف النوع رنگوں کی انسانوں، مکانوں اور جانوروں کی شبیہیں بنی ہوئی ہیں۔ جاذب نظر شبیہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر نہ آنکھوں کی پیاس بجھے اور نہ روح کی۔

پھر باتوں کے وہ دروازے کھلے جن کے اندر حب الوطنی کے چراغوں کی روشنی سے منور تھے۔ اچانک انہوں نے کہا۔

''آپ شاہ خان سے ملیں گی۔ جنگ آزادی میں گروپ کیپٹن شاہ خان کی خدمت ناقابل فراموش ہیں''۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس احسان کے لئے میں آپ کی شکر گزار رہوں گی''۔

شاہ خان اپنی جوانی میں بہت خوب رو جوان رہے ہوں گے۔ ان کی چھاتی بے شمار تمغات سے سجی تھی۔ جہاد کشمیر میں ستارہ جرات سے نوازے گئے۔ ستارہ امتیاز، تمغہ بسالت اور دیگر چھوٹے بڑے تمغات ان کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

رسیلی ذائقہ دار خوبانیوں' خوش رنگ میٹھے شفتالوؤں اور سفید توتوں سے کہیں زیادہ ان کی باتیں رس بھری تھیں۔ جنگ آزادی کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش کا اظہار ایسا ہی تھا جیسے غزل چھیڑ کر ساز ان کے ہاتھوں میں تھما دیا جائے۔ وہ عمر رفتہ کو آواز دے رہے تھے۔

نظریہ پاکستان کی کشش کے پیش نظر جہاں عام لوگ انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ وہاں راجے اور میر دلی طور پر ڈوگرہ حکومت کے وفادار تھے۔ انہیں تاریخ کا ایک عظیم کردار بننے کی بجائے ان مراعات اور فوائد کا احساس تھا جو ڈوگرہ حکومت کی طرف سے انہیں حاصل تھے۔ ان حالات میں یہ انقلاب اگر ناکام ہو جاتا تو ہمارے جیسے ہزاروں سرفروشوں کا انجام کس قدر عبرت ناک ہوتا۔

ہنزہ کے گاؤں گر-متھ میں پیدا ہونے والے گمنام مرتضیٰ اُن کی یادوں اور تاریخ کے صفحات سے نکل کر باہر آ گئے۔ انقلاب کے پہلے مرحلے میں ان کا نمایاں کردار ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں بحیثیت کمانڈر کمانڈوان کا سری نگر تک پہنچ جانا اور ستارہ جرات پانا تھا۔

میرا خون اس وقت اس قہوے کی طرح گرم تھا جو بھاپ اڑاتا میرے سامنے پڑا تھا۔

ہنزہ کے وزیر خاندان سے تعلق رکھنے والے صفی اللہ بیگ اور فدا علی کی باتیں نومبر کی وہ یخ بستہ راتیں جب صفی اللہ بیگ بھوپ سنگھ پڑی پر بونجی کی طرف سے دشمن کے خطرے کے باعث متعین تھے۔ زوجیلہ اور کارگل میں انہوں نے دشمن سے جو فیصلہ کن جنگ لڑی۔ فدا علی کا دوران انقلاب گلگت خاص میں بطور کوارٹر ماسٹر فرائض کی انجام دہی میں سنسنی خیز واقعات سے نپٹنا۔

یہ اعزاز بھی ہنزہ نے ہی حاصل کیا کہ جنگ آزادی کا پہلا شہید امیر حیات اسی سرزمین کا فرزند تھا اور پھر ان رقابتوں، ریشہ دوانیوں اور گھپلوں کا ذکر بھی ہوا جن کے تحت

چند جونیئر افسروں کی علاقائی اور خاندانی بنیادوں پر ترقیاں ہوئیں اور وہ سینئر صوبیدار جو میدان جنگ میں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے تھے نظر انداز ہوئے۔ صفی اللہ بیگ اور شیر علی پینشن جیسی مراعات سے بھی محروم رہے۔

میں جس دنیا میں سانس لے رہی تھی وہ وقت کی قید سے آزاد تھی۔ آخری حصہ اُس سولوں کی طرح تھا جو اچھی بھلی پگڈنڈی پر درخت سے گر کر بکھر جاتی ہیں اور پاؤں میں چبھ کر مسافر کو تکلیف دہ احساس بخشتی ہیں۔

میں بھی دکھ کی چبھن سے تڑپ کر وقت کی قید میں واپس آئی تھی۔ ایک بج رہا تھا۔ میرے سر کے عین اوپر پرانا محل شکستہ دل ضرور نظر آتا تھا پر تناؤ اور اکڑ اس محاورے کی یاد دلاتا تھا کہ مرتی مر جائے گی پر اکڑ نہیں جائے گی۔ اتنا قریب آ کر اسے دیکھے بغیر لوٹ جانا مناسب نہ تھا۔

پاؤں چڑھائی کی طرف مائل تھے۔ قریب پہنچنے پر دائیں ہاتھ ایک خوشنما بنگلہ نظر آیا گیٹ کے پاس ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکی کھڑی تھی۔ بھولی بھالی معصوم سی یہ وزیر ساجد علی کا گھر اور لڑکی ان کی بیٹی راحیل تھی۔ راحیل جنگلوں بیابانوں میں اگنے والی خوبصورت کھمبی کی مانند تھی۔ بصد اصرار اپنے گھر لے گئی۔ ایک نشست وزیر ساجد کے ساتھ جمی۔ راجگی نظام کی زوال پذیری اور پرانی قدروں کے ختم ہونے پر وہ شاکی سے تھے۔

''ایسا تو ہوتا ہے۔ معاشی انقلاب جب کسی معاشرے میں جگہ بنائیں تو پہلی زد اقدار پر پڑتی ہے۔ یہ فطری امر ہے۔ اس سے فرار نہیں۔''

راحیل میرے ساتھ ہی پرانا محل دیکھنے چل پڑی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو ایک نوعمر لڑکے نے آگے بڑھنے سے یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ ٹکٹ لیں۔

میں نے پیسے بچانے کی بہتری کوشش کی۔ پر بٹوے کا منہ اس لمحے ایک جھٹکے سے آناً فاناً کھل گیا جب لڑکے نے کہا تھا۔

یہ محل ہنزہ کا ہی نہیں پورے ملک کا اہم تاریخی اثاثہ ہے۔کیا آپ نہیں چاہیں گی کہ اسے زمانے کے ہاتھوں دست برد ہونے سے بچایا جائے۔

''اگر یہ بات ہے تو جتنی بار کہو گے ٹکٹ خریدوں گی''۔

میں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

محل قدیم طرزِ تعمیر کا ایک خوبصورت شاہکار ہے۔اس کو دیکھنے کے لئے مغرب کی بڑی اہم شخصیتوں نے اپنے اپنے وقتوں میں ہنزہ کا دورہ کیا۔لارڈ کرزن' روزویلٹ' تھیوڈورا اور سر سٹیفن کے نام نمایاں ہیں۔سیڑھیاں عمودی اور شکستہ تھیں۔آخری پوڈے پر کھڑے ہو کر وادی کا منظر بہت دلفریب نظر آتا ہے۔

کمرے اتنے بڑے بڑے ہیں کہ اچھی خاصی تگڑی بارات ایک کمرے میں کھلی ڈھلی بیٹھ سکتی ہے۔جس کمرے میں صوفے اور دوسرا آرائشی سامان سجا ہوا تھا وہ غالباً راجہ فیملی کی نشست گاہ تھی۔آرٹ گیلری' مختلف النوع ہتھیار' ملبوسات سب ایک عہد کی تاریخ بتاتے اور سناتے تھے۔کبھی یہ کمرے کتنے آباد ہوں گے' کتنی چہل پہل ہو گی یہاں۔میں نے گیلری میں کھڑے کھڑے سوچا آج یہاں ویرانیاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔محل کے عقب میں ایک تالاب ہے۔اونچائی سے دیکھنے پر یہ اتنا خوبصورت نظر آیا تھا کہ میرا جی بے اختیار اس میں چھلانگ مارنے کو چاہا۔راحیل چپ چاپ میرے ساتھ ساتھ چلتی جا رہی تھی۔میں نے جب تالاب میں چھلانگ مارنے کی خواہش کا ذکر کیا وہ ہنس پڑی۔بڑی من موہنی سی ہنسی تھی اس کی۔

''اللہ کیسی فرماں بردار مودب اور معصوم سی لڑکی ہے یہ راحیل''۔باجی باجی کہتے اس کی زبان خشک ہوئی جاتی تھی۔میرے تو لڑکے ابھی بالشت بھر کے ہیں۔کوئی گبھرو جوان ہوتا تو اٹھا کر لے جاتی اسے۔

نیچے اترنے سے پہلے میں نے اسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں سمیٹا تھا۔اس کی

پیشانی پر پیار کیا تھا۔ اور کہا تھا

''جتنی اچھی ہو خدا کرے تمہار بخت اس سے بھی اچھا ہو۔''

سڑک پر آ کر دیکھا تو لوگوں کو عجیب افراتفری میں بھاگتے ہوئے پایا۔ ایک راہگیر سے پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ''پولو کا میچ ہو رہا ہے''۔

''ارے کدھر'' میں چلائی۔

''پولو گراؤنڈ میں''۔

اب میرے بھاگنے کی باری تھی۔ پولو شمالی علاقہ جات کا قومی کھیل ہے۔ ہر وادی میں اس کھیل کے لئے ایک قطعہ زمین مخصوص کیا جاتا ہے۔

پولو بلتی زبان کا لفظ ہے۔ اس کھیل کی ابتدا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ یہ کھیل مختلف قوموں اور ملکوں میں کھیلا گیا ہے۔ ایران اور ترک جنگ سے فراغت کے دنوں میں پولو بھی کھیلتے تھے۔ گلگت میں طرا خان کا زمانہ خصوصیت کے ساتھ پولو کا دور شمار ہوتا ہے۔

طرا خان اول کے بارے میں ایک دلچسپ اور عجیب وغریب روایت ہے کہ وہ جب داریل تانگیر کے دورے پر گیا تو وہاں پولو کی شرائط بڑی سنسنی خیز تھیں۔ فرا خان کے سات سالے تھے۔ انہوں نے چیلنج دیا کہ جو کھیل ہارے گا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ چنانچہ مقابلہ ہوا اور مسلسل دو دن جاری رہا۔ طرا خان کامیاب ہوا۔ اس نے ساتوں سالوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خدا جانے یہ واقعہ صحیح یا غلط لیکن اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ کھیل ایجنسی میں زمانوں سے رائج تھا۔

انگریزوں نے پولو کا لفظ مشرقی ممالک سے لے کر اپنایا ہے۔ انگلینڈ، امریکہ اور آئرلینڈ میں پولو ہی کے نام سے یہ کھیل رائج ہے۔ برصغیر میں باقاعدہ کھیل کا آغاز ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ پہلے اس کھیل میں وقت کی پابندی نہیں تھی۔ البتہ کامیابی کے لئے نو گول مقرر

تھے۔ برٹش دور میں وقت مقرر رہوا۔ جو ایک گھنٹہ تھا۔ پاکستان کے قیام سے قبل علاقائی بنیادوں پر پولو کے مقابلے ہوتے تھے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتر ے۔

جس شاعر کا بھی یہ شعر تھا۔حقیقت کا ترجمان تھا۔اس بھاگنے دوڑنے ،رک رک کروادی کا نظارہ کرنے کے دوران مجھے عزیز ملا تھا۔ ہنس مکھ سا نوجوان جو میچ دیکھنے ہی جا رہا تھا۔جس نے چلتے چلتے میری ملاقات پولو کی تاریخ سے کروادی تھی۔

یہ بہت مہنگا کھیل ہے۔ پرانے زمانے میں راجے اس کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔اس لئے یہ کھیل زندہ رہا۔عام آدمی نا ایک اچھا گھوڑا خرید سکتا ہے اور نا اس کی پرورش اور دیکھ بھال اس کے بس کی بات ہے۔بہر حال اب محکمہ سیاحت اور پی آئی اے کی مشترکہ کاوشوں سے اس کی سرپرستی شروع ہوگئی ہے۔اگر اس کھیل کو منظم بنیادوں پر فروغ دیا گیا تو یہ ملک کے لئے زرمبادلہ کمانے کے ساتھ ساتھ اس کے تعارف کا بھی وسیلہ بنے گا۔

میں رک گئی تھی۔ راکاپوشی کی مکمل طور پر برف پوش چوٹیاں' کہیں کہیں کسی چوٹی سے لڑھکتے برف کے تودے۔شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان ڈھلوانوں پر پھنسے ہوئے۔ سرسبز وشاداب کھیت گندم کی بنتی فصلیں۔جھاگ اڑاتی ہوئی ندیاں ،ننگی اور ابھری ہوئی چٹانوں پر گر کر آبشاروں کی صورت میں نغمے گاتی بہہ رہی تھیں۔

''یا اللہ کیا وہ بھی ایسی ہی دل آویز جگہیں تھیں جہاں بیٹھ کر کیٹس نے عشق کے گیت لکھے تھے۔یہاں وہاں خدائی حسن بکھرا ہوا تھا جس کے سامنے میری زبان گنگ تھی۔ ورڈزورتھ کی آنکھوں نے جس کائناتی حسن کو دیکھا تھا وہ اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتا۔''

جب ہم علی آباد پہنچے۔کھیل شروع ہونے والا تھا۔رات والے من چلے غیر ملکیوں کا ٹولہ بمعہ ان لمبی کبوتریوں کے وہاں موجود تھا۔کیرل بھی مجھے وہاں کھڑا نظر آیا۔

مقامی لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع تھے۔ خوبصورت تنومند گھوڑے ان پر سوار سرخ وسفید رنگوں والے مردوں کی شان دلربائی قابل دید تھی۔

بہترین اور تیز رفتار گھوڑوں کو تربیت دے کر میدان میں لایا جاتا ہے۔ یہ گھڑ سوار کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ عزیز مجھے بتا رہا تھا۔

میدان کے آخری حصے میں لمبے لمبے ڈنڈے کھڑے کئے گئے تھے جن کے درمیان گیند گزر جانے پر گول ہو جاتا ہے۔ بڑے خوبصورت اور رعنا جوان تھے جو کھیلنے کے لئے میدان میں اترے تھے۔ مقامی موسیقار گراؤنڈ کی چار دیواری پر بیٹھے گلور دھنیں بجا رہے تھے۔ کیونکہ کھیلنے والے عام کھلاڑی تھے۔ راجے مہاراجوں اور اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے لئے بکشا دریا تا جور دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ سگراہ کی دھنیں غیر ملکیوں کے لئے وقف ہیں۔

بینڈ کی تیز موسیقی اور مجمع کے ولولہ انگیز نعروں سے کھیل شروع ہوا۔ ''ٹھوکی'' لگنے پر بینڈ اپنی پوری قوت سے چیخا۔

ایک ٹیم نے دوسری پر گول کر دیا تھا۔ اب گیند پھر مخالف ٹیموں کے درمیان پھینکا گیا۔ تڑاکے کی آواز آئی۔ گھوڑے برق کی طرح اس کے پیچھے لپکے۔ کھیل اب خطرناک رفتار سے کھیلا جانے لگا۔ جوش وخروش بڑھ رہا تھا۔ زمین زلزلے کی مانند کانپ رہی تھی۔

چھ چھ کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیموں نے جب کھیل ختم کیا۔ میرا دل اس وقت یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی باہر نکل پڑے گا۔ ایسا ولولہ انگیز اور خون کو گرمانے والا کھیل بھلا میں نے کبھی کاہے کو دیکھا تھا۔ دل بیچارہ پھڑک پھڑک نہ پڑتا تو اور کیا کرتا۔

گلگت میں دریائے نگر کو دریائے ہنزہ سے ملتے دیکھا۔ پانیوں کو یوں باہم شیر و شکر ہوتے دیکھ کر میں نے بے اختیار سوچا تھا۔

ہم انسان فطرت کے سب سے بڑے شاہکار خود سے کمتر شاہکاروں کو دیکھ کر بھی

سبق نہیں سیکھتے۔حد بندیوں، گروہوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے سے سوکنوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔

میں بہت نیچے اتر گئی تھی۔ڈھلانی جگہ پر پتھروں کے زیر سایہ بیٹھتے ہاتھوں کی اوک میں پانی بھر کر میں نے اس میں سے ان سونے کے ذرات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جن کے لئے ہنزہ کا پانی خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ٹھنڈا میٹھا پانی جسے گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا میں جیسے آب حیات پی رہی ہوں۔یہ پانی قدرت کا ایک انمول عطیہ جسے غیر ممالک کے سیاح بوتلوں میں بھر کر سوغات کے طور پر ساتھ لے جاتے ہیں۔یقیناً یہ ایسے بلند و عمیق پہاڑوں کے سینے سے رس رس کر آتا ہے جن میں سونا، چاندی، لوہا اور بے شمار دیگر معدنی دھاتیں پوشیدہ ہیں جن سے ٹکرا ٹکرا کر یہ چشموں کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر آ کر سردی سے برف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ایسے طاقتور اجزا سے بھرپور یہ پانی زود ہضم، خوش ذائقہ اور صحت افزا ہے۔یہاں کے لوگوں کی درازئی عمر کا ایک سبب یہ پانی بھی ہے۔

میں پھر جھکی تھی۔اوپر کھڑا عزیز چلایا تھا۔

اتنا مت جھکیئے۔کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

بدک کر پیچھے ہٹی۔واقعی خدانخواستہ کہیں پانیوں میں سرک سرکا جاتی تو بیچارے عزیز کو مصیبت پڑ جانی تھی۔لاہور کے گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم عزیز ہنزائی سے زیادہ لاہوری نظر آتا تھا۔بڑا پیارا لڑکا تھا۔

گنش میں کئی گھروں کی مہمان بنی۔ہنزہ کے تمدن میں مغربی کلچر کی ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔گھر صاف ستھرے اور گھر والیاں محنت مشقت کی عادی دبلے پتلے اجسام کی مالک ہیں۔اردو کم و بیش ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔کہیں اگر دشواری محسوس ہوئی تو اسکول میں پڑھنے والے بچوں نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔

میری حالت کولہو کے اس بیل جیسی تھی جو آنکھوں پر کوپے چڑھائے اپنی دُھن میں چکر پر چکر کاٹے جاتا ہے میں بھی اندھا دھند ہنزہ کے میدانی علاقوں کے گرد چک پھیریاں لے رہی تھی۔

اچھی سی چائے پینے کی خواہش پر عزیز مجھے ایک چھوٹے سے ریستوران میں لے آیا تھا۔اس ہوٹل کو چندے آفتاب چندے ماہتاب جیسی ایک جوڑی چلاتی تھی۔پاؤں کی گلابی گلابی ایڑیوں کو چھوتی میکسی گلے میں قیمتی موتیوں کے ہار سر پر دلکش کڑھائی والی ٹوپی اور اس پر کسا ہوا سکارف۔

چائے پیتے ہوئے میرا دھیان اسی وجود میں ہی اٹکا رہا جو باد بہاری کی مانند میرے ارگرد ہی سرسراتی رہی تھی۔جب میں چلنے لگی اس نے میرے دائیں گال پر بوسہ دے کر کہا۔

''جانے سے پہلے مل کر جانا۔''

''ضرور''

میں اس چشم غزال کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

بس شرط اتنی سی ہے کہ اگر یہ پری پیکر اپنے لب لعلین سے میرے بائیں رخسار پر بھی بوسہ دے۔

اور چھوئی موئی کے پھول کی طرح شرماتی وہ اندر بھاگ گئی تھی۔

کریم آباد میں نہر کے کنارے قدیم اور جدید طرز کی عمارتیں اور مکانات ہیں۔ جہاں شام کے اس سہانے سمے مقامی اور غیر مقامی لوگوں کی بڑی تعداد درختوں کے سائے میں موجیں مار رہی تھی۔

غرابرش محلے میں عزیز مجھے اپنے رشتہ داروں کے گھر لے گیا۔یہ گھر جس میں داخل ہوتے ہی میں خوشگوار حیرتوں سے دوچار ہوئی تھی۔وجہ حیرت یہ نہیں تھی کہ امان اللہ شاہ

کا یہ مکان نئی اور پرانی تہذیبوں کے سنگم پر کھڑا ہر دو کی نمائندگی دل پذیر انداز میں کر رہا تھا۔

بات یہ تھی کہ وہاں ایک نہیں دو نہیں، تین نہیں، پانچ بھی نہیں پوری چھ مستقبل کی ڈاکٹر ہنزائی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ امان اللہ شاہ کی بیٹی شریں شیشے کے چمکتے گلدان میں سجی منی پلانٹ کی بیل طرح نرم و نازک اور خوبصورت تھی۔

غرابرش سے اوپر حیدرآباد دکھن محلے کی نیک پروین گندوراج کے پھول کی طرح ہنستی تھی۔ زیب النساء کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اچانک جوہی کی کلیوں کو دیکھ لیا ہو۔ تین لڑکیاں فاطمہ جناح میڈیکل کالج اور تین کراچی کے ڈومیڈیکل کالج سے منسلک تھیں۔ ساتویں لڑکی یاسمین کریم تھی جو آغا خان دیہی ترقیاتی منصوبے کی کوآرڈینیٹر کے طور پر گلگت میں کام کرتی تھی۔

وہ نئی نویلی دلہن تھی جو بیاہ کر بالائی ہنزہ کے علاقے مسگر گئی تھی۔ پھسو د چپورسن درہ ہائے کلک منتکہ جس کے اوپر دنیا کی چھت پامیر واقع ہے۔ وہ خوبصورت وادیوں حسین آبشاروں، پراسرار غاروں اور بلند و بالا گلیشروں کی سنسنی خیز باتیں سنا رہی تھی۔ یہ سفر اس نے جالو (مقامی کشتی) خچروں، پالکیوں اور پاؤں پاؤں چل کر کیا تھا۔

اس کی سسرال کے لوگ وخی تھے۔ وخی خان کے ساتھ ان علاقوں کے خیرہ کن نظاروں سے آنکھوں کو **سینکتے** ہوئے مجھے یاسمین کریم "ایوارا ڈھورن" کی مانند نظر آئی تھی۔ جس نے وینیز ویلا کی پراسرار دنیا دیکھی۔ رورایما کی چوٹی کو سر کیا اور پھر انگلینڈ واپس آ کر اپنی کامیابیوں کی داستانیں یوں سنائیں کہ شرلک ہومز کے خالق سر آرتھر کانن ڈائل نے "دی لاسٹ ورلڈ" لکھی۔

اس وقت میں نے اپنے آپ کو کانن ڈائل سمجھا تھا جو ایسی ہی کوئی تہلکہ خیز کتاب لکھے گی۔ پر میں ایک بات بھول گئی تھی یہ میری اپنی دنیا تھی۔ میری اور میرے ہم وطنوں کی دنیا جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔

یاسمین دھیمے انداز میں بات کرنے والی ایک دلکش لڑکی تھی ۔اس کی گفتگو میں چاشنی بھی تھی اور تحیر بھی ۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میں ان لڑکیوں کے دائرے میں نون غنہ بن گئی تھی ۔ جب ہوش آیا تو فوراً جھینپ کر پیچھے ہٹی ۔

پر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے نا' کوئی چھوٹی سی بات ماضی کے کسی بڑے واقعے سے جا جڑتی ہے ۔ہرا سمندر گوپی چندر بول میری مچھلی کتنا پانی ۔

میں کسی جرمن بازی گر کی طرح اپنے وجود کو دہرا کرتے ہوئے دائرے میں چکر کاٹتے اپنے پاؤں کو چھوتے ہوئے کہتی ۔

بس اتنا ۔

تب میرا جی چاہتا یہ پانی بس اتنا ہی رہے ۔ میں یونہی گھمن گھیریاں کاٹتی رہوں ۔ دائرے میں سب کی توجہ کا مرکز بننا کس قدر خوشگوار ہوتا ۔میری باری پر پانی کے اوپر چڑھنے کی رفتار بہت سست ہوتی سکھیاں بڑا بولتیں ۔

شیریں کی چھوٹی بہن نے چائے پیش کی ۔ پروین کی والدہ مسز جان محمد وہاں آ گئیں ۔مسز جان ہنزہ کی پہلی استاد خاتون ہیں ۔ بڑی دلچسپ باتیں شروع ہو گئیں ۔

''سیر کے لئے تو یہ موسم بہت اچھا ہے ۔شیریں کی والدہ بولی تھیں ۔ پر لکھنے لکھانے کی غرض آپ کے مدنظر ہے یا ۱۲ دسمبر کو ہنزہ آتیں یا پھر اکیس جون کا خیال رکھنا تھا ۔ہماری ثقافت کے دو اہم تہوار ان مہینوں اور ان تاریخوں میں منعقد ہوتے ہیں ۔''

پروین کی والدہ نے مسز امان اللہ کی بات ختم ہونے پر متانت سے کہا تھا ۔

''ہمارے کلچر کو جاننے کے لئے دو اور تہواروں کا دیکھنا بھی ضروری ہے ۔جشن نو روز جو اکیس مارچ کو اور پرنس کریم آغا خان کی ولادت سعید کا دن ۔''

میں کھڑکیوں سے باہر پہاڑوں کی پر ہیبت چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی

تھی ۔بات تو ٹھیک ہے پر ان مجبوریوں کا کیا کروں جنہوں نے مکڑی کے جالے کی طرح مجھے اپنے آپ میں جکڑ رکھا ہے ۔میری باغیانہ فطرت نے اسے توڑ کر تازہ ہوا میں سانس لینے کی کوشش کی تو ہے پر نہیں جانتی ہوں اس کی سزا کیا ہوگی؟

شیریں کے گھر سے ہی میں نے جوبلی ہوٹل فون کیا۔عروج کو اپنے بارے میں بتایا۔اس نے جواباً کہا ''ہم لوگ کل واپس جا رہے ہیں ۔تمہارا کیا پروگرام ہے!''؟

''میں تمہارے ساتھ چلوں گی''۔

پل بھر میں یہ فیصلہ میرے دل نے کیا تھا کہ مجھے ایک بار پھر ہنزہ آنا ہے۔میں نے کتاب لکھنی ہے خانہ پری نہیں کرنی ۔لہٰذا اب واپسی ہونی چاہیے۔

لڑکیوں کا خیال تھا کہ وہ مجھے رات اپنے پاس ٹھہرائیں گی پر میں نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ انشاءاللہ اگلے سال تھوشلنگ کا تہوار تمہارے ساتھ مناؤں گی۔ہنزہ آؤں گی خواہ ہڈیاں گوڈے تڑوا کر آؤں ۔پر آؤں گی ضرور۔

گزشتہ رات کی طرح دس بجے مجھے پھر ایک ٹولہ چھوڑنے آیا۔فرق صرف لڑکے اور لڑکیوں کا تھا۔

بیڈ پر لیٹی عروج نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

''لعنت ہے تم جیسے دیوانے جنونی ادیبوں اور صحافیوں پر۔کمبخت تم نے تو چین حرام کر رکھا ہے اپنا۔ہے تمہیں کچھ ہوش''۔

صبح موسم ابر آلود تھا۔چھ بجے واپسی کے لئے ویگن میں بیٹھے۔بیگم قدوائی بھی بمعہ اپنی فیملی کے ہمارے ساتھ تھیں۔راستے میں بارش شروع ہوگئی ۔ڈرائیور گھبرایا ہوا تھا۔مسز قدوائی کے بچے بار بار دہل کر ماں کے سینے سے لگ جاتے۔شاہراہ ریشم کی تعمیر کے دوران چٹانیں بارود سے اُڑانے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ سڑک کے کناروں پر پہاڑوں کے بعض حصے کمزور ہو گئے ہیں۔بسا اوقات تیز بارش اور آندھی سے اچانک کوئی ٹکڑا ٹوٹ کر سڑک پر

آ گرتا ہے ۔جس سے تباہی یقینی ہو جاتی ہے ۔بہر حال عافیت رہی ۔

گیارہ بجے گلگت پہنچے ۔پی آئی اے کے دفتر جا کر معلوم ہوا کہ سب پروازیں معطل ہیں ۔پنڈی سے ناران ، کاغان تک دھواں دھار بارش کا سلسلہ جاری ہے ۔فلائیٹ کینسل ہونے کا اگلے دن بھی سو فیصد امکان تھا ۔

''خدایا'' شاہراہ قائداعظم پر پی آئی اے کے دفتر میں کھڑی میں سوچتی اور اپنے آپ سے کہتی تھی ۔

کیا میں اب پھر اٹھارہ گھنٹے کے صبر آزما سفر کی صعوبت میں سے گزروں گی ۔ایسا دشوار گزار راستہ کہ بندہ ہر پل دہل دہل جائے ۔

سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات تھی نہ اُگلے بنے اور نہ نگلے ۔

میں نے بچوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے پنڈی فون کیا ۔کوئی شبھ گھڑی تھی فوراً رابطہ ہو گیا ۔چھوٹی خالہ نے چھوٹتے ہی مجھے کوسنوں سے نوازتے ہوئے کہا ۔

''کمبخت تیرا چھوٹا بیٹا ہر شام گھر سے نکل کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو جاتا ہے ۔بسوں ویگنوں رکشاؤں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا ہے ۔جب شام دھند لانے لگتی ہے تب چہرے پر دکھ اور یاس بکھیرے اندر آ کر مجھ سے کہتا ہے ۔

''خالہ امی میری امی آج بھی نہیں آئیں'' ۔

سچی بات ہے میرا دل پنجرے میں بند کبوتر کی طرح پھڑ پھڑایا ۔اٹھارہ گھنٹے کا سفر واپسی اب میرے لئے اس قدر کوفت کا باعث نہ رہا ۔

''خدا کا شکر میں نے اپنے آپ سے کہا تھا'' ۔

مجھے یہاں سے نکالنے کا ایک راستہ تو موجود ہے ۔''

وہ لفنگی جوڑی جس کا نام عروج اور زمان تھا پھر کہیں گم ہو گئی ۔میں اپنے میزبانوں کے گھر چلی گئی ۔نسیم سینما کے نزدیک ایس آر پلازہ میں ملنے کا طے ہوا تھا ۔مغرب تک کوئی

چھ چکر لگائے ہوں گے۔ پر خدا جانے وہ پھر کہاں دفع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

باب:13

مزاج یار برہم ہے، چلو چھوڑو ہمیں پرواہ نہیں۔
ہمیں تو پربتوں کے دیس جانا ہے۔

میری واپسی قدوائی فیملی کے ساتھ ہوئی۔مشہ بروم ٹورز کی بس میں بیٹھے جس نے آٹھ بجے شب چلنا شروع کیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔میں نے الو کی طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔بڑا خوفناک منظر تھا فوراً چہرے کا رخ بدل لیا۔

قدوائی صاحب متین اور بردبار شخصیت کے مالک تھے۔چائے پانی کے لئے انہوں نے مجھے ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد نہ بنانے دی۔رات کے اس سفر کا یہ فائدہ ہوا کہ راستے کے وہ حصے جو جاتے ہوئے تاریکی کے باعث میری آنکھوں سے اوجھل رہے دن کی روشنی میں ان کے حسن نے میری نگاہوں کو خیرہ کیا۔

تین بجے سہ پہر میں صدر روڈ پر چھوٹی خالہ کے گھر اتری۔تمام رات اور پون دن کے سفر نے میری ہڈی ہڈی اور جوڑ جوڑ چٹخا رکھا تھا۔میرا خیال تھا میں جاتے ہی لمبی تان کر سو جاؤں گی اور ساری رات سوتی رہوں گی۔

بیرونی دروازے کی دہلیز پار کر کے ابھی اندر قدم رکھا ہی تھا کہ خوبانیوں کی ٹوکری میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔آلو بخارے بکھر گئے تھے اور میں فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی کہ چھوٹی خالہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا۔

''تمہارے خصم کو پتہ چل گیا ہے اور وہ رات کی فلائٹ سے بچوں کو لینے آ رہا ہے۔کہتا تھا جہنم میں جائے ایسی بے لگام بیوی''۔

آئینہ دیکھے بغیر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میرا چہرہ دھوں دھواں ہو رہا ہے اور میری آنکھوں کے ڈھیلے کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی مانند پتھرا رہے ہیں۔

''کیوں کیسے''؟ پیڑیاں جمے میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''بولو'' چھوٹی خالہ یوں چیخیں جیسے چیل کی جلتی لکڑی ہوا کے کسی ہلکے سے جھونکے سے چیختی ہے۔ یا فریج سے نکلی ہوئی برف فضا کی گرمی سے۔

''نیکی برباد اور گناہ لازم اسی کو کہتے ہیں۔ تمہارے چھوکرے کے منہ پر ہاتھ رکھتی تھی جب وہ فون پر باپ سے بات کرتا تھا۔ اس کے طرلے منتیں کرتی تھی کہ ابو کو کچھ نہیں بتانا۔ پر بچہ تھا وہ۔ کل پھٹ پڑا''۔

اب فون گھمانے شروع کیے۔ دفتر میں چھٹی ہوگئی تھی۔ ان دنوں گھر پر فون نہیں تھا۔ عزیزوں رشتہ داروں کو زحمت دینے کی کوشش کی پر رابطہ نہ ہو سکا۔ بالآخر بیگم ممتاز شفیع کے گھر فون کھڑکایا۔ وہ کوئٹہ گئی ہوئی تھی۔ بریگیڈیئر شفیع صاحب سے درخواست کی کہ وہ میرے گھر اطلاع کر دیں کہ میں شمالی علاقوں سے واپس آ گئی ہوں۔''

رات گئے تک مجھے میاں کے آنے کا دھڑکا لگا رہا۔ تاہم خیریت رہی۔

چھوٹی خالہ بولیں۔

''کمبخت تو نے جو اتنے پرا گے ڈالنے تھے تو بیاہ کا ہے کو کیا تھا۔ بچے کیوں پیدا کیے''۔

میں نے کھانے کی ٹرالی اپنے سامنے گھسیٹی۔ کریلے گوشت کی پلیٹ پر محبوبانہ نظر ڈالی۔ فرنی کے پیالے کو حریصانہ انداز میں تاکا اور سلاد کے پتوں کو بکری کی طرح چباتے ہوئے کرسی پر بیٹھی۔ چھوٹی خالہ کی گندھارا کے مجسموں جیسی ناک پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ۔ کمال کی باتیں کرتی ہیں آپ بھی''۔

''بھلا بیاہ کیوں نہ کرتی۔ بیاہ کا اپنا حسن ہے اور بچے کیوں نہ پیدا کرتی؟ بچوں کے بغیر عورت کس کام کی؟ واہ چھوٹی خالہ واہ۔ زندگی کے ان پہلوؤں کی مسرت سے آشنا ہوئے بغیر ہی قبر میں اتر جاتی۔ ارے کیوں؟ ہاں رہے یہ پرا گے تو بھئی ان کا اپنا ایک چسکہ ہے''۔

''ذرا لاہور چلو۔ اس چسکے کی لذت کا پھر پوچھوں گی''۔ بڑا زہر تھا انکے لہجے میں۔

گلاس اس وقت میرے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا اور پانی گھٹ گھٹ میرے حلق سے نیچے اتر رہا تھا جب چھوٹی خالہ کی یہ بات میرے کانوں میں پڑی۔

''خدا گواہ ہے پتہ نہیں کیوں مجھے وہ اس وقت ''ایا گو'' کی مانند نظر آئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا میاں ''اوتھیلو'' کی طرح بدظن ہو گیا ہے اور اب میرا انجام بھی ڈیسڈیمونا کی طرح ہو گا۔ جسے ''اوتھیلو'' نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

کھانے میں جیسے ریت مل گئی تھی۔ سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ میں نے ٹرالی کو دھکا دے کر دیوار کے ساتھ جا کھڑا کیا اور خود ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔

پر جب میں روال ڈیم کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں سے منہ دھو رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

شیکسپیئر کے اس المیے ڈرامے کو یاد کرنے کا بھلا یہ کونسا موقع تھا؟ میری ذہنی کمینگی تو دیکھو۔ چھوٹی خالہ کو ''ایا گو'' بنا دیا۔ بھلا وہ کوئی ایسی ہیں۔

جب میں دوبارہ کمرے میں آئی وہ تشویشناک انداز میں ٹرالی پر دھری پلیٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ جس میں ابھی آدھا سالن پڑا تھا۔

''تم نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا''۔

''میٹھا تو ابھی لینا ہے''۔ فرنی کی پیالی میں نے ہاتھوں میں تھام لی تھی۔

ناک کی پھنگی پر پھنسی عینک کے شیشوں میں سے انہوں نے پھر مجھے دیکھا اور کہا تھا۔ ''تو بھرے پرے سسرالی گھر میں رہتی ہے۔ تیرا میاں بپھرا ہوا لگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو سب کے سامنے بے عزتی کر دے''۔

میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر انگڑائی لی۔ ہنسی اور بولی۔

''ارے آپ کیوں فکر میں گھل رہی ہیں؟ بے عزتی چھوڑ ٹھکائی بھی کر دے پرواہ نہیں۔ آپ کو کیا پتہ میں وہ کام کر آئی ہوں جس کے لئے گزشتہ دو سال سے منصوبے بنائے بیٹھی تھی''۔

اگلے دن میاں کا فون آیا۔ بچوں نے سنا۔ چہکتی ہوئی آواز میں یہ ضرور بتایا کہ امی آ گئی ہیں۔ پر نہ باپ نے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ نہ بچوں نے ایسا چاہا اور رہی میں دتو مجھے بھی کچھ ایسی تمنا نہ تھی۔

ایک ہفتے بعد لاہور واپسی ہوئی۔ میاں اسٹیشن پر موجود تھے۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر پھیلے غصے کے بادل گھنیرے ہیں اور آسانی سے چھٹنے والے نہیں۔ دیور دیورانیوں نے سونے کا اہتمام یوں کر رکھا تھا جیسے میرا چوتھی کا ڈولا گھر میں اترا ہو۔

رات چاندی تھی۔ نئی تعمیر شدہ عمارت کے ٹیرس پر دو بستروں پر ہم دو اجنبیوں کی مانند پڑے تھے۔ حبس اور امس نے جان نکال رکھی تھی۔ میرے بیڈ روم کا ائیر کنڈیشنڈ کھلی چھت پر پڑا تھا۔ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا باقی فکر کونے کھدروں میں جا بیٹھے تھے اور یہ سر پر سوار ہو گیا تھا۔

ہمارے درمیان بہت سے اختلافات میں سے ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ میں دن میں سونے کی عادی نہیں جبکہ میاں جی قیلولے کی غرض سے کمر بستر سے چپکائیں گے تو تین گھنٹوں سے پہلے اٹھیں گے نہیں۔ ادھر رات کی سیاہی گہری ہوئی اور میں نے کسی شرابی کی طرح جھومنا ڈولنا شروع کر دیا۔ نو بجے میرے خراٹے کمرے میں گونجنے لگتے ہیں۔

اس شب بھی جب ہمارے درمیان ایک سنگین سی خاموشی طاری تھی۔ میں چاہتی تھی اس جان لیوا جھگڑے کا مک مکا ہو جو اس نے کہنا ہے یا کرنا ہے وہ کہے اور کرے اور جو میں نے سننا اور سہنا ہے میں سن اور سہہ کر کنارے لگوں۔گزشتہ ہفتہ بھر سے بیچ منجدھار پھنسی پڑی ہوں۔

دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساڑھے سات ملی میٹر رینج کی رائفل کا بٹ میرے سر پر پڑا ہو۔

پوچھا گیا تھا

''کس کی اجازت سے تم گلگت اور ہنزہ گئی تھیں''۔

میں نے مسکینی کا پورا جام اپنے لہجے میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''آپ سے تین چار بار کہا تھا''۔

جیسے بارود کے ڈھیر کو آگ لگ جائے۔تابڑتوڑ دھماکے ہونے لگے۔

بڑی ایڈونچرس منی پھرتی ہو۔مارکوپولو کی بھتیجی۔پاکستان کے دشوار گزار علاقے فتح کرنے چلی تھی۔کوئی ہرج مرج ہو جاتا۔اغوا کر لیتا۔کون ذمہ دار تھا۔بولو۔بتاؤ۔سری لنکا سے آنے والی اس عورت کا حال معلوم نہیں۔کیسے ریپ ہوئی۔سارا سفارتی عملہ ہلکان ہو گیا۔پر ملزم کا نشان تک نہ ملا۔یہاں کس کی ماں کو ماسی کہنا تھا۔

میری زبان پر کھجلی ہو رہی تھی پر میں ایک لفظ بھی بولنا نہیں چاہتی تھی۔زبان کے کسی ہلکے سے ہتھیار سے بھی غصے میں اضافے کا باعث بننا نہ چاہتی تھی۔تھوڑا سا امن و امان ہوا۔تو میں نے میاں کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔پر میرا سری لنکا کی عورت سے مقابلہ مت کریں۔میں تو اپنے آپ کو خدا کی تحویل میں دے کر چلی تھی''۔

میری بات انہوں نے یوں کاٹی جیسے تیز قینچی کپڑے کو کاٹتی ہے۔

''تم اگر جانے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی تو کسی کو ساتھ لے لیا ہوتا۔ اپنے چچا کو تیار کر لیتیں۔ اپنی کزن سے پروگرام بنا لیتیں۔ خدا کی بندی کچھ تو سوچا ہوتا''۔

میں خاموش تھی۔ اب اگر انہیں یہ سمجھانا چاہتی کہ میں بیساکھیوں کے بغیر چلنے کی عادی ہوں تو بات اور لمبی ہو جاتی۔

میں نے جس تحمل سے میاں کی جلی کٹی باتیں سنیں اس نے حالات کو معمول پر لانے میں بڑی مدد دی۔

لیکن میرے دل میں خلش تھی۔ شمالی علاقوں کا ایک حصہ میں دیکھ آئی تھی اور دوسرا یعنی بلتستان ابھی باقی تھا۔ ایک رات میں نے میاں کے پاؤں پکڑ لئے۔

''اتنا سا احسان کر دو میں نے بلتستان جانا ہے''۔

''کوئی ساتھی ڈھونڈ لو'' دوٹوک جواب ملا۔

اب مجھے ایسے ساتھی کی تلاش ہوئی جو اپنے سفر کا بوجھ میری جیب پر نہیں اپنی پر ڈالے۔ آخر یہ تگ و دو کامیاب ہوئی۔ حنا ڈائجسٹ کی مدیرہ نے آمادگی ظاہر کی۔ میاں نے سفر کے سارے انتظامات درست کئے اور یوں ایک دن ہم سکردو پہنچ گئے۔

پر ان حفاظتی انتظامات کا جو میاں نے میرے ساتھ کے سلسلے میں کئے تھے۔ سکردو پہنچنے کے تین دن بعد ہی تار و پود بکھر گیا تھا۔

وادی شگر جاتے ہوئے راستے کی مٹی، ریت اور دھول نے ہم سفر محترمہ کے خوبصورت بالوں کا ستیاناس کر دیا۔ پورا سکردو بازار چھان مارا لیکن جب اُسے مطلوبہ شیمپو نہ ملا تو اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

''تمہارا جہاں جی چاہے جاؤ۔ گھومو پھرو۔ اپنے آپ کو مٹی میں رولو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تمہارے میاں کے فون آنے پر اسے بتاتی رہوں گی کہ تمہاری بیوی خیریت سے ہے۔ بس ذرا لائبریری میں بیٹھی کتابیں کنگھال رہی ہے۔

'خپلو' کھرمنگ اور چھوربٹ کے دشوار گزار راستوں نے مجھے یوں دہلایا اور ہلایا جیسے پختہ عمارتیں زلزلوں کے جھٹکوں سے ہلتی ہیں۔ میں ہر روز کسی شرابی کی طرح کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کرتی پر اگلی صبح یہ توبہ یوں ٹوٹتی کہ پھر کسی ویگن میں بیٹھی نئے سفر پر روانہ ہورہی ہوتی۔

گرد اور مٹی میں اٹے پاؤں دھول اور تکان سے آلودہ چہرے کے ساتھ جب میں پرنسپل ہاؤس میں داخل ہوتی وہ تروتازہ میک اپ کے ساتھ بستر میں بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے یا سکردو ریڈیو کے لئے کہانیاں لکھتی ملتی۔

میں جوتے اتار کر پاؤں کی مٹی جھاڑتی اور وہ کہتی

''آج میں نے ریڈیو پر دو پروگرام کئے۔کل ایک کیا تھا۔اتنے پیسے ملے''۔

وہ پیسوں کے ملنے کی تفصیل بتاتی اور میں خرچ کی۔

اور سکردو میں اپنے قیام کی ایک سہ پہر جب میں بلتستان کی اہم شخصیت جناب غلام وزیر مہدی سے ملنے اور اس ملاقات کے نتیجے میں ہونے والی گفتگو کے مختلف پہلوؤں پر غور کررہی تھی اس نازنین نے مجھ سے کہا۔

''کپڑے اور کراکری بہت سستی ہے یہاں۔چلو نا۔کچھ خرید لائیں''۔

''میری جان میرے پاس چھ کپ ہیں۔بارہ کپ میری دیورانیوں کے پاس ہیں۔جس گھر میں اٹھارہ کپ ہوں۔وہاں مزید کراکری کی بھلا کیا ضرورت ہے۔رہے کپڑے تو مجھے ان کا ذرا سا بھی خبط نہیں۔میں تو ملنگ بادشاہ ہوں۔دو جوڑے زیادہ بن جائیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ سنبھالوں کہاں؟

اب وہ ایسی بے سروپا باتوں کا کیا جواب دیتی۔

حسین آباد میں جناب غلام وزیر مہدی کا گھر نیا بھی تھا اور خوب کشادہ بھی۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی قناتیں لگوانے اور اندر باہر کے انتظام میں مصروف تھی۔صاحب خانہ

کے بیٹے کی شادی تھی۔

یہ ہماری لمبی اور دلچسپ نشست تھی۔ بلتستان کی موجودہ تاریخ کے اوراق اٹھا کر انہوں نے مجھے جو چہرے دکھائے وہ حقیقتاً سحر زدہ کر دینے والے تھے۔

''دفعتاً انہوں نے مجھ سے پوچھا''۔

''آپ نے کتنا خرچ کیا ہوگا اپنی اس سیاحت پر''۔

میں نے کمرے کی خوبصورت چوبی کھڑکیوں پر نظریں جمائیں۔موٹا سا اندازہ لگایا اور انہیں بتادیا۔

''احمق نکلیں آپ۔حکومت پاکستان سے مدد لی ہوتی''۔

ہونقوں کی طرح میں نے انہیں دیکھا۔یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔

انہوں نے حماقت پر ساتے میرے چہرے کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھا اور بولے۔

''بھئی حکومت غیر ملکیوں پر اتنا خرچ کرتی ہے۔ان کا کام بھی اس معیار کا نہیں۔ آپ تو اپنی ہیں۔ظاہر ہے ہم پر جذبوں سے لکھیں گی۔''

مجھے اپنی جلد بازی پر افسوس نہیں دکھ ہوا۔وہ پیسہ جو میرے اس شوق کی نذر ہوا۔ اس سے وہ چھوٹے موٹے کام پورے ہو سکتے تھے جنہیں میں نے مدت سے پس پشت ڈال رکھا تھا۔

میری حالت اس کھسیانی بلی جیسی تھی جو غصے میں آ کر کھمبا نہیں اپنا آپ نوچتی ہے۔

بلتستان کے درو دیوار پر بکھرے آرٹ کے نادر شاہکاروں مدھ بھرے بلتی گیتوں، موسیقی کی دلنواز دھنوں، اور تہذیب و ثقافت کے نمائندہ زندہ شاہکاروں نے مجھے اس درجہ متاثر کیا تھا کہ میں نے بے اختیار سوچا کہ اسے شمالی علاقہ جات کے بقیہ حصوں کے ساتھ گڈ مڈ کر دینا زیادتی کی بات ہوگی۔اس پر الگ سے ایک کتاب تخلیق کرنے کی ضرورت ہے۔

ذہن کے کینوس پر جب کہانی کا خاکہ بکھرا اور اس میں رنگ آمیزی کا کام شروع ہوا تو احساس ہوا کہ یہ تو پہاڑوں کے سینے سے دودھ کی نہر نکالنے کے برابر ہے۔اوزاروں کی کمی ہے۔ضرورت تھی کہ ایک بار پھر وہاں کا چکر لگتا۔جزوی تفصیلات جن کے بغیر کہانی کی صورت نہیں بن رہی تھی' جانی جائیں۔ذہن میں جناب وزیر مہدی کی گفتگو کا وہ ٹکڑا بھی تھا جس نے اسے مزید محرک کر دیا تھا۔

Prsident has a soft corner for Baltistan

صدر مملکت کو آہ وزاری سے بھری ہوئی لمبی چوڑی چٹھی لکھی گئی۔جس کا جواب کوئی ماہ بعد آیا۔لکھا تھا۔

''شمالی علاقہ جات آزاد کشمیر کے زیر ہیں۔ان کی وزارت اطلاعات ونشریات سے رابطہ کریں۔''

''جو حکم حاکم''۔میں نے اپنے آپ سے کہتے ہوئے ایک نئی چٹھی لکھ ڈالی۔

ڈیڑھ ماہ بعد ڈاکیے نے وزارت ونشریات آزاد کشمیر کی جانب سے جو خط مجھے تھمایا اسے میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کھولا۔

''محترمہ شمالی علاقہ جات مرکز کے تابع ہیں۔''

پہلے میں نے ایک چھوٹی سی گالی خود کو دی۔چند لمحوں بعد پھر ایک بڑی گالی سے اپنے آپ کو نوازا۔پر دل کی دھڑکن اور چہرے پر پھیلی غصے کی لالی کم نہ ہوئی۔لان میں اُگے شہتوت کے پیڑ سے گرتے زرد پتے بگلوں کے ساتھ مل کر میرے سامنے گھمن گھیریاں کاٹ رہے تھے۔بالکل میری طرح جو تین ماہ سے لاہور،اسلام آباد اور آزاد کشمیر کی چک پھیریوں میں پھنس گئی تھی۔

میں نے خط کو لیر لیر کر دیا۔

سفید براق کاغذ کے منے منے ٹکڑے ہواؤں کے زور سے اڑ کر یہاں وہاں بکھر کر

لان کی بدنمائی کو مزید نمایاں کرنے لگے جو مالی کی ہڈ حرامی اور گھر کی چار رانیوں کے پھوہڑ پن کا پہلے ہی شکار تھا۔

اپنی تواضع میں نے گالیوں سے کی اور بڑے لوگوں کی تبرؤں سے۔ تب کہیں جا کر کلیجے میں ٹھنڈ پڑی۔ پرسکون سی ہو کر میں نے خود سے کہا تھا۔

''ہٹاؤ یار مفت خوری ہمارے مقدر میں نہیں''۔

جس طرح شکاری کتے دوڑ دوڑ کر بھاگ بھاگ کر شکار کو ڈھونڈ نکالتے ہیں، اسی طرح میں نے بھی لاہور میں بکھرے ہوئے بلتی لوگوں کو کھوج کر لیا تھا۔ میاں دفتر سے آتے۔ کھانا کھاتے۔ قیلولے کی غرض سے لیٹتے۔ ذرا آنکھ بند ہوتی اور میں بھاگ نکلتی۔

میاں کے پاس گاڑی ہے پر ۷۲ء ماڈل کی گاڑی میاں جی کو ۷۳ (ہماری شادی کا سال) کے ماڈل سے کہیں زیادہ پیاری ہے۔ میری مجال نہیں کہ اسے ہاتھ لگاؤں۔ شروع میں بڑا پیچ و تاب کھایا۔ پھر جان لیا اور دل کو سمجھا لیا کہ رزق حلال کھانے اور کمانے والے افسر آدمی کے لئے نئی بیوی حاصل کرنا جتنا آسان ہے۔ نئی گاڑی کا حصول اتنا ہی مشکل۔ چنانچہ لاہور کی سڑکیں تھیں۔ ویگنیں اور رکشے تھے۔ ہماری ٹانگیں اور ہمارے عزائم تھے۔ دنوں یہ تماشا چلا۔ پر وہ جو کہتے ہیں۔ سو دن چور کا ایک دن سادھ کا۔

میاں گرجے۔

چنی چکدی ایں تے تھرپنی اں دکھے جانی اں۔ (اوڑھنی اوڑھتی ہو اور باہر نکل جاتی ہو۔ کہاں جاتی ہو؟) میں اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ میں کہاں جاتی ہوں؟ میں اسے یہ نہیں سمجھا سکتی تھی کہ میرا یہ جانا کیوں اور کس لئے ضروری ہے؟

''یہ میرا بلتستان'' میری ذہنی کوکھ سے بہت دل پذیر انداز میں تخلیق ہوئی۔ کتابی صورت میں آنے کے لئے بیوپاری کے پاس گئی تو اسنے اس کی صحت مندی حسن و رعنائی اور دل پذیری کا ٹھوک بجا کر دیکھنے کی بجائے سرسری نگاہ ڈال کر قیمت لگا دی۔ میرے دل سے

کہیں چیخ نکلی جو میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

''اس سے کہیں زیادہ تو اس پر خرچ کر بیٹھی ہوں''۔

جواب ملتا ہے۔

''ہم نے فرمائش تو نہیں کی تھی''۔

بات درست تھی۔ پر میرا دل جیسے منوں وزنی پتھروں کے نیچے آ گیا تھا۔ اتنی محنت' اتنی تگ و دو' اتنی جان ماری بھلا کس کام آئی۔

دنوں مجھے اس بیماری نے اپنے آپ میں جکڑے رکھا جسے جدید زبان میں ڈپریشن کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر مایوسی اور گھٹن کی اس مٹی کو جس میں مرغی کی طرح میں اپنے آپ کو رولتی رہی تھی۔ پروں کو پھڑ پھڑا کر جھاڑتے ہوئے اٹھی۔

میں نے اپنے آپ کو سنایا۔ بہلایا یہ کہتے ہوئے۔

''اچھے کپڑوں کا مجھے شوق نہیں۔ گھر میں چماری بنی رہتی ہوں۔ ماں بیچاری زندگی بھر میرے تن پر دیدہ زیب کپڑے دیکھنے کی تمنا میں ہی اگلے جہاں سدھار گئی۔

زیورات سے لگاؤ نہیں۔ بیاہ پر زیورات کی صورت میں جو دان اس نے مجھے کیا تھا وہ کچھ تو سناروں کی نذر ہو گیا ہے اور باقی ہونے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔

چہرے پر غیر ضرور لیپا پوتی چھوڑ ضروری کام کے لئے بھی کبھی دھیلا پولہ خرچ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میاں جب جلی کٹی آواز میں کہے۔

''کالے ہونٹ ہیں تیرے گلابی لپ اسٹک کا ہلکا سا ٹچ دے دیا کرو ان پر رنگت بدل جاتی ہے۔

تب کلیجے پر آریاں تو چلتی ہیں۔ پر ایسی کمینی ہوں کہ مانگے تانگے سے گزارے کی کوشش کرتی ہوں۔

گھر کو سجانے اور سنوارنے سے بھی رتی دلچسپی نہیں۔ پڑی واسوں جیسا حال

ہے۔ بٹوے میں نوٹ ہوں گے۔ ڈیکوریشن کی کسی چیز پر دل بھی آیا ہوا ہوگا پر مجال ہے جو زیپ ڈھیلی ہو جائے۔

تو پھر اس شوق اور جنون کی اتنی سی قیمت دینے سے آزردگی کیسی؟

میں تازہ دم تھی۔

گلگت پر لکھنے کے لئے کتابوں کا پیوں کو کھول بیٹھی تھی۔

سولہ ہزار مربع میل کا یہ علاقہ اپنے محل وقوع اور جغرافیائی اہمیت کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ضلع گلگت میں نو تحصیلیں ہیں۔ گلگت داشکومن دیونیال دکوپس د چھلت دنگر یاسین دکوجال اور ہنزہ شامل ہیں۔ کوہستانی سلسلوں میں جہاں کہیں کم اونچا راستہ نکل آتا ہے' درہ کہلاتا ہے۔ وادی کاغان کو گلگت کے ساتھ ملانے والا درہ بابوسر ہے۔ سری نگر جانے کے لئے برزل کا درہ پار کرنا پڑتا ہے۔ شمال کی طرف کاشغر جانا ہو تو مسگر سے آگے دو راستے نکلتے ہیں۔ چترال جانے کے لئے شندھور کا درّہ ہے۔

ضلع گلگت میں ضلع دیامیر کو یکجا کر کے ایک سیاسی اکائی بنا دی گئی ہے۔

گلگت کی جغرافیائی کیفیت سے ظاہر ہے کہ یہ تنہائی اور علیحدگی کا علاقہ ہے۔ شاہراہ ریشم کی تعمیر نے اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مگر باقی حصے ابھی تک مشکل اور دشوار گزار راستوں کی زد میں ہیں۔ یہاں بہت سی قومیں آئیں۔ کشمیر سے کشمیری دبلتستان سے بلتی' شمال کی طرف سے منگول اور چینی د ترکمان' مغرب سے چترالی۔ ان سب کا امتزاج یہاں موجود ہے۔ باشندوں میں سب سے زیادہ تعداد نسلی طور پر تورانی لوگوں کی ہے۔ جو دو ہزار قبل مسیح کے قریب اس خطے میں داخل ہوئے۔ ان پر آریائی شین لوگوں نے حکومت جمائی اور دونوں کے خون کی آمیزش ہوئی۔

وادی گلگت لمبائی میں تقریباً آٹھ میل اور چوڑائی میں چار میل ہے۔ انگریزوں کے دور میں یہ پایہ تخت رہا۔ سکھوں اور ڈوگروں کے راج میں بھی گورنر کی رہائش گاہیں یہیں

تھیں ۔آج بھی یہ شمالی علاقہ جات کا صدر مقام ہے۔دنیا کے بلند ترین پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ وادی مون سون کی بارشوں سے محروم رہتی ہے۔ ذرائع آب پاشی کی کمی سے اس کے پہاڑ بے برگ و گیاہ ہیں۔

بہتے دریا اور نالے وادیوں کی گہرائیوں میں ہیں۔ان سے نہریں نہیں نکالی جا سکتیں۔وہ علاقے جو میدانی ہیں۔مثلاً گلگت خاص ،ہنزہ ،نگر یاسین ،نیال اور اشکومن کوپس وغیرہ میں سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ پہاڑی علاقے جن میں بگروٹ ،ہراموش ،ہو پر ،چھپروٹ ،مسگر اور تھوئی کے علاقے شامل ہیں۔سخت سردی کے باعث یک فصلی ہیں۔

اور بس ''میں'' ہو نکلنے لگی تھی اس گدھے کی طرح جو منزل پر پہنچے بغیر کہیں راستے میں ہی رُک جائے۔

گلگت کا چہرہ جس قدر خوبصورت ،معصوم اور صبیح ہے۔اس کے خدو خال اسی قدر تیکھے ہیں۔اندر کئی خانوں میں بٹا ہوا اور کٹا پھٹا ہے۔

میری آنکھوں نے جن نظاروں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کیا تھا۔میرے کانوں نے جو کہانیاں سنی تھیں ۔میرے قدموں نے جن جن جگہوں پر اپنے نشان ثبت کئے تھے۔تجربات اور مشاہدات کے یہ خزینے کورے کاغذوں پر منتقل ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ ابھی تو عشق و عاشقی کی ابتدا ہی ہے۔انتہا تک جانا تو خاصا دشوار ہے۔

چند باب ہی لکھے گئے تھے اور میں پسینہ پسینہ تھی۔اب پلے کچھ نہیں تھا۔بالکل تہی دامن ۔سچی بات ہے۔مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس بدنصیب دولہا جیسی ہوں جسے طویل انتظار کے بعد شب عروسی نصیب ہوئی ہو پر ڈلہن کا چہرہ جی بھر کر دیکھنے سے قبل ہی جدائی کے لمحے کا گجر بج جائے۔اور بے چارہ یقین کے ساتھ یہ بھی نہ بتا سکے کہ سیاہ تل دُلہن کے دائیں رخسار پر تھا یا بائیں پر۔

اضطراب سا اضطراب تھا۔ بے چینی سی بے چینی تھی ۔ضرورت ایک بار پھر وہاں جانے کی تھی ۔پر اخراجات کا کوہِ گراں بھی سامنے تھا۔

یہ جاتی خزاں کے شب و روز تھے جب کل پاکستان چھٹی اہلِ قلم کانفرنس کی طرف سے شرکت کا دعوت نامہ ملا۔

''چلو یہ اچھا ہوا۔ میں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

گلگت کے کسی آدمی سے ٹکراؤ تو ہو گا۔اسی سے مشورہ کرونگی۔''

''ہالیڈے ان''اوراسلام آباد ہوٹل کے کانفرنس روم میں مجھے مقالے سننے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ میں ان چہروں کی متلاشی تھی جن کا تعلق گلگت یا اس کے گردونواح سے تھا۔ہر ملنے والے ادیب سے میری یہی فرمائش ہوتی کہ وہ ایسے بندے کا خیال رکھے۔

اور اس سنہری شام میں جب اسلام آباد ہوٹل کے کانفرس روم میں جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال علامہ کی وفات کے بعد پبلیشروں کے ناروا سلوک اور اپنے دگرگوں حالات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے'جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی نے دبے پاؤں میرے قریب آکر سرگوشی میں مجھے یہ نوید سنائی تھی کہ اپ کی پشت پر تیسری قطار میں چوتھے نمبر بیٹھے عثمان نامی آدمی گلگتی ہیں۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔معصوم سا چہرہ جس پر دھرا ایک ایک نقش اس امر کی بہت حد تک نشان دہی کرتا تھا کہ صاحب املاک نرم رو اور نرم خو ہے۔

جب قینچی کی طرح چلتی میری زبان اک ذرا رکی ۔انہوں نے دھیرج سے پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے بتایا کہ اُن کے پاس نایاب قسم کی کتب موجود ہیں۔لیکن ان سے استفادہ صرف گلگت آنے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ بذریعہ ہوائی جہاز یا کسی آنے جانے والے کے ہاتھ وہ انہیں بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتے۔

عثمان صاحب سے فارغ ہوکر میں نے دانشوروں کے ہجوم پر نظر ڈالی جو ٹولیوں

کی صورت میں ادھر ادھر بکھرے ایک دوسرے سے بحث مباحثے میں الجھے ہوئے تھے۔ تبھی کسی نے نوجوان سے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

یہ اکبر حسین اکبر ہیں‘ نگر کے رہنے والے۔ ڈیلی مسلم کے نمائندے۔ آپ کے لئے بہت معاون ثابت ہونگے۔

میں نے نظر بھر کر اس خوبرو نوجوان کو دیکھا۔ گورے چٹے رنگ پر سرخی مائل چھوٹی چھوٹی داڑھی چہرے کی وجاہت اور دلکشی میں اضافے کا موجب بنی ہوئی تھی۔ پر اکبر حسین اکبر کی آنکھیں اور پلکیں جنہیں دیکھ کر بس یوں لگتا تھا جیسے ابھی گلاب کے پانیوں سے دھل کر نکلی ہیں۔ بھیگی بھیگی دھتری نتھری سی۔

اکبر نے مجھے اپنے گھر کا پتہ سمجھایا۔ آفس کا نمبر دیا۔ دفتر میں اپنی آمد کے اوقات کار بتائے اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

اور میں نے سکھ کے لمبے لمبے سانس لئے تھے۔ اپنا آپ یوں ہلکا پھلکا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی غریب بیٹی بیاہ کر سکھ چین کا سانس سینے سے کھینچتا ہے۔

طویل مقالوں سے ذرا جان چھٹی۔ میں ایک بار حسین کے گھر کی طرف یوں بھاگی جیسے میری گردن کسی نے چھری تلے رکھ دی ہو۔ پنڈی سیٹلائٹ ٹاؤن میں رکشے والا چک پھیریاں کاٹ رہا تھا اور میں مطمئن سی اجنبی سڑکوں ‘خوبصورت گھروں ‘ان میں اگے درختوں‘ بوٹوں‘ پتوں اور پھولوں کو دیکھتے ہوئے یادوں کے ڈانڈے کہیں سے کہیں ملا رہی تھی۔ میٹر کا رخ رکشے والے کی جانب تھا اور رکشے والا بہت بیبا اور خوش مزاج نظر آیا تھا۔

دفعتاً یونہی بے خیالی میں میری نظریں میٹر کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے بند دروازے پر اپنے ہاتھ کی گرفت کو مضبوطی سے جمایا۔ اس وقت میری ٹانگوں کے نیچے ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی اور میں کھوکھے والے سے پتہ پوچھ کر رکشے کی جانب پلٹی تھی۔

ستتر روپے۔ مجھے اختلاج قلب محسوس ہو رہا تھا۔

''میسٹر غلط ہے تمہارا'' ہونٹوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔

''غلط کیسے ہو گیا۔ سارا سیٹلائٹ ٹاؤن چھان مارا ہے۔ ایک ایک سڑک کو تین تین بار روندا ہے۔''

رکشے والے کی ساری خوش مزاجی جانے کہاں اڑنچھو ہو گئی تھی۔ خونخوار نظروں سے وہ مجھے گھور رہا تھا یوں جیسے کچا کھا جانا چاہتا ہو۔

فوراً میں نے پیسے اُس کی ہتھیلی پر رکھے۔ میری جان بہر حال ستّر روپوں سے مہنگی تھی۔ جب بڑبڑ کرتا رکشہ پھٹ پھٹا تا کہیں دوسری طرف نکل گیا۔ تب میں نے چلنا شروع کیا۔

اپنی جلد بازی اور اکبر کے گھر پر دو حروف لعنت کے بھیجتے ہوئے میں پیدل مارچ کر رہی تھی۔ پاؤں میں پہنے اونچی ایڑی کے جوتے نے فیشن کرنے اور شخصیت کو جاذب نظر بنانے کی کوشش کا کس طرح بھرتہ بنایا یہ کوئی اس شام میرا حلیہ دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا۔ تین میل کی کھٹن گھیریوں میں سے نکل کر جب میں بس پر بیٹھی تب میرا جی چاہا تھا کہ پاؤں کاٹ کر یہیں کہیں پھینک جاؤں ٹیسیں مارتے سلگتے یہ جسمانی اعضاء بھلا کس کام کے؟

اسلام آباد ہوٹل سے دو اسٹاپ پیچھے بس رکی۔ میں اتر گئی۔ نسبتاً ویران سی جگہ پر بیٹھ کر گیلے رومال سے چہرہ پاؤں اور جوتے صاف کیے۔ اکا دکا چلتے پھرتے لوگوں کی طرف دیکھتے اور ان کی نظر سے بچتے بچاتے میں نے بالوں میں کنگھی چلائی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ٹچ دیا۔

فائیو سٹار ہوٹل میں اس سڑے بسے مڑے تڑے حلیے کے ساتھ داخل ہونا کس قدر اذیت دہ تھا۔

☆☆☆

باب:14

چلو کہ چل کے دیدار کریں
جلتے ہیں جہاں میری یادوں کے چراغ

اکبر حسین اکبر کے ساتھ دوسری ملاقات اس صبح ہوئی جب میں صدر روڈ پر ہنس راج کی طرح پر پھیلائے پی آئی اے کی عمارت کے ایک چھوٹے سے کیبن میں میز پر ہاتھ پھیلائے جناب زیدی صاحب کے سانولے سلونے چہرے پر بکھرے رعونت اور برہمی کے آثار کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے گھگھیاتے ہوئے ان سے کہہ رہی تھی۔

''گلگت جانے والے باقی مسافروں کو تو گولی ماریں۔بس مجھے اور میری کزن کو جہاز میں سوار کرا دیں۔آپ کو خدا کا واسطہ۔آپ کا بھلا آپ کی آل اولاد کا بھلا۔یہ بندی تاحیات آپ کو دعائیں دے گی۔''

اور زیدی صاحب جھلاتے ہوئے کہتے تھے۔

''آپ کا دماغ چل گیا ہے۔بھلا بیس دن پہلے کے بک شدہ لوگوں کو کیسے ڈراپ کیا جا سکتا ہے۔''

''یہ سب آپ کا کام ہے مجھے تو کل کی فلائٹ کے دو ٹکٹ چاہیں۔زیدی صاحب میں آپ کی جان بخشی نہیں کروں گی۔آپ کو گھر نہیں جانے دوں گی۔''

''میں مجبور ہوں''۔انہوں نے کیبن کی شیشے والی دیوار سے پرے لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

''کاش میں جوڈو کراٹے کی ماہر ہوتی۔میں دل ہی دل میں بڑبڑائی تھی
اس سڑیل سے زیدی صاحب کو پٹخنی دے کر زمین پر گراتی' سینے پر چڑھ بیٹھتی اور

تب خلاصی کرتی جب ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیئے جاتے۔''

''زیدی صاحب آپ نہیں جانتے ہیں............

میرا جملہ ابھی ادھورا تھا کسی نے پیچھے سے کمرے میں آ کر کہا تھا۔

''یہ بڑے اہم مشن پر وہاں جا رہی ہیں۔ چلئے آپ میری سیٹیں انہیں دے دیں''۔

میں نے رخ پھیرا یہ دیکھنے کے لئے کہ اس نفسانفسی اور آپو دھاپی والے عالم میں عبدالرحیم خان خاناں جیسا دریا دل کون ہے۔؟

اکبر حسین اکبر اپنی نکھری جیسے گلاب کے پانیوں سے دھلی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔

''تم اکبر'' میں نے بے اختیار کہا۔

زیدی صاحب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

پھر چانس کے دو ٹکٹ میرے ہاتھوں میں آ گئے۔ تین بجے ایئر پورٹ پہنچ جایئے۔ ہاں اگر آپ نے آج جیسا طرز عمل کل بھی اپنایا تو مجھے امید ہے جہاز میں سوار ہو جائیں گی۔

زیدی صاحب مسکرا رہے تھے۔

میں نے باقاعدہ سیلوٹ تو نہیں مارا۔ پر سیلوٹ جیسے انداز میں شکریہ ضرور ادا کیا۔

شفقت میری میری پھوپھیری بہن ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ سمن آباد گرلز کالج کی یہ لیکچرار اس مہم میں اس بار میرے ساتھ تھی۔ گلگت شفقت کی جنم بھومی نہیں۔ پر اس کے منے منے پاؤں نے اسی سرزمین پر چلنا سیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں نے درختوں سے لٹکتے سیبوں' خوبانیوں اور باداموں کے نظارے سب سے پہلے یہیں کئے تھے۔ اس کے بچپن کا ایک حصہ اپنے تایا ابو' تائی اماں اور عم زاد بہنوں کوثر اور عفت کے ساتھ یہیں گزرا تھا۔

وہ میرے ساتھ پرانی یادوں کے زیادتی مشن پر نکلی تھی۔

میں شکر الحمد اللہ کا ورد کرتی باہر نکل آئی۔

خدا جانتا ہے گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے میں امید و بیم کی جس سولی پر چڑھی ہوئی تھی۔

اس نے میری تمناؤں، منصوبوں اور عزائم کی تکا بوٹی کرڈالی تھی۔

اخراجات کے کوہ گراں کو اٹھانے میں تھوڑی سی مدد ادارہ امور پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب الطاف حسن قریشی نے کی۔ میں نے رخت سفر باندھنے کا کبھی اہتمام نہیں کیا۔ چھوٹی سی بقچی بغل میں دابی۔ جوتا پہنا چادر اوڑھی اور مارکوپولو کی راہ ناپنے کے لئے تیار۔

جس صبح اسلام آباد کے لئے روانہ ہونا تھا۔ بیٹی نے چادر سر پر سے کھینچی اور صبح کا اخبار نتھنوں میں گویا ٹھونستے ہوئے کہا۔

اخبار پڑھ لیں ذرا۔ پھر جائیں۔

فوراً اخبار پر نظریں دوڑائیں۔

''یا خدا'' میں نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

گلگت میں فرقہ وارانہ فسادات کی خبر تھی۔ پچاس آدمیوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔ گلگت اور اس کی وادیاں پر امن علاقہ مخلص اور پیار کرنے والے لوگ ''الٰہی'' انہیں کس کی نظر کھا گئی؟ یہ کیوں خون خرابے پر اتر آئے؟ اخبار میں واقعات کی تفصیل نہیں تھی۔

میں نے جوتی کے تسمے کھول دیئے۔ بیگ کندھے سے اُتار کر الماری میں رکھ دیا۔ میرا دل اور دماغ بوجھل تھے۔ جی چاہتا تھا ابھی اور اسی وقت اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ لیکن غلامی کی جن زنجیروں نے پاؤں جکڑ رکھے ہیں وہ بھلا ایسے حالات میں حرکت کرنے دیتیں۔ دل مسوس کر بیٹھ گئی۔ دن چڑھتا تو سب سے پہلا کام اخبار کے صفحات پر گلگت سے

متعلقہ خبروں کی تلاش ہوتی۔

پورا ماہ گزر گیا۔ جب میاں کو اطمینان نصیب ہوا۔ تب پروانہ راہداری ہاتھ آیا۔ شفقت اور میں بگٹٹ بھاگے۔ پنڈی پہنچ کر احساس ہوا کہ آسمان سے گر کر کھجور کے جس درخت میں اٹکے ہیں وہ نوکیلا اور ایسا گھنا ہے کہ جکڑ کر بیٹھ گیا ہے۔ جہاز کی کسی بھی فلائٹ سے اگلے ایک ماہ تک سیٹ ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

بہر حال میں نے ہن لوٹ لیا تھا۔

صبح تین بجے جب شہر پر ہُو اور سناٹے کا راج تھا۔ میں اور شفقت اسلام آباد کی ویران سڑکیں اپنے پاؤں سے کوٹ رہی تھیں۔

اسلام آباد ہوٹل کے عین سامنے بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے میں نے فضا پر چھائے اندھیرے کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

''ٹیکسی والا آج کھال اُتار کر رکھ دے گا''۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس مٹیالے اندھیرے میں ایک وین آ کر ہمارے پاس رُکی۔ درمیانی عمر کے مرد نے شیشے کو کھینچتے ہوئے کھڑکی سے گاڑی باہر نکال کر ہمیں دیکھا اور پوچھا کہاں جانا ہے؟ ائیرپورٹ کا سُن کر اس نے سر اندر کر لیا۔ کچھ دیر سوچا۔ پھر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اجنبی انسانوں پر اعتماد کرنے کے سلسلے میں خاصی جلد باز ہوں۔ صد شکر کہ اس بھری پُری دنیا میں بکھرے ہوئے لوگوں کی طرف سے مجھے کبھی پچھتاوا نہیں ملا۔ میں بے دھڑک دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ شفقت نے میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے اسے تقریباً کھینچتے ہوئے سرگوشی میں کہا ''خدا پر توکل رکھو''

سارا راستہ وہ لرزتی سی رہی۔ میں بظاہر اعتماد سے باتیں کر رہی تھی۔ پر اندر میرا بھی خوف زدہ سا تھا۔ ائیرپورٹ کی جگمگاتی روشنیوں میں جب اس مہربان شخص نے ہمیں

خدا حافظ کہا۔تب بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

''یہ ملک یہ دنیا شاید تم جیسے نیک لوگوں کے دم قدم سے ہی آباد ہے۔''

چمکتے دمکتے ائیر پورٹ کی اندرون ملک پروازوں والے حصے میں تقریباً سناٹا تھا۔ کیبن میں کام کرتی دو خوبصورت دوشیزاؤں کو اپنی رام کہانی سناتے ہوئے میں نے خود پر ترس کھایا۔ کیونکہ ان کی خوبصورت آنکھوں میں بے نیازی اور بے زاری کی کیفیات کا امتزاج کچھ یوں چھلک چھلک پڑ رہا تھا جیسے کہتا ہو۔

چانس پر آنے والے مسافر ایسی ہی فضول اور بے ربط کہانیاں سناتے ہیں۔''

اس عزت افزائی کے بعد میں ائیر پورٹ کی مسجد کی طرف بھاگی۔شفقت میرے تعاقب میں تھی۔اللہ کو اپنا وکیل بنا کر سارا معاملہ اس کے سپرد کیا اور چانس کے علاقے میں جا کر بیٹھ گئیں۔ساڑھے پانچ بجے مسافر اندر جانے لگے۔

میرے پاؤں میں پھر پہیئے لگ گئے تھے۔اب فلائٹ انچارج اسد صاحب سے واسطہ پڑا تھا۔خدا گواہ ہے ساڑھے پانچ سے سوا چھ تک ان کا نتھنوں میں دم کر ڈالا۔

اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے پتہ نہیں کتنی اہم سفارشوں کو پیچھے ڈال کر انہوں نے ہمیں جہاز میں سوار کرایا۔

فوکر میں کیا بیٹھے۔شفقت کے حافظے کے کسی کونے میں پڑی یادوں کی پٹاری سے یادداشتوں کے حسین اور خوش رنگ سانپ پھن اٹھا اٹھا کر سپ سپ کرتے باہر آنے لگے تھے۔

تب اس روٹ پر فوکر تھوڑی چلتے تھے۔ہاورڈ اڑتے جن کی بلندی نو دس ہزار فٹ سے زیادہ نہ ہوتی۔چک لالہ سے جہاز میں بیٹھتے۔بابوسر کی چوٹیوں پر اتنی دھند اور کہر کے ایسے دبیز بادل ہوتے کہ جہاز واپس مڑ جاتا۔اترتے تو معلوم ہوتا جہاں سے چلے تھے وہیں آ پہنچے۔تب کوثر اور عفت منہ بسور بسور کر رونا شروع کر دیتیں۔

وہ جیالا پائیلٹ مجھے کبھی نہیں بھولے گا جو ایک بار خراب موسم کے باوجود جہاز کو سوات پر سے اڑاتا ہوا چترال لے گیا اور پھر شندھور درے میں سے نیچی پرواز کرتا ہوا گلگت پہنچ گیا۔

میری ناک شیشے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ نانگا پربت کی چوٹیاں' چلاس شہر' دریائے سندھ کے کناروں پر تجریدی آرٹ کے نمونے اور پھر گلگت کی خوبصورت وادی کا رن وے۔ہم نے شوق اور وارفتگی سے فضا کو دیکھا۔

ہمارے اس خوشگوار سفر کو ختم ہوئے ابھی پندرہ منٹ بھی نہ ہوئے ہونگے۔ آنکھیں ننگے بچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے سرکتی وادی کے کھیتوں میں کھڑی سنہری گندم کی خوشنما بالیوں کے نظارہ حسن سے پوری طرح سیراب بھی نہ ہو پائی تھیں جب ائیرپورٹ روڈ پر شاہ بلوط کے شاداب درختوں کے نیچے شفقت رپھڑ ڈال بیٹھی تھی۔وہ کشروٹ محلے میں میرے پرانے مسکن پر جانے کی بجائے اوپر پریذیڈنسی میں اس گھر میں داخل ہونا چاہتی تھی جہاں اس کا اور اس کی عمر زادوں کا بچپن گزرا تھا۔

''کوئی بیلنے میں بازو آ گیا ہے جو وہاں بھاگتے جائیں۔تیرا کونسا وہاں کوئی بیٹھا ہے جسے دیکھ کر تو نے آنکھیں ٹھنڈی کرنی ہیں۔

یادوں کے دیئے ہی تو جلانے ہیں وہ کسی وقت بھی وہاں جا کر جل سکتے ہیں۔ ابھی تو وقت نہیں مجھے فوراً عثمان صاحب سے ملنا ہے۔

''چلو''

اس نے چلو کا یہ طنزیہ ہنکارہ جس انداز میں ادا کیا اس نے میرے سینے پر تیز نہیں چھریاں چلائیں۔ابھی میں جوابی حملے کا سوچ ہی رہی تھی جب اس نے پٹاخہ بم چھوڑا۔وہ تو مجھے پہلے ہی کہتی تھی۔وہ کا اشارہ اس کی عم زادونکی طرف تھا۔مت جاؤ' کتے کی طرح دم ہلا کر پیچھے چلنا پڑے گا۔

''مائی فٹ''

میں دھاڑی'اس کا بیگ جو میں نے پکڑا ہوا تھا اُسے ایک گیند کی طرح فضا میں اُچھالتے ہوئے رخ پھیر کر میں نے اپنی ایڑی سے ایڑی بجاتے ہوئے گویا خود سے کہا۔

بائی دی لیفٹ کوئیک مارچ(By the Left Quick March)

غصہ پی جانے اور اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا یہ ایک مجرب آزمودہ نسخہ ہے۔ بیچاری سڑک میرے عتاب کو سہہ رہی تھی۔ بہت آگے جا کر مجھے تعاقب میں اس کے بھاگنے اور پکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔

غلام محی الدین صاحب کے گھر کا برآمدہ سنسان تھا۔ چارپائی ضرور بچھی تھی۔ لیکن اس پر بیٹھنے اور لیٹنے والی شہرخموشاں کی باسی بن گئی تھی۔ سبز اوڑھنی والی خاتون دوم اسی طرح چپ چاپ پر چھاؤں کی مانند گھومتی پھرتی نظر آئی تھی۔ سارہ فرگوسن بیاہ کر پیا گھر چلی گئی تھی۔ چھوٹی لڑکی نے البتہ مہمان نوازی کا حق ادا کیا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے میں گھر سے نکلی۔ شفقت نے انکار کر دیا تھا۔

''سوؤں گی بھئی۔تم جاؤ اپنے کام نپٹاؤ''۔

شہر کی فضا رنجوری تھی۔ حالات کو نارمل تھے۔ مگر اثرات کے زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ دوکانیں کھلی اور کاروبار جاری تھا۔ لیکن دوکانداروں کا کہنا تھا کہ بزنس معمول پر نہیں ہے۔ خرید وفروخت کی شرح میں بہت کمی ہے۔ نیچے سے لوگوں کی آمد کم ہے۔

عثمان صاحب ڈگری کالج میں بی اے اور بی ایس سی کے امتحان لے رہے تھے۔ ڈگری کالج دینور میں ہے۔ آدھ گھنٹہ سواری کے انتظار میں کھڑی رہی۔ خدا جانے ویگن کہاں سُوکھنے پڑی ہوئی تھی۔ ایک پرائیوٹ گاڑی کو ہاتھ دیا۔ اندر خیر سے تحصیلدار صاحب تشریف رکھتے تھے۔ مدعا جان کر فوراً اُٹھایا اور دلچسپ گفتگو سے محظوظ کرتے ہوئے منزل پر

پہنچا دیا۔ڈگری کالج کی عمارت دیدہ زیب تھی۔عثمان صاحب نے دیکھتے ہی نیم ایستادہ ہو کر چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ بکھیرے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ پہنچ ہی گئیں''۔

میرے ہونٹوں نے نہیں مسکراہٹ نے چہرے پر پھیل کر اس کا جواب دیا تھا۔

پردے کے پیچھے بڑی بڑی چادروں میں لپٹی' امتحان دیتی جن بارہ تیرہ لڑکیوں سے میرا تعارف ہوا۔وہ طلبہ کی اُس کلاس سے نظر آتی تھیں جو امتحان کو ہوّا سمجھتے ہیں۔جن کی پیشانیاں تر اور ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہوتی ہیں۔

ساڑھے بارہ تک عثمان صاحب نے اپنا کام بھی سمیٹ لیا تھا اور مجھ سے میرے پڑاؤ اور مکینوں کے بارے میں بھی جان لیا تھا۔

جس وقت جیپ ڈگری کالج سے نکلی۔میں نے دھوپ میں تپتے ہوئے دینور کے پہاڑ اور زمین دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔سورج کی جوانی نے فضا کو جھلسا دیا تھا۔پرانے پولو گراؤنڈ کے اوپر سے ہوتے ہوئے خزانہ روڈ پر آئے۔

عثمان صاحب نے کچھ کام کرنے تھے۔انہوں نے معذرت کی۔میں ہنس پڑی۔

''عثمان صاحب آپ فضول شرمندہ ہوتے ہیں۔میری آنکھیں تو اپنا کام کرنے میں جتی ہوئی ہیں''۔

ایک بج کر سات منٹ پر میں اپنے پرانے پڑاؤ پر اُتری۔طے یہ ہوا تھا کہ عثمان صاحب ہمیں چار بجے اپنے ہاں لے کر جائیں گے''۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں کے موڑ کاٹتی جب میں اپنے پرانے گھر میں داخل ہوئی تو حیرت زدہ سی رہ گئی۔جب ہم لوگ آئے تھے مہمان داری والے کمرے میں مقامی پٹو بچھا تھا۔

لیکن اس وقت نہایت خوبصورت دخوش رنگ دسبز قالین کمرے کا حسن بڑھا رہا

تھا۔سفید گاؤ تکیے اور بیل بوٹوں والے سرہانوں سے ٹیک لگائے گوری چٹی دلکش خدوخال والی شفقت علوی نیم خمیدہ غلام محی الدین صاحب سے قہوے کی پیالی پکڑ رہی تھی یوں جیسے قدیم چین کی عظیم ملکہ زوسی کے حضور شہنشاہ چین کا دست راست این ٹی لائی جھکا ہوا ہو۔

دروازے میں کھڑے کھڑے میں نے اس دل موہ لینے والے منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچا۔

''یا اللہ یہ خوبصورت ہونا بھی کیسا حسین تجربہ ہے؟''

لیکن زم و دبیز قالین پر بیٹھ کر میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ارے شکر ہے کوجے (بدصورت) سے ہیں۔خوبصورتی کے ساتھ ان شتر بے مہار جذبوں کا کیا کرتے جو نئی اور اجنبی جگہوں کو دیکھنے کے لئے سینے میں اُمڈ اُمڈ پڑتے ہیں۔

کھانا کھا کر آرام کا موقع نہیں ملا۔اردگرد گھروں کی لڑکیاں آ گئی تھیں۔میٹرک اور انڈر میٹرک لڑکیاں جاپانی کپڑوں میں ماتھے پر کٹے بالوں کے ساتھ شادی بیاہ کی کھلی کھلی باتیں کرتی تھیں۔گلگت میں لڑکیوں کی آزاد خیالی قابل رشک تھی۔

ساڑھے چار بجے عثمان صاحب تشریف لائے۔شاہراہ قائداعظم پر مجینی محلے کی ایک تنگ سی گلی میں جیپ داخل ہو کر کھلے میدان میں رک گئی۔مجینی گلگت کا وسطی محلّہ جہاں کشمیریوں کی اکثریت ہے۔

چھوٹی سی کھال زوروں پر بہتی تھی۔دونوں اطراف خوبصورت گھر تھے۔کھال کے موڑ سے چند گز پرے خالی کھیتوں کے بالمقابل عثمان صاحب کا آشیانہ تھا۔

دروازہ کھلا۔کوہستانی اینٹوں سے تعمیر شدہ گھر جس کے کشادہ آنگن میں اُگے مکئی کے کھیت سے اٹھتی وہ میٹھی سی باس پیشوائی کے لئے آگے بڑھی تھی۔جو دوپہر کی حرارت جذب کرنے کے بعد فصلیں شام کی خنکی کے زیر اثر آ کر چھوڑتی ہیں۔زور زور سے سانس کھینچتے ہوئے میں نے یہ دیہاتی خوشبو ساری کی ساری اپنے نتھنوں میں گھسیڑنی چاہی تھی۔

برآمدے سے نیچے کچے فرش پر عثمان صاحب کا پریوار استقبال کے لئے کھڑا تھا۔
مسز عثمان کے ڈوپٹہ اوڑھنے کا انداز اس مثالی مسلمان عورت کا سا تھا جو سر کا ایک بال ننگا کرنا گناہ کبیرہ خیال کرتی ہے۔ جپھی ڈالنے کے عمل میں محبت کی مسحور کن مہکار کا احساس ملا تھا۔
بیٹیوں کے معاملے میں عثمان صاحب خاصے مالدار ہیں۔ ہر عمر اور ہر سائز کی لڑکی موجود تھی۔ بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ کر کمرے کی دیوار کے ساتھ بچھائی گئی دو ڈھائی گز لمبی اور تقریباً پون گز چوڑی پھولدار رضائی نما گدے پر بٹھایا گیا۔

چائے ذائقہ دار تھی۔ پی کر لطف آیا۔ لڑکیاں خاصی بے تکلف اور محبت کرنے والی تھیں۔ اردگرد بیٹھی شوق سے باتیں کرتی اور سنتی تھیں۔ کچھ دیر بعد میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دھوپ وادی کے کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں سے بوریا بستر سمیٹ کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ گزین ہوگئی تھی۔ بڑا دل کش منظر تھا۔ دکنی ہوائیں برآمدے میں پکتے کھانوں کی خوشبو اڑائے پھر رہی تھیں۔ دور کہیں اذانیں گونج رہی تھیں۔ اور مجھے کوئی ٹیلی فون پر بلاتا تھا۔

اسسٹنٹ کمشنر گلگت داؤد صاحب پوچھتے تھے۔

''کیسی ہیں؟ کب آئیں؟ کہاں ٹھہری ہیں''؟

داؤد صاحب سے ملاقات شگر وادی کی سیاحت کے دوران ہوئی تھی۔ عثمان صاحب کے دوست تھے۔

بالترتیب جوابات سے فارغ ہوکر میں نماز کے لئے کمرے میں بچھے مصلے پر کھڑی ہوگئی۔ دُعا کے بعد دیکھا مسز عثمان پاس بیٹھی ہیں۔ مسز عثمان دھیرے دھیرے باتیں کرتی تھیں۔ وہ باتیں جن کے الاؤ میں جل جل کر وہ کندن بنی تھیں۔ ہر اس صابر عورت کی طرح جو اپنا آپ تنتناتے وقت کی آگ میں راکھ کرکے ایثار و وفا کی تاریخ میں نئے باب رقم کرتی ہے۔ بہت دور بیٹھی مجھے اپنی پھوپھی (جمع ممانی) یاد آئی تھیں۔ شفقت علوی کی

ماں جس کی ساری زندگی شوہر، ساس اور نندوں کے پاؤں تلے اپنے ہاتھ رکھتے گزری تھی۔

کھانا پرلطف تھا۔گلگت کی بجلی چھوٹے بچے کی طرح شرارتیں کرتی تھیں۔ابھی آئی ابھی گئی۔ادیبہ نے ہنگامی لائٹ جلا دی تھی۔سلاد کی پلیٹ میں گھر کی کیاریوں کا اگا ہوا سبز دھنیا بہت ذائقہ دے رہا تھا۔

مجھے ادیبہ کا سلاد بنانے کا یہ نیا انداز اتنا بھایا تھا کہ واپس آ کر جب میں نے یہی طریقہ اپنایا اور دھنیے کی بھینی خوشبو سے نہال ہوتے ہوئے میاں کی طرف دیکھا تو صلواتوں کی بوندا باندی کا سامنا کرنا پڑا۔تب میں نے سارا دھنیہ چن کر اپنی پلیٹ میں بھر لیا اور مسز عثمان کے گھر کی دعوت کا تصور کرتے ہوئے کھانا کھایا اور مزہ پایا۔

مسٹر و مسز عثمان کے گھر پانچ چھ گھنٹوں میں مجھے ایک عجیب سے تاثر کا احساس ملا۔میں نے کوئی تین بار ان نایاب و نادر کتب کو دیکھنے کا اظہار کیا جن کے لئے میں نے یہ پینڈے مارے تھے۔پر عثمان صاحب تھے کہ گھاس ہی نہیں ڈال رہے تھے۔

ہمارے ٹھہرنے کا انتظام ایجوکیشن کالج کے ہوسٹل میں کیا گیا تھا۔رات کے نو بجے گلگت کی مضافاتی وادی دینور کی اونچائیوں پر چڑھنے میں خاصی دشواری ہوئی۔بجلی حسب معمولی غائب تھی۔ایمرجنسی لائٹ میں عمارت کا پھیلاؤ اور حسن تو نظر نہیں آیا۔البتہ مختلف کوریڈورز کے آگے سے گزرتے ہوئے یہ ضرور احساس ملا تھا کہ پھول پھلواری کی خاصی بہتات ہے۔

جائے مقام پر پہنچ کر عثمان صاحب رخصت ہوئے۔صد شکر کہ تھوڑی دیر بعد بجلی آ گئی۔صاف ستھرا کمرہ جس میں دو بستروں پر سفید براق چادریں بچھی تھیں۔ایک چھوٹا سا سٹور بھی ساتھ تھا۔بستے رستے بھرے پرے مکینوں سے خالی گھروں یا جگہوں کا جائزہ لینے کا تجسس عین فطری جبلت ہے۔میں نے دیکھا تھا دیٹ۔جے۔ن ۹۵ کی سالم شیشی اوپر چھوٹی سی پچھتی پر پڑی تھی۔

''لو بھلا یہ میرے کس کام کی''؟ میں بڑبڑائی۔

خضاب کی پوری دوشیشیاں سر میں تھوپ کر گھر سے چلی تھی۔دس پندرہ دن تو گزر ہی جائیں گے۔بائیں کونے میں تبت سنو متانت سے بیٹھی تھی۔میں نے کریموں سے اپنی خشک جلد کی لیپا پوتی کبھی نہیں کی۔ایک دوبار جب کی تھی تو کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے چوہیا آٹے کے کنستر میں سے نکلی ہے۔

چائے کی پتی کا پورا بنڈل پڑا تھا۔تلاش بسیار کے باوجود بھی مجھے چینی اور دودھ نظر نہیں آئے تھے۔ٹریٹ بلیڈ بھی بیکار تھے۔

زیر تربیت اساتذہ کے کمروں سے ان سے زیادہ چیزوں کی توقع کہاں کی جاسکتی ہے؟

میں کمرے میں آگئی۔شفقت بیڈ پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔پنکھا چلتا تھا اور گرمی کچھ اس انداز کی تھی جیسے تنور میں جلنے کے لئے لکڑیاں ڈال دی گئی ہوں۔جالی کی کھڑکی میں سے دینور کے پہاڑیاں اڈے پڑ رہے تھے جیسے گلے ملنے کے لئے بے تاب ہوں۔دن بھر سورج سے عشق ومحبت کی جو پینگیں بڑھاتے رہے تھے اب اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا تھا۔

میرا جی چاہا۔بستر کو لپیٹ کر بغل میں دباؤں۔چارپائی اٹھاؤں اور سیدھی چھت پر پہنچ جاؤں۔

''چلو ذرا باہر کا چکر لگائیں۔کچھ تو ہوا کھانے کو ملے گی۔''شفقت نے کہا۔

چپکی لیٹی رہو۔باہر لڑکے ہیں۔یوں بھی جگہ سے نامانوس ہیں۔کہیں گئے کوڑے نہ تڑوا بیٹھیں اور لینے کے دینے پڑ جائیں''۔

نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔شفقت سوگئی تھی۔پر میں جاگ رہی تھی اور سوچتی تھی کہ آخر عثمان صاحب نے وہ نادر کتابیں مجھے کیوں نہیں دکھائیں۔

دفعتاً یاداشتوں میں کہیں برق سی کوندی۔انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں مکینکل انجینئرنگ کا وہ طالب علم خوبصورت اور پیارا سالڑکا مسعود اقبال جو بونجی سے تھا۔ایک ٹھٹھرتی ہوئی سرد شام کو وہ میرے کزن شفقت رُسول علوی کے ساتھ میرے گھر آیا تھا۔ علوی اسے گھسیٹ کر لایا تھا۔

''یار چلو میری بہن تمہارے علاقے پر لکھ رہی ہے۔اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے''۔

دبلا پتلا مسعود اقبال''بلورستان''(شمالی علاقہ جات کا قدیمی نام)ضخیم رسالہ بغل میں دبائے مجھ سے ملنے آیا۔چائے کی میز پر مستقبل کے اس انجینئر کو میرے چھوٹے بیٹوں نے بہت شوق اور محبت سے دیکھا۔باتوں باتوں میں عثمان صاحب کا ذکر خیر آیا۔مسعود نے کہا۔

''میرے استاد ہیں وہ۔بہت شفیق اور محبت کرنے والی شخصیت'نہایت محترم اور معزز۔

''لیکن''

میں نے فوراً چائے کا کپ ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے حیرت سے کہا

''لیکن کیا''

کتابوں کے سلسلے میں وہ بہت محتاط ہیں۔بخیل کہہ لیں۔زیادہ وضاحت میں جاؤں تو کمینگی کا نام آجائے گا۔

عثمان صاحب کی شخصیت میں جو رچاؤ اور نرمی مجھے محسوس ہوئی تھی اس کے پیش نظر اس بات نے مجھ پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔میں تو آس لگائے بیٹھی تھی کہ جونہی میں ان کے گھر میں داخل ہوں گی۔انکی کتابوں کی الماری کھل جا سم سم کی مثال دہرائے گی۔

پر ایجوکیشن کالج کے ہوسٹل کے اس کمرے میں اچانک مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ

مسعود اقبال ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے فوراً ملامتی ہتھیاروں سے عثمان صاحب کو زدو کوب کرنا شروع کردیا۔ابھی میرا کلیجہ گرم ہی تھا جب اندر سے آواز اٹھی تھی۔

''اپنے گریبان میں تو جھانک لو۔تم تو خود کتابوں کے سلسلے میں اول درجے کی کمینی ہو۔ہمیشہ تمہاری الماری کی چابی گم ہی رہتی ہے''۔

میں اپنے اندر سے اٹھتی اس سچی آواز کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔بھرے پرے کنبے والے گھرانوں میں جہاں دیورانیوں' جٹھانیوں' ساس نندوں کے درمیان کبھی کبھار چینی' پتی' مرچ ہلدی اور آٹے دال جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تھڑ دلی کے مظاہرے ہوتے ہیں۔میں ان سے بچی ہوئی تھی۔پر میری کم ظرفی اس وقت سامنے آتی تھی جب کوئی دیورانی مجھ سے کوئی کتاب مانگنے کے لئے آتی۔گھر داری سے متعلق ہر چیز کے سلسلے میں فیاض میرا دل اس وقت اتنا سکڑ جاتا کہ جی اسے جھانپڑ لگانے کو چاہنے لگتا۔

عثمان صاحب بیچارے کہاں قصور وار تھے؟

مطمئن ہو کر میں نے آنکھیں موند لی تھیں۔

صبح سویرے کوہستانی حسن نے آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔کالج کی عمارت دیدہ زیب تھی۔طلبہ کی اکثریت گھروں کو سدھاری ہوئی تھی۔ایک ٹولہ نیچے تربیتی کورس پر گیا ہوا تھا۔ جس لڑکے نے ناشتہ کروایا وہ نگر کا تھا۔اس نگر کا نہیں جہاں بقول خوشی محمد ناظر کے چور بستے ہیں۔

کسی خوش قسمت ماں کا راج دلارا ہوگا۔سچی بات ہے ایسا رعنا جوان تھا کہ مجھ جیسی اگر کہیں جوانی میں دیکھ لیتی تو انگلیاں ہی کاٹ لیتی۔

☆☆☆

باب:15

بسمین اور نوپورہ کی تہذیبی جھلک
بدھ عقیدت مندوں کے شاہکار

دن کا پروگرام میں نے اپنی مرضی سے ترتیب دیا۔ سرفہرست کارگاہ نالہ کی سیر تھی۔ شفقت نے چپ چاپ پیچھے چلنے میں عافیت خیال کی۔

ذرا بھی انتظار کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ سڑک پر قدم رکھے اور ویگن نے رک کر دروازے کھول دیئے۔ ڈرائیور لڑکے سے بات کی۔ اس نے جواب میں کہا۔ جوبلی ہوٹل سے آپ کے اُوپر جانے کا بندوبست ہو جائے گا۔

مطمئن ہو کر میں نے باہر جھانکا۔ گندم کے کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں کو دیکھا۔ یادگار چوک پر نظر پڑی۔ بازار کا تھوڑا سا نظارہ ہوا اور جوبلی ہوٹل آ گیا۔

کرایے وغیرہ کے معاملے میں ذرا چخ چخ نہیں ہوئی۔ سوزوکی ڈرائیور نے نہایت معقول دام مانگے تھے۔

ڈرائیور نے گاڑی مغرب کی طرف موڑتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا کیونکہ میں نے کہا تھا

''یہ تو بنیال روڈ ہے''۔

''بسین چلنا ہے۔ پہلے نوپورہ کا بت دیکھئے۔ ایسی نادر اور تاریخی شے آپ نے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔ میں نے مصر میں ابوالہول کا بت دیکھا ہے۔ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اے کاش اہرام مصر کو دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک قرار دینے والوں نے اسے بھی

دیکھا ہوتا۔

میں نے حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔

''تم مصر کس سلسلے میں گئے تھے''۔

اور ہنستے ہوئے وہ بولا۔

''اسی پیٹ کے چکر میں۔سارا مشرق وسطی روند ڈالا ہے''۔

''خوب۔میں بھی ہنسی۔تب تو تمہاری معیت میں اس سیر کا لطف دو چند ہو جائے گا''۔

کارگاہ نالے کو چیختے دھاڑتے دیکھ کر جانے مجھے دردزہ میں مبتلا ماں کیوں یاد آئی تھی؟ یہ پراسرار سانالہ دو ڈھائی سو میل کی دوری سے بلند وبالا پہاڑوں کے سینے پر مونگ دلتا اتراتا اٹھلاتا دھاڑ دھاڑ کرتا یہاں پہنچتا ہے۔پھر کچھ آگے جا کر دریائے گلگت میں مل جاتا ہے۔

میں نے ملحقہ پگڈنڈی کے کنارے پر کھڑے کھڑے اپنے جسم کے ہر مُو کو خوف و دہشت سے سنسناتے ہوئے محسوس کیا تھا۔شفقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دو چار تھی۔اس کے بہاؤ کا انداز کسی زخمی ناگ کا سا تھا جس کا بس نہیں چلتا کہ وہ حملہ آور کی کیسے تکا بوٹی کر ڈالے۔

میں ذرا آگے جانا چاہتی تھی۔مگر رک گئی کہ ڈرائیور نے کہا تھا۔

''یہ غلطی کبھی مت کریں کہ یہ کبھی کبھی ہزاروں ٹن پتھر اپنے ساتھ بہا لاتا ہے''۔

سچ تو یہ تھا کہ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ایسا بے ہنگم شور مچا رہا تھا کہ اب رگوں میں خون کا جماؤ محسوس ہونے لگا تھا۔

سردیوں میں اس کی کیفیت اس بوڑھی نائیکہ کی سی ہے جس کی جوانی بڑی ہنگامہ خیز گزری ہو اور بڑھاپے نے اسے کھڈے لین لگا دیا ہو۔یہ بھی برف سے اٹا خاموش پڑا رہتا

ہے۔جو جی چاہے اس کے ساتھ کرو۔کدکڑے لگاؤ بھاگو ناچو۔

نالے کے دہانے پر ہی موڑ پر وہ تیس فٹ اونچی چٹان ہے جس پر گوتم بدھ کا نو فٹ لمبا مجسمہ تراشا گیا ہے۔جسے مقامی زبان میں پچھنی کے نام سے پکارتے ہیں۔

''یا اللہ''۔شفقت نے بے اختیار کہا تھا۔

''گوتم بدھ کے چاہنے والوں کو خراج تحسین پیش نہ کرنا کس قدر زیادتی ہوگی جنہوں نے جان ہتھیلیوں پر رکھ کر جانے کیسے دیو قامت مجسمے کو تراشا ہوگا۔

میں گم سُم اس نرالے اور لافانی شاہکار پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

''کیسی ستم ظریفی ہے کہ ونچی کے لیونارڈو کی چار سال کے عرصے میں بنائی گئی تاریخی تصویر ''مونالیزا'' کے بارے میں دنیا رطب اللسان ہے۔مائیکل انجلو کی سنگ تراشی کی چاروں کھونٹ دھوم ہے۔ساٹھ ستر گز پر پھیلا ہوا ابوالہول کا بت جس کے اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر فرق نہیں عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔

لیکن پانی میں جھکی ہوئی اس بلند ترچھی اور نہایت خطرناک چٹان پر فنکارانہ چابکدستی سے پوری چٹان کی تراش خراش کر کے سنگ تراشی کا جو شاہکار وجود میں لایا گیا ہے۔ہم پاکستانی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو باہر کی دنیا سے کیا توقع رکھیں؟ کہ وہ ہمارے وطن کے ایسے لازوال شاہکاروں کے بارے میں بھی کچھ جانیں۔

ایسے مجسمے شمالی علاقوں میں کئی مقامات پر دیکھے جا سکتے ہیں۔نو پورہ کا یہ مجسمہ پرانے وقتوں میں شمال سے آنے والے زائرین کے لئے خیر و برکت اور خوش آئند علامت تصور کی جاتی تھی۔بہر حال یہ بات حیران کن تھی کہ ایسی پر خطر جگہوں پر بنانے والوں نے کس حوصلے اور جرات سے کام کیا ہو گا؟ اس تپسیا میں جانے کتنے سال صرف ہوئے ہونگے؟

وہاں کھڑے کھڑے مجھے خیال آیا یہ بدھ مت کب ان دشوار گزار جگہوں پر

پھیلا؟ ڈرائیور دنیا چشیدہ ضرور تھا پر تاریخ سے بے بہرہ تھا۔ میرے ذہن میں اٹھتے اس سوال کو مطمئن نہ کر سکا۔ بعد میں جب جناب عبدالحمید خاور کی تحریروں سے شناسائی ہوئی تو پتہ چلا کہ پانچویں صدی عیسوی میں ان علاقوں میں بدھ مذہب نے عروج پکڑا۔ اس زمانہ میں بے شمار خانقائیں اور دارالعلوم قائم ہوئے۔ داریل میں عقیدت مندوں نے مہاتما بدھ کا ۹۴ فٹ طویل چوبی مجسمہ بنایا۔ اس پر سونے کی پتریاں چڑھائی گئی کی تھیں۔ اس کی زیارت کے لئے دُور دُور سے چین اور تبت کے زائرین آتے تھے۔

بہر حال ماضی کی اس لافانی یادگار کے حضور کمال فن کی داد دیئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا تھا۔ آنکھیں ہنوز اس پر جمی ہوئی تھیں اور پیچھے ہٹنے سے انکاری تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ سورج کی کرنیں سر کو جلائے جا رہی تھیں۔ لیکن اس کی پرواہ نہیں تھی۔

نوپورہ گاؤں سے متصل ذرا اوپر کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں محکمہ آثار قدیمہ کی ایک ٹیم کو چوبی صندوقوں میں بند بھوج پتر کے کئی ضخیم مخطوطات ملے تھے۔ بدھ کے مجسمے دیکھی اور خوبصورت ٹائلیوں سے مزین فرش برآمد ہوئے۔ لیکن ان قدیم قومی یادگاروں کو سنبھال کر نہ رکھا گیا۔

نوپورہ کا قدیمی محل ''ہاپوکر'' پہاڑوں پر بنا ہوا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے لئے سڑک تھی۔ سڑک کے نشانات اب بھی نظر آتے ہیں۔ شاہی محل سرا کے ساتھ بڑے بڑے تالاب بھی بنے ہوئے تھے۔

''نوپورہ کی قدیم تہذیب۔''

رہے نام اللہ کا' میں نے بہت لمبی سانس بھری تھی۔

ہر چیز کو فنا ہو جانا ہے۔ یہ وقت، یہ لمحات، ہم، ہمارے وجود، ہماری باتیں، آوازیں، پتہ نہیں کہاں کہاں بکھر جائیں گی۔

کچھ فاصلے پر ایک خوفناک قسم کے پہاڑ کے ڈھلانی حصے پر ایک غار کسی خوفناک

اژدھے کی مانند منہ کھولے ہوئے تھا جیسے کسی سالم بندے کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہو۔ پتہ چلا تھا یہ واقعی اژدہا ہے اس نے بے شمار سیاحوں، مہم جوؤں، بہادروں اور جی داروں کو یوں سالم نگل ڈالا تھا کہ آج تک ان کی کوئی ہڈی، کپڑے، جوتے کا کوئی ٹکڑا یا اُس سامان کا کوئی حصہ جیسے وہ اپنے ساتھ لے کر گئے تھے ملا ہو۔

ڈرائیور بتا رہا تھا آج تک کوئی یہ بھی نہیں جان سکا کہ یہ اندر سے کتنا بڑا اور گہرا ہے۔ بڑی خوفناک قسم کی کہانیاں مشہور ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غار کے ایک حصے پر چڑیلوں اور خون آشام چمگادڑوں کا قبضہ ہے۔ جونہی بدقسمت لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے عتاب کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ بعض یہاں دیوؤں اور جنوں کی موجودگی بتاتے ہیں۔

اس پُراسرار سے ماحول میں ایسی خوفناک باتیں سنتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ''بریم اسٹوکر'' کا کاؤنٹ ڈریکولا ویمپائر (انسانی خون چوسنے والی بلا) بنا ہزاروں میل دور سے اس غار میں آ کر یہاں قابض ہو گیا ہے۔ جونہی بدقسمت سیاحوں کا کوئی ٹولہ اس میں داخل ہوتا ہے۔ وہ سب سے آگے والے کو چمٹ کر اس کا خون چوس لیتا ہے۔ مرنے والا بھی اسی وقت ویمپائر کا روپ دھار لیتا ہے۔ نتیجتاً غار بے شمار ویمپائروں سے بھر گئی ہے۔ جن کی خوفناک ہنسی، پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور اضطرابی منڈلاہٹ نئے شکاریوں کی منتظر ہے۔

کاؤنٹ ڈریکولا کیا یاد آیا؟ کئی اور خوفناک کہانیاں دماغ میں رینگ گئیں۔ میں نے خوف کے جھٹکے اندر ہی اندر ضرور کھائے پر میرا دل پھر بھی یہ چاہا کہ میں بھاگ کر اس غار میں داخل ہو جاؤں۔ دوڑتی ہوئی آگے تک چلی جاؤں۔ جیمز بانڈ کے سٹائل میں مار دھاڑ کر کے ویمپائروں کا قیمہ کر دوں اور اس راز سے پردہ اٹھانے کا اعزاز حاصل کر لوں جو ان بدقسمت سیاحوں، مہم جوؤں اور جغرافیہ دانوں کے مقدر میں نہ تھا جو مہم جوئی میں نئے باب رقم کرنے کے لئے گھروں سے نکلے اور انجانے دیسوں میں موت کا شکار ہوئے۔

''یا اللہ انسان بھی کیا شے ہے؟ اپنی ذات کے خول میں ''اک رانجھا مینوں لوڑی دا'' کی تفسیر بننا چاہتا ہے''۔

یورپ سے مہم جوؤں کا جوٹولہ آیا تھا۔وہ بڑے دلیر اور جری جوانوں پر مشتمل تھا۔ ان کے قد جیسے چھت کے شہتیروں کو چھوتے تھے۔ان کے سنہری بالوں کی چمک دمک اور حُسن زیتون کے تیل کی خوش رنگی کو مات دیتی تھی۔شفاف نیلی کانچ جیسی آنکھوں میں سمندروں کے نیلے طوفانی پانیوں کا سا اضطراب مچلتا تھا۔

وہ جدید سامان سے لیس تھے۔ان کے پاس ماتھے پر چسپاں ہونے والی جدید ٹارچیں تھیں گلگت کے لوگوں نے انہیں حسرت سے دیکھا تھا۔ان کی بھرپور جوانیوں پر ترس کھایا تھا۔انہیں اس بھسم کر دینے والی آگ میں کودنے سے منع کیا تھا۔

ایک معمر مرد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا بھی۔

''تمہیں اپنی جوانیاں ہنڈانا نصیب ہو۔اس ارادے سے باز آؤ۔آج تک جتنے بھی لوگ اندر گئے۔ان میں سے ایک بھی باہر نہیں آیا۔کوئی کچھ نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ کیا بیتی''؟

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے۔

''فکر مت کریں۔بدترین صورت سے نمٹنے کے لئے ہم لوگ تیار ہو کر آئے ہیں''۔

پھر وہ ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے اس غار میں داخل ہوئے۔ٹارچوں کی روشنی میں دور تک انہیں جاتے ہوئے دیکھا گیا۔پھر کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہوا؟

میں نے دیکھا تھا۔شفقت کا چہرہ فق تھا۔اس نے میرے ڈوپٹے کا پلو کھینچ کر گھگھیاتے ہوئے کہا تھا۔

''چلو نکلو یہاں سے''۔

''دم لو۔ بھوت بلائیں تمہیں کھانے نہیں آ رہی ہیں''۔

میں نے بظاہر بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہا۔ پر خدا جانتا ہے کہ اندر سے میرا حال بھی پتلا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے غار کے منہ سے ابھی ایک مہیب طوفان اٹھے گا اور وہ ہمیں تنکوں کی طرح بہا کر لے جائے گا۔

میں پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ پورَبی ہواؤں میں یکا یک تیزی آ گئی تھی۔ اس تیزی نے سورج کی تپش میں کچھ کمی کر دی تھی۔

ڈرائیور لڑکا بولے جا رہا تھا۔

''خیال ہے کہ یہ غار اندر جا کر یا تو مختلف حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس کا ہر حصہ میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جو ٹولیاں اندر گئیں۔ وہ راستہ بھول کر بھٹک گئیں اور پھر وہیں کہیں مر کھپ گئیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اندر کوئی زہریلی گیس ہے۔ جو انسان کو زندہ نہیں رہنے دیتی۔ اس پر اسرار تاریخی اہمیت کے غار کے دہانے پر ڈیڑھ گھنٹہ گزار کر ہم پھر کارگاہ نالے پر آ گئے تھے۔ ٹراؤٹ مچھلیاں اچھل کود رہی تھیں۔ ذائقے کے اعتبار سے یہ مچھلی دُنیا کی لذیذ ترین مچھلیوں میں سے ایک ہے۔

جب میں نے شفقت کو یہ بتایا وہ تنک کر بولی۔

''چکھنے چکھانے کا کوئی بندوبست کرو۔ تب اس رائے پر مہر ثبت کروں گی''۔

''سبحان اللہ اتنی اہم تم نے خود کو کب سے سمجھنا شروع کر دیا ہے''۔

ہرا بھرا کارگاہ گاؤں گلگت کی چراگاہ ہے۔ موسم گرما کے مہینوں میں لوگ اپنے مال مویشیوں کو چرائی کے لئے اس گاؤں میں چھوڑ آتے ہیں اور اکتوبر کے آخری ہفتے میں برف باری سے پہلے انہیں واپس لے آتے ہیں۔ اس علاقے میں کجر قوم کی اکثریت ہے۔ کارگاہ نالے میں پانچ ہائیڈل اسٹیشنوں سے گلگت اور ملحقہ مضافاتی آبادیوں کو بجلی سپلائی

ہوتی ہے۔

لڑکا ہمیں نالے کے پاس ہی بسین کی پرانی آبادی کے کھنڈرات میں لے آیا۔ وادئی بیسن گلگت شہر سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔

یہ کھنڈرات جولائی اگست میں بند ہونے والے اینٹوں کے بھٹے سے بہت مشابہ تھے۔کوئی مسلمان بادشاہ یہاں حکومت کرتا تھا۔اگر محکمہ آثار قدیمہ ان کھنڈرات کی کھدائی کرے تو عین ممکن ہے کچھ تاریخی حقائق منظر عام پر آئیں۔

واپسی کے لئے چلنے سے پہلے ہم نے نالے کا پانی پینے ہاتھ منہ دھونے اور آنکھوں میں پانی کی ٹھنڈک سے تازگی دوڑانے کو ضروری سمجھا تھا۔

پریزیڈنسی سے ہوتے ہوئے ہسپتال آئے۔جونہی سوزوکی رُکی۔شفقت دروازہ کھولتے ہی چھلانگ مار کر یوں باہر نکلی جیسے کابک میں بند لقّی کبوتری کنڈی کھلتے ہی فضا میں قلانچیں بھرنے لگتی ہے۔

یہاں وہاں برآمدوں میں درختوں کے نیچے وہ جگہ جگہ رک رک کر گرد و غبار سے اَٹے پڑے یادوں کے دئیوں کو صاف کرنے اور ان میں دماغ میں سنیتی ہوئی یادداشتوں کا تیل ڈال کر جلانے میں جت گئی تھی۔

''میں یہاں کھیلتی تھی''۔وہ برآمدے میں کھڑی کہتی تھی۔

''ابراہیم مجھے یہاں سے خوبانیاں توڑ کر دیتا تھا کوثر اور عفت یہاں بیٹھتی تھیں۔

وہ کہیں دور دیکھتی تھی۔اس کی آنکھیں تھیں کہ جیسے فانوس سے جلتے تھے۔

پھر وہ بھاگتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔مکانوں کے گرد چکر پر چکر کاٹتے کھاتے ہوئے اس گھر کو پہچاننے میں جب اُس کی کیفیت ہانپنے والی ہوگئی۔تب ایک گھر کے بند پٹ دھڑ سے کھول کر وہ اندر جا گھسی۔باغ میں، کمروں میں آنگن میں جیسے کن سوئیاں لیتی پھری اور میں اُس گھر میں مقیم اُس کی حرکتوں پر حیرت زدہ سی گلاپور کی فیملی کو اس

کی جنونی حرکتوں کا پس منظر بتاتی رہی۔

تب دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر جانے کے لئے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کا اشارہ دیا۔گلاپور کا خاندان ''چائے پی کر جایئے ایسے جانا تو اچھا نہیں لگتا''۔جیسے الفاظ کا واویلا کرتا ہی رہ گیا۔

وہ مجھے گھسیٹتی ہوئی سوزوکی میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔اس کی ان بچگانہ حرکتوں کو میں نے پسند نہیں کیا تھا۔مگر یہ میں جانتی تھی کہ اس وقت وہ بہت دل گرفتہ سی ہے اسے اپنا بڑا ابو یاد آیا تھا۔وہ ابو جو کہنے کو اس کا تایا تھا پر جس نے اسے شہزادیوں کی طرح پالا تھا۔

ساری شام اس کے ڈپریشن کی نذر ہوگئی تھی۔مغرب کے بعد کہیں اس دورے کا اثر زائل ہوا۔اور جب ہم عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے فرض اور وتر کے درمیانی وقفے میں رک کر اسے بتایا کہ کل ہمیں ہنزہ چلنا ہے۔گنونی کا تہوار دیکھنا ہے''۔

☆☆☆

باب:16

فسانہ شاہراہ ریشم کا۔ احوال قراقرم ہائی وے کا۔

ملنا کمینے فیثی بل سے۔ گنونی کا تہوار اور ہماری مایوسی

آسمان کسی پرہیز گار کے دامن کی طرح شفاف تھا۔ دھوپ میں ماں کی گود جیسی نرمی اور ملائمت تھی۔ پوربی ہوائیں کسی چنچل دوشیزہ کی مانند اداؤں سے تھم تھم کر چلتی تھیں۔ لوہے کی تاروں، سریئے اور لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے گلگت کے معلق پل پر سے ویگن جھولتے جھومتے ہوئے گزر کر لشکارے مارتی سیاہ سڑک پر بھاگی جاتی تھی۔ سڑک کی سیاہی اور گھنے سبز درختوں میں سے اسکا بانکپن دیکھ کر مجھے وہ شوقین مٹیاریں یاد آئی تھیں جو اپنے تیل چپڑے سیاہ بالوں کو پھول چڑیوں سے سجاتی تھیں۔

ہم ہنزہ کی طرف رواں دواں تھے۔ دنیور کی سرسبز وادی دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھی۔

شفقت نے نہایت دلچسپی اور تعجب سے میری طرف دیکھا تھا۔ یقیناً اس کے لاشعور میں وہ تنگ پرخطر اور کچی سڑک ابھر کر آگئی تھی جس پر اس نے اپنے بچپن میں کہیں ہنزہ کا سفر علی مدد کے گاؤں جانے کے سلسلے میں کیا تھا۔ جیپ کئی بار ڈولی تھی اور نانی اماں کی چیخوں نے اُسے بھی دہلا دیا تھا۔

''یہ قراقرم ہائی وے ہے۔ میں نے اس کی حیرت رفع کی۔ سامنے دیکھو دریا کے پار۔ پہاڑوں کے سینے پر جو لمبی رسے جتنی موٹی خراش سی نظر آتی ہے۔ وہ پرانی سڑک

ہے‘‘۔

’’قراقرم ہائی وے۔کس قدر غیر رومانی نام؟ کتنا کٹھن؟حلق سے ق نکالنے میں ہی اسے تھرتھری شروع ہو جائے۔بس شاہراہ ریشم اچھا ہے۔ریشم جیسا سرسر کرتا ہوا۔

شفقت نے اطمینان سے فیصلہ صادر کر دیا تھا۔

۸۰۴ میل لمبی اس شاہراہ کی تعمیر میں فطرت کے ساتھ بڑی بے رحمی سے لڑا گیا۔ وادیوں میں سرد ہوائیں دندناتی پھرتیں۔گلیشیروں کے تودے ٹوٹتے اور جانی و مالی نقصان کا باعث بنتے۔گرمیوں میں برف کے پگھلاؤ سے زیرِ تعمیر حصوں کی تباہی ہوتی۔زلزلوں سے بہت کچھ تہس نہس ہوا۔سندھ کوہستان کے افراد نے اسے اپنی آزادی کے خلاف بغاوت جانا۔والئی سوات نے اس کی تعمیر کو ناپسند کیا۔مقامی خانوں کی حاکمیت کے لئے یہ سڑک ایک چیلنج بنی۔

بس آرمی انجینئرز کے آہنی عزائم تھے۔چینی ماہرین کی فنی کاریگری اور ذہانت تھی جس نے پہاڑوں کا جگر چیر کر دودھ کی نہریں نکال دی تھیں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ جب میں یہ سب شفقت کو بتا رہی تھی۔ہمارے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا درمیانی عمر کا مرد میری طرف اپنی تیکونی آنکھوں سے بار بار دیکھتا تھا۔اس کے ہونٹ پھڑپھڑاتے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

میں نے توجہ سے تانبے جیسی رنگ والے اس مرد کو دیکھا۔اپنی قینچی کی طرف چلتی زبان کو بند کیا اور اس سے پوچھا تھا۔

’’کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟‘‘

’’ہاں‘‘اس نے اپنا بڑا سا سر ہلایا۔

میں گوجال پائین جو کہ ہنزہ کا بالائی حصہ ہے کے شمشال نامی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔فوج میں صوبیدار تھا۔شاہرہ ریشم کی تعمیر میں میرا خون پسینہ ایک ہوا ہے۔

میں نے دلچسپی سے اُسے دیکھا اور کہا

تو پھر کچھ بتائیے نا اس کے بارے میں۔

اس سڑک کی تعمیر سے قبل گلگت اور راولپنڈی کے درمیان واحد زمینی راستہ درہ بابو سر تھا۔ ۱۳۵۸۰ فٹ بلند جو صرف گرمیوں کے تین یا چار ماہ کھلا رہتا پھر برف باری کی لپیٹ میں آ جاتا۔ یوں شمالی علاقہ جات نیچے کی دنیا سے بالکل کٹ جاتے۔

اندرونی وادیوں میں اگر آپ جائیں تو بڑے بڑے نالوں پر آج بھی قدیم طرز کے پل موجود ہیں۔ جالو (Skin Raft) اور ایک رسی پر مشتمل پل جسے شنا زبان میں ''دوٹ'' کہتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو مرنے کے بعد جب پُل صراط سے گزرنا پڑے گا تو وہ بغیر کسی دشواری کے یہ مرحلہ طے کر لیں گے۔ بلکہ اس دوڑ میں اول انعام حاصل کریں گے کیونکہ یہ ذرائع انہیں زندگی میں ہی اس کی تربیت دے رہے ہیں۔

ہم دونوں ہنس پڑیں۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ جب اندرونی حصوں میں سفر کریں گی تو اپنی آنکھ سے دیکھیں گی''۔

مغربی ہمالیہ سے لے کر قراقرم اور ہندوکش تک ۷ اور ۹ درجے کی سڑکیں بنی ہیں جو دریاؤں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جان ہمہ وقت سُولی پر لٹکی رہتی ہے۔ جیپ یا گاڑی کا پہیہ بس ذرا سا پھسلا تو ہزاروں فٹ نیچے بہتے دریا کی بے رحم لہریں اور مچھلیاں ہڑپ کرنے کو تیار رہتی ہیں۔

لیکن یہ سڑک جسے شاہراہ قراقرم کہتے ہیں۔ اس صدری کا عظیم کارنامہ ہے۔ بشام کا وہ بوڑھا مجھے آج بھی یاد ہے۔ جس کا گاؤں لب سڑک آ گیا تھا۔ کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ کبھی ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھاتا تھا۔ فرنٹیر ورکس پروگرام کے نوجوان اور چند آرمی انجینئرز اس کے پاس گئے پتہ چلا کہ وہ سڑک بنانے والوں کو دعائیں دے رہا

ہے۔اس کا کہنا تھا کہ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کی زندگی اتنی سکھی بھی ہو سکتی ہے کہ وہ جب چاہے اپنی اکلوتی بیٹی سے ملنے راولپنڈی چلا جائے۔

یہ سڑک ان بے شمار قربانیوں کی بھی یاد دلاتی ہے جو افراد نے اپنی جانوں کے نذرانوں کی صورت میں دیں۔

میں نے محسوس کیا تھا۔اس کا لہجہ دکھی اور غمگین ہو گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔ یقیناً اسے ان ناخوشگوار لمحوں کی یاد آئی ہو گی جب بند صندوقوں میں لاشیں شہیدوں کے جائے مقام پر پہنچتی ہوں گی تب چاہنے والوں پر کیا کیا قیامتیں نہ گزری ہونگی؟

میں نے دائیں طرف کھڑکی سے باہر فضا کو دیکھا دور پر ہیبت پہاڑ کی چوٹی پر برف یوں چمک رہی تھی جیسے کسی جاہ و جلال والے شہنشاہ کے سر پر تاج چمکتا ہے۔

لمبا سانس بھر کر میں نے کہا۔

''قوموں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ایسا کرنا اور ہونا ناگزیر ہے۔خون بہائے بغیر گلستان کے چہرے کو نکھار نہیں ملتا''۔

دکھ اور یاس کے ہزاروں رنگ میری آنکھوں میں گھل گئے تھے۔اس لمحے میری حالت اس غبارے جیسی تھی جو مسرتوں کی ہوا سے لبالب بھرا فضاؤں میں اڑتا پھرتا ہو۔پر آناً فاناً ہوا کا زبردست تھپیڑا اُس کا پٹاخہ بجا دے۔

نیلے شفاف آسمان پر دھوپ چمکتی تھی۔کہیں کہیں کوئی پرندہ اڑتا پھرتا تھا۔ہوا گرم تھی پر کبھی کبھی خوشگوار ہوا کا کوئی جھونکا اس میں آ ملتا۔ویگن فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور میرا دل عجب سا ہو رہا تھا۔

رحیم آباد میں چشمے کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں سے منہ ہاتھ اور پاؤں دھونے ، کھانا کھانے ،چائے پینے اور تھوڑا سا ستانے کے بعد بس تین چار میل ہی آگے چلے ہو نگے کہ ویگن اچھلی اور پھر لڑھکتی ہوئی آگے تک چلی گئی۔

نائی راڈ کھل گیا تھا۔خدا کا شکر تھا کہ آگے راستہ صاف تھا۔دریا یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ویگن کسی چیز سے نہیں ٹکرائی تھی۔دراصل ایک گہرے کھڈ کے سامنے آجانے سے صورت حال بگڑ گئی۔سواریاں اتر گئیں۔چند لوگ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔کچھ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو گالیاں نکال رہے تھے کہ گاڑی کو چیک کئے بغیر ایسے ہی منہ اٹھا کر چل پڑتے ہیں کوئی جانی نقصان ہو جاتا تب۔

تھوڑی دیر بعد ایک ویگن گزری۔ڈرائیور نے روک کر مجھے اور شفقت کو اس میں کرا دیا۔جہاں جگہ ملی اس کے عین سامنے ایک غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا۔اس کے ساتھ کراچی کی تین لڑکیاں جو مشنری جذبوں کے تحت آغا خان گرلز اکیڈمی میں استاد بن کر جا رہی تھیں بیٹھی تھیں۔

برطانیہ کا فیلی بل جس کا تھیلا نقشوں معلوماتی مضامین اور چھوٹے موٹے کتابچوں سے بھرا ہوا تھا۔ویگن تھوڑا سا آگے چلی۔پھر رک گئی۔مسافروں کے پوچھنے پر کہ کیا ہوا؟ کنڈیکٹر اور ڈرائیور دونوں نے تسلی بخش جواب دینے کی بجائے الٹا یہ کہا۔

''آپ لوگ نیچے اتر آئیں۔یہ مشینری ہے اس میں خرابی بھی ہو سکتی ہے''۔

''اللہ ہی ہے جو آج کسی ٹھکانے لگا دے'' شفقت بڑبڑائی۔

میں فیلی بل سے باتیں کرنے لگی۔کمبخت کے پاس علاقے سے متعلق بلا کا نالج تھا۔اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کچھ چیزیں نکالیں۔پڑھنی شروع کیں۔ان کے نادر ہونے کا احساس ہوا۔اس وقت میرے اندر رشک وحسد کے اژدھے نے ایسی پھنکار ماری کہ میرا جی اپنے سر کا ایک ایک بال نوچ لینے کو چاہا۔اپنے حسابوں میں بڑے تیر مار رہی تھی۔خود کو ہیون سانگ کی جانشین سمجھ رہی تھی۔مجھ سے کہیں زیادہ تو یہ غیر ملکی جانتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا وہ ایک دن کے لئے مجھے یہ کتابیں دے سکتا ہے۔

اس نے انکار میں اپنا طو لے جتنا سر ہلایا۔ ’’کسی کی ہیں واپس کرنی ہیں‘‘۔
میں نے پھر ملتجی انداز میں کہا وہاں سے پھر انکار رہا۔ میں نے غصے سے کتابیں اسے واپس تھما دیں۔ ویگن کی طرف دیکھا جو ہنوز کھڑی تھی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر اس کے آپریشن میں مصروف تھے۔ سواریاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ شفقت ایک پتھر پر بیٹھی ہواؤں اور فضاؤں سے لطف اٹھا رہی تھی۔ کراچی کی ان لڑکیوں کے ارد گرد چار پانچ مقامی لڑکے منڈلا رہے تھے

مجھ سے رہا نہیں گیا میں نے پھر فیتی بل کی طرف دیکھا اور طنز سے کہا۔
شاہراہ ریشم نے سیاحوں کی مشکلات آسان کر دی ہیں۔ یقیناً میں اسے جتانا چاہتی تھی کہ وہ کوئی تیر نہیں مار رہا ہے، کوئی انوکھا اور نرالا کام نہیں کر رہا ہے۔
’’ہرگز نہیں وہ بولا۔ آج کا سیاح بھی مشکل سے دوچار ہے۔ مشکلات صرف ماضی کے سیاحوں کو ہی پیش نہیں تھیں۔ سلک روٹ صرف خنجراب تک ہے۔ لیکن برصغیر کے یہ پر ہیبت پہاڑی سلسلے جو مغربی ہمالیہ، قراقرم، ہندوکش، دکن من اور رولائی پر مشتمل ہیں اور جو دنیا کی چھت سطح مرتفع پامیر سے جا جڑتے ہیں۔ سیاحوں کے لئے ان کا اسرار کل بھی دلچسپی کا باعث تھا اور آج بھی ہے۔ ہاں شاہراہ ریشم کی تعمیر نے اس علاقے کے عام لوگوں کی مشکلات کو آسان اور ان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنا دیا ہے۔
زمانہ قدیم سے یہ راستہ ہندوستان اور وسط ایشیا کے درمیان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ہندوستان سے ہاتھی دانت بحیرہ روم کے علاقے سے شیشے اور تانبے کا سامان اور چین سے LOQURE کی تجارت ہوتی تھی۔ ریشم کی تجارت کو فروغ یہیں سے ملا اور سلک روٹ نام بھی اسی وجہ سے پڑا۔ ویگن میں بیٹھنے کی پکار پڑی تھی۔ تیزی سے بھاگے اور بیٹھے۔
میری نظریں کھڑکی سے پھسل کر باہر جا گریں۔ سامنے پہاڑوں کی چوٹیوں کے

درمیان راکاپوشی مسکراتی تھی کچھ اس انداز میں جیسے مجھے خوش امدید کہتی ہو۔اپنی اس بے تکی سی سوچ پر ہنسی کی خفیف سی پھوار سے میرے ہونٹ گیلے ہو گئے تھے۔

میرا تصور کہیں بہت پیچھے چلا گیا۔اس زمانے میں جب ان سنگلاخ راستوں پر وسط ایشیا کے افسانوی شہروں سے لوگوں کے قافلے گزرتے ہوں گے۔بھلا کیسے ہونگے وہ لوگ؟ابن بطوطہ کے نقش پا بھی ان پتھروں پر کہیں ثبت ہونگے۔مارکوپولو کو بھی اس راکاپوشی نے اسی محبوبانہ انداز میں دیکھ کر خوش آمدید کیا ہوگا جوق در جوق قافلے' گھوڑوں اور خچروں کی گھنٹیاں' پتہ نہیں اُونٹ بھی ساتھ ہونگے یا نہیں۔

ویگن نے جھٹکا کھایا تھا۔میرا سر سامنے روڈ سے جا ٹکرایا۔قافلے' اونٹ' گھوڑے' خچر' صدائے جرس سب فضا میں آناً فاناً تحلیل ہو گئے تھے۔

ڈرائیو نے عجلت میں سڑک کے کنارے کھڈ کا خیال نہیں کیا۔بہر حال بچ بچاؤ ہو گیا۔

''خدا خیر کرے''۔میرے منہ سے نکلا۔''صبح سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔پتہ نہیں کس کا منہ دیکھا تھا''۔شفقت بولی۔

اس وقت سورج نصف النہار پر تھا۔اب دھوپ میں تپش کم تھی۔کبھی کبھی ہوا کے جھونکے خنکی سے لدے پھندے ہوتے۔کبھی کبھی سیبوں اور خوبانیوں کی مہکار کا رچاؤ بھی ہوتا۔

میرا جی چاہتا تھا ساری خوشبو اپنے اندر جذب کر لوں۔

ہم ہندی کے گاؤں سے گزر رہے تھے۔ہنزہ پائین کا آخری گاؤں جسے اب ناصر آباد کہا جاتا ہے۔ہندی قدیم تہذیب و تمدن کو اپنے اندر ابھی تک سمیٹے ہوئے ہے۔

زمرد' یاقوت اور ہیرے کی کانیں گزر گئی تھیں۔کام بند تھا' پتہ نہیں کیوں؟گزشتہ سال بھی کام نہیں ہو رہا تھا۔میرے استفسار پر ہمارے داہنے ہاتھ بیٹھے آدمی نے کہا

کان کنی بہت مہنگی پڑتی ہے۔
عقبی نشستوں سے کسی نے یہ بھی کہا۔
''ریاست اور حکومت میں معاہدہ نہیں ہو پا رہا ہے۔''

ویگن کریم آباد جانے کے لئے اس سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ جو گزشتہ سال پکی تھی۔ راکاپوشی ہوٹل کے سامنے گاڑی رکی۔ میں اور شفقت نیچے اترے۔ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ہوٹل کے کشادہ برآمدے کی جالیدار کھڑکیوں سے میں نے اپنے سامنے بکھرے ہنزہ کو دیکھا تھا۔ جو حسن فطرت کی مکمل تصویر بنا الوہی سکون میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میرے مولا وہ ہنگامے، رونقیں اور شور وغل کہاں تھے۔ جنہیں دیکھنے کے لئے میں اتنا پینڈا مارتی آئی تھی''۔ کریم آباد میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں پرانے محل کی چھت کو کھوجنے لگی تھیں۔ نگاہوں نے پرانا محل تو ڈھونڈ نکالا تھا۔ پر آنکھیں اور کان جو کچھ دیکھنے اور سننے کے متمنی تھے وہ کہیں نہیں تھا۔ چھت ویران تھی۔ وہ ڈھول بجانے والے ڈھولچی سرنئی بجانے والے مرد ناچنے والی عورتیں اور رنگ برنگے کپڑے پہنے بچے اور خواتین سب کہاں تھے؟

میں شاید اس تصور میں تھی کہ ہنزہ میں داخل ہوتے ہی رنگ وبو کا ایک سیلاب مجھے خوش آمدید کہے گا۔

میں عجیب سے یاس کا شکار ہو گئی تھی۔ نماز سے فراغت کے بعد میں نے شیریں کی والدہ کو فون کیا۔ پتہ چلا وہ باہر گئی ہوئی ہیں۔ دوسرا فون نیک پروین کے گھر کیا۔ وہاں سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔

میں کمرے میں آئی۔ شفقت سے کھانے کے لئے چلنے کو کہا اور جب ہم چنے کی دال گوشت اور تنوری روٹی کھا رہے تھے۔ میں بولی تھی۔

''قسمت اس بار کچھ ساتھ دیتی نظر نہیں آتی۔ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہو گئی ہے''۔

کھانے سے فارغ ہوکر باہر آئے ۔ایک خاصے خوش شکل وخوش پوش لڑکے سے تھموشلنگ کے تہوار کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو وہ ہونقوں کی طرح ہمیں گھورتا رہا۔پھر جب اسے کچھ سمجھ آئی تو ''اوہو'' کہتے ہوئے اپنے سر جھٹکا اور کہا۔

''آپ تو غلط بول رہی ہیں''۔

صحیح تلفظ بتانے کے بعد اس نے مزید حیرت کا اظہار کیا۔

تو پھر اکیس جون کو ہنزہ کے لوگ کیا مناتے ہیں؟ میں جز بز ہو رہی تھی۔''آپ غالباً گنونی کی بات کرتی ہیں''۔

وہ ہنسا اور پھر بولا

''بھئی لوگ ایڈوانس ہوتے جا رہے ہیں۔ان تہواروں کے لئے وقت نہیں رہا ان کے پاس۔ہنزہ کے بعض حصوں میں یہ رسم ابھی بھی اہتمام سے منائی جاتی ہے۔مگر ہنزہ خاص میں گنونی کے لئے زیادہ تر دد نہیں کیا جاتا۔تھوڑا بہت ہنگامہ ہو جاتا ہے۔اگر آپ میرے دادا سے ملیں تو وہ بتائیں گے کہ ان کے زمانے میں یہ تہوار کس شان وشوکت سے منایا جاتا تھا۔وہ اکثر دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہیں کہ دنیا بہت بدل گئی ہے۔جینے کا وہ مزہ نہیں رہا۔جسے دیکھو پیچھے کی طرف بھاگ رہا ہے۔

''ارے چھوڑیئے آپ کس چکر میں پڑ گئی ہیں؟اس سال تو یوں بھی فصل کی کٹائی دیر سے ہوگی۔ہوائی موسم کی شدت کی وجہ سے جلدی نہ ہو سکی تھی''۔

ہم اس وقت ہماچی نامی چھوٹی سی نہر کے کنارے کھڑے تھے جس کے نیچے گنیش کا گاؤں آباد ہے۔ہوا کے جھونکے،نہر کا بہتا پانی اور ہمارے پاس کھڑا وہ شوخ وشنگ نوجوان جو ہونٹوں اور ہاتھوں کے مختلف زاویے بناتا ہوا مجھے کہہ رہا تھا۔''ارے آپ کس چکر میں پڑ گئی ہیں''؟

میرا جی چاہا ایک جھانپڑ دوں اُسے۔سارے پروگرام کا ستیاناس ہو گیا تھا۔

بہترین کیمرہ اور فالتو فلمیں لے کر چلی تھی۔ ایک ایک مرحلے کی تصویر کشی کا پروگرام تھا۔

میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔

نوجوان کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''بیٹھو نا۔ پڑھے لکھے لگتے ہو۔ کچھ ہنزہ کے بارے میں بتاؤ۔''

دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہو۔ شفقت نے زمین پر داہنا پاؤں مارا۔ غصے سے اس کی ناک کے نتھنے پھڑ کنے لگے تھے اور چہرہ تپے تنور کی دیواروں جیسا ہو رہا تھا۔ اور جب وہ بولی تھی۔ اس کی آواز میں جنگلی بلی جیسی غراہٹ تھی۔

''بھاڑ میں جائے تمہاری تاریخ دانی اور جہنم میں جائے تمہارا لکھنا۔ جہاں بیٹھتی ہو پٹارہ کھول لیتی ہو۔ یہ نہیں کہ ذرا بازار دیکھیں۔ دو کانوں کا جائزہ لیں۔ چین سرہانے بیٹھا ہے۔ چینی سلک اور چینی کراکری بھلا یہاں سے زیادہ کہاں سستی ہوگی؟ کمبخت میں کوئی تمہارے جیسی ملنگنی ہوں۔ سمن آباد گرلز کالج کی لیکچرار ہوں۔ جہاں ایک سے ایک بڑھیا کپڑے کی نمائش ہر روز ہوتی ہے۔

ہماری لڑائی بھی نچلے درجے کے سیلاب کی مانند ہے جو نقصان سے زیادہ ہلچل مچانا اور شور شرابا کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

میں ابھی جوابی حملے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ نوجوان لڑکا جس کا نام سرفراز تھا اور جو پنجاب یونیورسٹی میں بی فارمیسی کا طالب علم تھا بولا

''آنٹی اپ لوگ تو بڑی لڑاکا ہیں۔''

''یا اللہ ابھی تو اس نے میرا چنگھاڑنا نہیں دیکھا سنا۔ دیکھ سن لیتا تو جانے کیا کہتا''؟

تاہم میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''بیٹھواور ہمیں ہنزہ کا چہرہ دکھاؤ''

''لیجئے کیاپدّی اور کیاپدّی کا شوربہ۔میں تو ابھی تک اپنے چہرے کے مزاج اور ہیت کو نہیں سمجھ پایا۔کبھی اس پر نکھار ہوتا ہے۔کبھی ویرانی،کبھی کیل مہاسے ڈیرے ڈال لیتے ہیں اور کبھی چھائیاں جلوہ افروز ہو جاتی ہیں اور آپ بات ہنزہ کی کر رہی ہیں۔

کیا سر پھرا لڑکا تھا۔بات سے بات نکالتا تھا۔

''ہمارے گھر چلئے۔میرے دادا سے ملیں۔وہ اردو بھی جانتے ہیں اور ہنزہ سے بھی ان کی دیرینہ آشنائی ہے''۔

اس کی پیشکش میرے لئے بہت پر کشش تھی۔

میں نے شفقت کی کھڑی ناک کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''سوانی جی معاف کر دیں۔آج کی شام میرے نام۔کل کا دن آپ کے لئے''۔

سرفراز کا گھر کریم آباد میں تھا۔ہنزہ کا ایک روایتی گھر۔چھوٹے چھوٹے کمروں اور راہداریوں سے گزر کر ہم وسطی کمرے میں پہنچے۔گھر کی عورتیں ہمارے گرد اکٹھی ہو گئی تھیں۔چھوٹے چھوٹے بچے منہ اٹھائے ہماری صورتیں دیکھتے تھے۔سرفراز کا دادا دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا تھا۔

یا اللہ۔میں نے اپنے دل میں کہا۔

یہ کیسا بوڑھا ہے۔بانکا سجیلا۔گلابی پھول جیسی رنگت والا ملائم چہرہ جس پر نہ جھریاں تھیں نہ سلوٹیں بس ٹھوڑی کے پاس ایک جگہ چند لکیریوں کی گرہیں سی لگی ہوئی تھیں۔آنکھیں اتنی شفاف اور چمکدار جیسے کانچ کی نئی نکور نیلی گولیاں ابھی ابھی ان میں فٹ کی گئی ہوں۔نقش ایسے کٹیلے اور تیکھے تھے کہ وہ روایت سو فیصد دل کو لگتی تھی کہ ہنزہ کلچر یونانی و ایرانی اور کشمیری تہذیبوں کی آمیزش سے وجود میں آیا ہے۔کیونکہ سکندر اعظم کی طوفانی

فتوحات کے دوران اس کا ایک سپہ سالار اور تین سپاہی بیماری کی وجہ سے ہنزہ میں رہ گئے تھے اور ان کے ساتھ ان کی ایرانی بیویاں تھیں۔

سرفراز نے تعارف کروایا اور ہمارے متعلق بتایا۔

انہوں نے نشست سیدھی کی۔ ہمیں بغور دیکھا اور پھر سر بہوڑ کر گویا مراقبے میں چلے گئے۔ چند لمحوں بعد ہاتھوں کو سر کی جانب لہرایا اور بولے۔

ارے وہ سب باتیں خواب ہوئیں دخیال ہوئیں۔

''چلو چھٹی ہوئی''۔ میرا اضطراب قابل دیدنی تھی۔

دفعتاً انہوں نے سر اٹھا کر مجھ سے پوچھا

''پنجاب کے لوگ بیساکھی کا تہوار مناتے ہیں۔ دیکھا ہے کبھی اسے''

مجھے بھی شرارت سوجھی۔ جلی ہوئی تو بیٹھی تھی۔ اسی لئے دائیں ہاتھ کو لہرا کر بولی۔

''ارے کہاں؟ وہ سب باتیں خواب ہوئیں دخیال ہوئیں۔ بیلوں کا زمانہ لد گیا۔ تھریشر اور ہارویسٹر آ گئے۔ دنوں کا کام گھنٹوں اور گھنٹوں کا لمحوں میں ہونے لگا۔ دو دن میں اناج سمیٹ کر کوٹھے بھر لیے جاتے ہیں۔ کہاں وقت رہا لوگوں کے پاس بیساکھیاں منانے کا۔

اب ان کی آنکھیں ناچیں۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ انگشت شہادت ناچی اور وہ بولے۔

''شاہراہ قراقرم نے ان دور افتادہ حصوں کی معاشی اور معاشرتی زندگی پر بہت اثرات ڈالے ہیں۔ آہ وہ بھی کیا دن تھے؟ سہولتیں اور آرام تو میسر نہ تھے۔ تاہم محبت اور خلوص کی حد درجہ فراوانی تھی۔ ایک دوسرے کا لحاظ اور پاسداری تھی۔ آج جیسی افراتفری نہیں تھی''۔

''ہمیں تو کہیں افراتفری نظر نہیں آئی؟ چاروں اور الوہی سکون اور سناٹا پھیلا ہوا

ہے"۔

"اس لئے کہ تم اس سے کہیں بڑے افراتفری والے علاقے سے آئی ہو"۔

اب میں لاکھ انکار کرتی پر بات کتنی سچی تھی؟

انہوں نے اپنے جواب کی تائید میں خود اپنا سر ہلا کر میری طرف دیکھا تھا۔چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔

بھئی ہم غریب سے لوگ تھے۔چھوٹی چھوٹی ہماری خوشیاں تھیں۔گندم اور جو کی فصل پکنے پر آتی۔خوشوں میں دانے پڑتے اور بالیاں پیلی ہوتیں تو بلا غلا کرنے کو جی چاہتا۔ایسے میں میرا پھم اپنے وزیر اور درباریوں سے مشورے کے بعد اوکھنڈ سے گنونی کے لئے موزوں دن بتانے کے لئے کہتا۔اوکھنڈ کتاب کھولتا۔حساب جوڑتا اور مبارک دن کا اعلان کر دیتا۔

تب اس پرانے محل کی چھت پر موسیقار بیٹھ جاتے اور گنونی کی دھنیں بجاتے۔

سچ بتاؤں وہ پھر رکے ہماری طرف دیکھا۔

جونہی موسیقاروں کے سازوں کی آواز کانوں میں پڑتی۔دل میں جلترنگ سے بجنے لگتے اور بچے بوڑھے عورتیں مرد سبھی کلکاریاں مارتے گھروں سے باہر نکل آتے۔ تالیاں بجاتے اور رقص کرتے۔پورا علاقہ جوش وخروش سے بھر جاتا۔گھر صاف کئے جاتے۔نئے کپڑے سلتے اور اچھے اچھے کھانے پکتے۔

پھر وہ خاص دن آتا۔اس خاص دن موسیقار چوبیس گھنٹے ساز بجاتے۔میرا پنی ریاست کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کھیتوں میں جاتا۔بسم اللہ کہہ کر خوشوں کو توڑنے چند خوشوں کو گھر کے ستون سے باندھنے اور چند کو بھون کر لسی یا دودھ میں ملا کر کھانے کے مناظر اتنے دلفریب ہوتے تھے کہ آج بھی اس تصور سے میرا انگ انگ سرشار ہو جاتا ہے۔

اگلے دن پولو کے میچ ہوتے۔پولو کھیلنا ہماری زندگی کی سب سے پر مسرت تفریح

ہے۔پولو کے بعد میر اپنے درباریوں کے ساتھ اپنے بالائی باغات میں کرسی پر بیٹھ کر اس روٹی اور برس کو کھاتا جو ہنزہ کے لوگ اپنے میر کے لئے ہنزہ کے سرکردہ لوگوں کے گھروں سے لاتے۔

رسم گنونی کی تفصیل میرے گوش گزار ہو چکی تھی۔چائے بھی پی بیٹھی تھی۔اور اس میں ڈالے گئے نمک کا ذائقہ ابھی تک میری زبان پر تیرتا پھر رہا تھا اور بار بار مجھے یہ باور کروانے کی کوشش میں تھا کہ ہنزہ اب قلت نمک کے بحران سے باہر نکل آیا ہے اور اس معدنی صنعت میں اس حد تک خود کفیل ہو گیا ہے کہ مہمانوں سے محبت کے اظہار میں انہیں زیادتی کا احساس نہیں ہوتا۔

''گلمت چلے جائیں وہاں یقیناً گنونی دیکھ سکیں گی۔''

بانکے سجیلے بوڑھے نے مشورہ دیا۔

میں نے نقشہ نکالا۔گلمت پر نظریں دوڑائیں۔فاصلے کا میلوں میں تعین کیا اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''گلمت ہنزہ بالا میں ہے۔آٹھ ساڑھے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر۔یہاں ابھی کسی نے ایک بالی نہیں کاٹی تو وہاں کا کیا سوال؟ گنونی کی تقریب دیکھنے کے لئے اب میں ہنزہ میں تو ڈیرے ڈالنے سے رہی۔

''اچھی لکھاری ہو۔بوڑھے نے طنزاً کہا۔

ہتھیلی پر سرسوں جماتی ہو۔مشاہدے میں تجربے کی آمیزش نہیں کرو گی تو پُھس پُھسی ہو جاؤ گی۔مہینوں رہو یہاں۔

''گھر اور گھر والے کو طلاق دے دوں''۔

میں جزبز ہو رہی تھی۔

''دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والا عام طور پر ڈوب جاتا ہے''۔

بڑی کڑواہٹ تھی اس جملے میں۔ایک تو میں پہلے ہی بجھی بجھی سی تھی۔اوپر سے یہ دل فگار قسم کی باتیں۔میرا جی اپنے آپ کا تیاپانچہ کردینے کو چاہا۔

میں باہر آ گئی تھی۔سیبوں اور خوبانیوں کے پیڑوں پر سے تیرتی ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تھی۔خوشگوار ٹھنڈی ہوا' شام ہو رہی تھی اور وسطی ہنزہ جیسے پگھلے سونے کا روپ دھارے ہوئے تھا۔

اس وقت میرا اندر مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔کہ اس بوڑھے کی باتوں میں سچ کا زہر ہے۔یقیناً میرے اطوار میں اضطراب کی جھلک تھی۔تبھی وہ جہاندیدہ وجود آہستہ آہستہ میرے پیچھے آیا۔شفقت عورتوں سے گلے مل رہی تھی اور غالباً میری ناکامی پر خوش بھی تھی۔

میرے عین سامنے بربر کی نہر تھی۔بربر اور ڈالدہنزہ کی دو معروف نہریں جو فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہیں۔۶۲ میل کے رقبے کو سیراب کرتی یہ نہریں کریم آباد سے گزر کر علی آباد اور حیدر آباد کو جاتی ہیں۔سایہ دار درختوں کے دامنوں میں قدیم اور جدید طرز کے گھر ہیں۔

میرا جی بربر کا ٹھنڈا پانی پینے اور اپنے اندر کی آگ بجھانے کو چاہ رہا تھا۔پر وہ خوبصورت چہرے والا بوڑھا عین میرے سامنے کھڑا اپنی خاموش زبان پر بولتی آنکھوں سے کہہ رہا تھا

''سچ بڑا کڑوا ہوتا ہے نا۔''

اس کی آنکھیں نہ بھی بولتیں تب بھی میرا اندر بول رہا تھا کہ واقعتاً وہ سچ کہہ رہا ہے۔

ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے رہے۔سیبوں کی خوشبو سے لدی پھندی ہوائیں پھانکتے رہے۔لوگوں کو دیکھتے اور حسن فطرت سے آنکھوں کو سینکتے کریم آباد کی بلندی سے نیچے شاہراہ ریشم پر درختوں سے گھرے گنش کے قدیم گاؤں میں آ گئے۔

سرفراز کا دادا ابھی تک ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہاں سے وہ جدا ہوا۔ پر جدا ہونے سے پہلے اس نے ایک خوبصورت سی پیشکش کی۔

''اگر آپ لوگ رات کو ہمارے یہاں آئیں تو میں آپ کو بہت دلچسپ کہانی سناؤں گا جس کا ہماری ثقافت سے گہرا تعلق ہے۔ تالینی یا تھموشلنگ کا تہوار اسی واقعے کی یاد میں منایا جاتا ہے''۔

''ضرور ضرور'' میں خوش ہوگئی۔

گھومتے پھرتے دفعتاً میں نے شفقت سے کہا۔

''گلمت نہ چلیں''۔

یقیناً کوئی شبھ گھڑی تھی۔ شفقت خوشدلی سے بولی۔

''ہاں چلتے ہیں''۔

میں نے سکھ کا لمبا سانس بھرا۔ اپنے اندر توانائی محسوس کی۔ ایک چھوٹے سے ریستوران سے چائے کا ایک ایک کپ پیا۔ نمکین بسکٹ کھائے۔ یادگار پر لکھے سارے نام پڑھے۔

سوزوکی والے سے بات کی روانگی کا وقت پوچھا اور جب سورج پہاڑوں کی اوٹ میں جا رہا تھا ہم اپنے ہوٹل میں آنے کے لئے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد میں نے رانی آف ہنزہ کو فون کیا۔ میں ان سے ملنا چاہتی تھی۔ پر اس شب وہ مصروف تھیں اور اگلا دن میرا گلمت کے لئے بک تھا۔ بات تیسرے دن پر جا پڑی تھی۔

رات کا کھانا ہم نے جلد کھالیا۔ نماز بھی پڑھ لی۔ اس وقت ہنزہ تاریک تھا۔ بتی نہیں تھی۔ چادریں ہم نے کندھوں پر ڈالیں اور ایک دوسری کے آگے پیچھے چلنے لگیں۔

☆☆☆

باب:17

کہانی راجہ شری بدد کی
جو آج بھی دلچسپ ہے

بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ ستارے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ نیچے سے آئے ہوئے لوگ گھومتے پھر رہے تھے۔ ہم بھی ناک ٹوئیاں مارتے مارتے مطلوبہ جگہ پہنچ گئیں۔

مخصوص روایتی گھر جسے مقامی زبان میں ہمشاسکی تہ کہتے ہیں۔ سامنے تھا۔ سارا خاندان بڑے کمرے میں جمع تھا۔ چھت کیسی دیدہ زیب تھی۔ چار مظبوط نقش و نگاری سے مزّین ستونوں پر کھڑی چند لمحوں کیلئے نظروں کو قابو کرتی تھی۔ ہم جُوتے اُتار کر اندر آئے تھے۔ گلگت و ہنزہ کے گھروں میں جُوتے اندر لے جانے کا رواج نہیں۔ اِس گھر میں تو جُوتوں کو سنبھالنے والی جگہ بھی بڑی آرٹسٹک سی تھی۔ سامنے والی چوبی اور شیشے کی آمیزش سے بنی ہوئی الماری میں جھانکتے برتن بڑے قیمتی نظر آتے تھے۔

عین درمیان میں چولہا دہکتا اور کمرے میں خوشگوار سی حدت بکھیرتا تھا۔ یہاں گھر کی معمر ترین عورت بیٹھی تھی اور یہی اس کی جگہ تھی۔ دائیں جانب کوئی ایک فٹ اونچے چبوترے پر بچھے روئی کے گدوں پر عورتیں بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف اُسی اونچائی کا حامل مردانہ چیمبر تھا۔

مجھے انہیں یوں بیٹھا دیکھ کر فلموں کے قوالی سین یاد آئے تھے۔ لگتا تھا جیسے یہ ابھی ابھی ہاتھ بلند کر کے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔ ایک جوڑا ہمارے بعد آیا۔ آنے والوں نے باآواز بلند ''یا علی مدد'' کہا۔ کمرے میں موجود مجمع 'مولا علی مدد' پکارا۔

گھرانہ اسماعیلی تھا۔ پتہ چلا تھا کہ یہ اسماعیلی طریقہ آداب ہے۔ ہاں البتہ شیعہ گھرانوں میں وہی اسلام وعلیکم کہنے کا رواج ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ اُس گھر میں کُھلے دل اور کھلے ہاتھوں سے استقبالی مراحل طے ہوئے تھے۔ بہترین جگہ پر بٹھایا گیا۔ جوان لڑکیاں جو آغا خان اکیڈمی میں زیر تعلیم تھیں۔ ہمارے دائیں بائیں بیٹھ گئیں اور داستان گل بکاؤلی شروع ہوگئی۔

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔

میرے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ پیدا ہوئی تھی۔ کہانی بڑے روایتی انداز میں شروع ہوئی تھی۔ سرفراز کا دادا ایک بہترین داستان گو معلوم ہوتا تھا۔

قرنوں صدیوں پہلے کی بات ہے۔ ان تمام علاقہ جات چترال سے لے کر پامیر کی حدود تک بدخشان سے کوہ ہام تک راجہ اگر تھم کی حکومت تھی۔ بدھ مت کا پیروکار۔ اُسکے ہاں بڑھاپے میں ایک بیٹے نے جنم لیا تھا۔ راجہ شری بدد۔ کمسنی میں ہی شری بدد اپنے باپ کی محبت وشفقت سے محروم ہوگیا۔ خودغرض اور چاپلوس مصاحبین نے لہوولعب کی طرف راغب کردیا۔ چنانچہ ہمدردوں اور خیرخواہوں سے نہ صرف کنارہ کشی اختیار کی بلکہ ان کی تذلیل و توہین کے بھی درپے ہوا۔

جوں جوں بڑا ہوتا گیا۔ عیاشی، تن پروری، اخلاق سوزی اور بے ہودہ کاموں کی دلدل میں اُترتا گیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق پوری رعایا اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ اس وقت شری بدد عالم شباب میں تھا۔ ایک عظیم الجثہ نوجوان جو فنون سپہ گری میں ایسا طاق تھا کہ پل جھپکتے میں کشتوں کے پشتے لگا ڈالتا تھا۔ اکیلا پورے علاقے پر حاوی تھا۔ لوگوں نے متعدد بار بغاوت کی۔ مقابلے پر آئے اور منہ کی کھا کر واپس گئے۔ دم بخود لوگوں نے اس دیوہیکل پیل پیکر کو جنات کی نسل سے سمجھنا شروع کردیا تھا۔

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ شاہی باورچی خانے میں صبح شام جوانی کی حدوں

میں داخل ہوتا دنبہ ذبح کیا جاتا ۔ایک دن کھانا کھاتے ہوئے شری بدد کو گوشت کے منفرد ذائقے کا احساس ہوا۔

''ایسا خوش ذائقہ اور لذیذ گوشت وہ چلایا۔معلوم کرو یہ دنبہ کہاں سے حاصل کیا گیا ہے؟

حکم کی تعمیل ہوئی۔ پتہ چلا کہ وادی دینور کی ایک بوڑھی عورت نے اس دنبے کی ماں مر جانے کے بعد اس کی پرورش اپنی بہو کے دودھ سے کی ہے۔

ظالم نے سوچا اگر انسانی دودھ سے پروردہ جانور کا گوشت اتنا لذیذ ہوسکتا ہے تو خود انسانی گوشت کی لذت کا کیا عالم ہوگا؟

پس فرمان جاری ہوا کہ سن بلوغ کو پہنچے ہوئے دو نوجوان لڑکے صبح شام خوراک کے لئے ذبح کئے جائیں ۔اب نوخیز بچوں کی خون ریزی کا عمل شروع ہوگیا۔ایک سال تک بے دردی سے آدم خوری کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

تنگ آکر بیچارے ستم رسیدہ عوام متحد ہوکر اس پر حملہ آور ہوئے ۔لیکن اس درندہ صفت کے سامنے بے بس ہوگئے ۔غریب لوگ اپنے جگر پاروں کی ہلاکت پر آٹھ آٹھ آنسو روتے پر کچھ کر نہ پاتے تھے ۔قریب تھا کہ چند سالوں میں انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے ۔وہ خدا کے حضور گڑ گڑائے ۔خدا نے ان کی دعا کو قبولیت اس طرح بخشی کہ انہی دنوں ایک خوبصورت شہزادہ اپنے ملازمین اور رفقاء کے ساتھ سندھ کی وادی پائین میں داخل ہوا۔ دریائے سندھ کو جالو کے ذریعے پار کیا اور چھموگڑھ کی طرف نکل کر اوشی کھن (قلعہ) میں قیام پذیر ہوا۔

جب وہ نیچے اتر رہا تھا وہ راجہ شری بدد کے دست راست جاتئے لوٹو سے دوچار ہوا۔اس نوجوان کی حسین صورت ملوکانہ ٹھاٹ باٹھ خدام کی کثیر تعداد سب نے جاتئے لوٹو کو متاثر کیا۔پرسش احوال ہوا تو جانا کہ یہ سرزمین ایران کا شہزادہ آذر جمشید ہے ۔مذہبا آتش

پرست اور نسلاً کیسری یعنی نوشیروان سے ہے۔اس وقت آفات کے حصار میں ہے کیونکہ لشکر اسلام نے سلطنت ایران کو فتح کر کے کیانی بادشاہت کا تیاپانچہ کردیا ہے۔آذر جمشید اپنے ذاتی دستہ فوج اور وفادار ملازموں کے ساتھ فرار ہوکران سر بفلک پہاڑوں کے دامن میں آگیا ہے۔

''پر تم تو آسمانوں سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہو۔جاٹئے لوٹو بولا۔یہاں کا بادشاہ ایسا سفاک ہے کہ اس کا کام مردم خوری کے سوا کچھ نہیں۔بہر حال تمہاری موہ لینے والی صورت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔میں تمہاری حفاظت کروں گا''۔

تب اس نے آذر جمشید کو بمعہ اس کی فوج و ملازمین منوگہ میں لے جا کر چھپا دیا۔

شری بدد کی ایک بیٹی تھی۔نور بخت حسن و جمال کا پیکر تھی۔سونیکوٹ کے علاقے میں اس کے لئے ایک قلعہ بنایا گیا تھا۔جس کے اندر ایک خوبصورت برجی میں شہزادی کا رہائشی محل تھا۔نور بخت بڑی نیک اور خدا ترس بادشاہ زادی تھی۔

جاٹئے لوٹو کے علاوہ شری بدد کے چار اور وزیر بھی تھے۔یہ شین اور یشکن قوموں سے تھے۔ان میں سے دو جاٹئے لوٹو کے قریب ترین تھے اور شری بدد کی شبانہ روز خون ریزیوں سے سخت نالاں بھی تھے۔بادشاہ شروع موسم بہار سے ابتدائی موسم گرما تک کوہ ہیوکر کے محلات میں رہتا تھا۔

ان دنوں بھی وہ کوہ ہیوکر میں مقیم تھا۔جاٹئے لوٹو نے اپنے ہم خیال دونوں وزیروں سے آذر جمشید کی ملاقات کرائی۔یہ دونوں بھی شہزادے کے حسن اخلاق کے گرویدہ ہوئے۔دونوں کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ شری بدد کی ہستی کو کسی طرح مٹا دیا جائے۔

تینوں وزیروں نے یہ طے کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو شہزادی نور بخت کی شادی شہزادے جمشید سے کرائی جائے تا کہ شہزادی شہزادے کے دام محبت میں گرفتار ہو کر اپنے باپ سے یہ معلوم کرے کہ اس کی جان لینے کے لئے کونسا حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔

جب یہ مسئلہ شہزادے جمشید کے سامنے رکھا گیا تو وہ شادی سے انکاری ہوا۔اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔شادی اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائیگی۔ہاں وہ خلق خدا کو بادشاہ سے نجات دلانے کے لئے مردانہ وار لڑنے کے لئے تیار ہے۔

آہ!جائیٹ لوٹو نے لمبی سانس بھری۔یہی تو تم جانتے نہیں کہ یہ کس قدر کٹھن کام ہے۔

شہزادی سے اس موضوع پر بات کرنا کس قدر مشکل تھا۔اب تینوں پھر سر جوڑ کر بیٹھے۔باہمی صلاح ومشورے کے بعد سونیکوٹ شہزادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔سلطنت کی ویرانی اور رعایا کی تباہی کے ذکر سے خود بھی روئے اور اُسے بھی رلایا۔پھر شہزادہ جمشید کے وارد ہونے کا ذکر کیا۔یہ بھی عرض کی کہ شہزادہ جلد واپس جانے والا ہے۔لہذا اگر اُسے میزبانی کے بغیر رخصت کر دیا گیا تو یہ مملکت کے لئے بدنامی کی بات ہوگی۔شہزادی اسے دعوت کا پیغام بھیجے۔

معصوم سی شہزادی اخلاق وانسانیت کے حوالے سے اس پر رضامند گئی۔دعوت بھیجی گئی جسے شہزادے نے بادل نخواستہ قبول کیا۔دوسرے دن وہ اپنے رضاعی بھائی فرامرزا اور معتمد خاص رل کو ساتھ لے کر دینور پہنچا۔جہاں سے تینوں وزراء کے ساتھ سونیکوٹ کی جانب روانہ ہوا۔شہزادی نور بخت اپنے بالا خانے کے صحن میں شاہانہ کروفر کے ساتھ مسند زرنگار پر متمکن تھی۔اجازت ملنے پر تینوں وزیر شہزادے کے ساتھ صحن میں داخل ہوئے۔

کہانی کے اس حصے پر پہنچتے ہی لڑکیوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔خوبصورت چہروں پر موتیوں جیسے چمکتے دانت یوں لگتے تھے جیسے اونچے ٹبوں پر کپاس کھلی ہوئی ہو۔

عین اس وقت سرفراز کی چھوٹی بہن نے نمکین چائے کے پیالے ہاتھوں میں تھما

دیئے۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''بھئی اصل بات تو اب شروع ہو رہی ہے۔باقی سب تو رولا کولا ہی تھا۔

چائے کی چسکیوں نے محفل کو گرم کر دیا تھا۔

ہاں تو شہزادی نے ایک صاحب جاہ وجلال کو دیکھا۔عشق کے دیوتا نے تیر کھینچ کر مارا جو دل اور جگر کو چیرتا ہوا نکل گیا۔بیچاری شہزادی زخم دل کے درد کی تاب نہ لا کر غش کھا کر گری۔گرنے سے چہرے پر تنا نقاب الٹ گیا۔

''یقیناً شہزادہ بھی غش کھا کر گرا ہو گا۔

ہاں بھئی پرانے وقتوں کے لوگ آج کل کے نوجوانوں جیسے چلتر باز نہ تھے۔ بھولے بھالے معصوم سے تھے۔چہرے سے نقاب کیا ہٹا گویا لکہ ابر ہٹا۔نیلے آسمان پر آفتاب تاباں طلوع ہوا۔اور وہ آفتاب درخشاں وتاباں آسمان سے اتر کر صحن خانہ میں آیا۔ اس ہوش ربا نظارے نے شہزادے کے دل کی سلطنت کو تاخت وتاراج کیا۔نظروں کے سامنے اندھیرا چھایا اور بل کھا کر گرا۔

جا ٹیئے لوٹو اور خواصان نے شہزادی کو سنبھالا۔دونوں وزیروں نے شہزادے کو اٹھایا۔دنوں ایک دوسرے پر شیدا اور فریفتہ ہو گئے۔تینوں وزراء نے فی الفور اپنے مذہب ودین کے مطابق دونوں کو رشتہ ازدواج میں باندھ دیا۔

جب موسم سرما میں راجہ شری بدد واپس آیا اور اپنے محلات شاہی واقع کپل کھن میں ٹھہرا۔تینوں وزراء نے فوراً شہزادہ جمشید کو محلات سونیکوٹ سے نالہ منوگہ میں چھپا دیا۔

سردیوں کے موسم میں چند بار شری بدد بیٹی سے ملنے اس کے پاس ضرور آتا۔ ایک بار شہزادی نے شہزادہ جمشید کی پڑھائی ہوئی پٹی کے مطابق دلگیر لہجے میں باپ سے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

''جان پدر گھبراؤ نہیں تمہارا باپ کسی سے زیر ہونے والا نہیں۔بس آتش سوزاں

اس کی موت کا سبب بن سکتی ہے''۔

شری بدد اپنے پروگرام کے مطابق موسم بہار کے چند مہینے گزار کر کوہ ہپو کر چلا گیا۔ وہاں سے سرد ترین مقامات اور بلند گلیشروں کی طرف نکل گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں شہزادہ جمشید اور تینوں وزرا شہزادی کے پاس اکٹھے ہوئے اور شری بدد کے خاتمے کا منصوبہ طے ہوا۔

ماہ جدّی کے پہلے ہفتے راجہ شری بدد کی واپسی ہونی تھی۔ متعینہ تاریخ سے قبل تمام لوگ اکٹھے ہوئے اور پروگرام کے مطابق وادی کے اردگرد پھیلی خودرو جھاڑیوں اور پتھروں کے عقب میں روپوش ہو گئے۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ شہزادی کے ہاں ولادت متوقع تھی۔ بچے کی پیدائش عین اس شب ہوئی جس شام شری بدد کا دارالخلافہ میں نزول ہوا۔ شہزادی خوف سے لرزہ بر اندام تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو راجہ شری حسب معمول آتے ہی اس سے ملاقات کے لئے سونی کوٹ آ جائے۔ ملازم اور خواصیں الگ ڈر رہی تھیں۔ وقت اتنا کم تھا کہ وہ شہزادہ جمشید کو بھی نہیں بلا سکتی تھی۔ جاٹنے لوٹو سے بھی مشورے کا وقت نہ تھا۔

ایسی افراتفری میں اس نے ایک صندوق میں روئی کا تختہ بچھا کر اس پر نرم بستر ڈال دیا اور نومولود فرزند کو دودھ پلا کر اس میں لٹا دیا۔ تین سو تولہ سونا ایک کپڑے میں باندھ کر ایک خط لکھ کر دونوں چیزیں بچے کے سرہانے رکھ دیں۔ خط میں تحریر تھا کہ جو شخص صندوق کو دریا میں سے نکالے۔ سو تولہ سونا اس کی خدمت کا صلہ ہے۔ جو شخص بچے کی پرورش کرے۔ سو تولہ سونا اس کا ہے۔ باقی ماندہ سونا اس عالم کے لئے جو بچے کو زیور تعلیم سے آراستہ کرے۔

اور صندق کو دریائے ہنزہ میں بہا دیا گیا۔

اگلے دن راجہ شری بدد بیٹی سے ملنے آیا تو جاتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ

شاہی محل کپل کھن لے گیا۔ دو پہر کو باپ بیٹی باتیں کرتے رہے۔ رات کو راجہ شری سونے کے لئے جلدی اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ ادھر شہزادہ جمشید پوری معیت کے ساتھ کمین گاہ میں اشارے کا منتظر رہا۔ جونہی نصف شب گزرنے پر برجی سونیکوٹ کی بالائی منزل میں روشنی جلائی گئی۔ فوراً کونو واس میدان میں ایسی جگہ آگ جلائی گئی جہاں سے وادی میں روشنی دیکھی جاسکتی تھی۔ بس تو چاروں کھونٹ چوب چراغوں میں روشنی ہوئی اور خلق خدا کا ٹھاٹھیں مارتا سیلاب راجہ کے محل کی طرف بڑھا۔ جوں جوں فاصلہ کم ہوتا گیا یوں توں جلتی لکڑیاں دائروں کی شکل میں گنجان ہوتی گئیں۔

شہزادی نور بخت نے باپ کو بیدار کیا۔ اس نے بالا خانے کی کھڑکی سے یہ ہوش ربا منظر دیکھا سمجھا کہ یہ رعایا کی سازش ہے۔ فوراً اسلحہ جنگ سے لیس ہوا تا کہ ان شر پسندوں کی کشت حیات کو راکھ کا ڈھیر بنا دے۔

سائیس کو گھوڑا لانے کے لئے آواز دی۔ اس نے دیر لگائی۔ اس کے تعاقب میں دربان بھیجا۔ اس نے بھی دیر کر دی کیونکہ سب ملازم اس سازش میں شریک تھے۔ اس دوران شاہی محل بلوائیوں کے محاصرے میں آ گیا۔ چوب چراغوں کی روشنی میں تمام احاطہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ راجہ شری بدو نے دیکھا کہ ہجوم آلات جنگ سے لیس ہے۔ درمیان میں ایک خوش شکل نوجوان شاہانہ لباس میں ملبوس کمان کو سنبھالے تیر کو لیس کر کے تیار کھڑا ہے۔ جانا اور سمجھا کہ یہ اجنبی نوجوان ہی اس فتنے کی جڑ ہے۔ شدت غیض وغضب سے چلاتا بالا خانے سے نیچے آیا اور بے سرپٹ اصطبل کی طرف دوڑا۔ غصے سے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اصطبل کے دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ اس کا اگلا قدم کنوئیں کی چھت پر پڑا۔ ادھر سے آذر جمشید نے کمان سے تیر چھوڑا۔ تیر کی نوک سینے کو چھیدتی ہوئی پشت کے پار جا نکلی۔ شری بدو اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ کنوئیں کی تہہ میں جا پہنچا۔

بس تو پھر خلق خدا کے شور وغوغا اور خوشی کے نعروں سے فضائے آسمان گونج اٹھی۔

رعایا چوب چراغوں کا انبار اس کنوئیں میں پھینکتی گئی حتیٰ کہ وہ آتش کدہ جہنم بن گیا۔آناً فاناً وہ جل کر اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

دوسرے دن دھوم دھام سے آذر جمشید کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔لیکن جب شہزادے اور رعایا کو شہزادی نور بخت کے فرزند ارجمند کو دریا برد کرنے کا علم ہوا تو ساری خوشی غم میں بدل گئی۔دریائے ہنزہ، دریائے گلگت اور دریائے سندھ کے دونوں جانب کناروں کے ساتھ ساتھ تلاش کرایا گیا مگر کوئی صندوق نہ ملا۔

شہزادہ آذر جمشید مثالی حکمران ثابت ہوا۔اس کی سلطنت شمالاً جنوباً افغانستان تک اور شرقاً غرباً باڑی پور کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔تمام قبائلی علاقہ جات چلاس، داریل تانگیر، دہر بن، اور شکار ، اشو، کلام وغیرہ اس کی عملداری میں تھے۔

سولہ سال حکومت کرنے کے بعد شہزادے کا دل اس ناہموار کوہستانی علاقے سے گھبرانے لگا۔ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ان سر بفلک برف پوش قطار در قطار پہاڑوں کے اندر ناہموار وادیوں کی زمین میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکا۔شکار کے بہانے چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل پڑا۔پر جانے سے پیشتر عنان حکومت نور بخت کو سونپتے ہوئے امراوزراء اور شرفاء سے استدعا کی کہ وہ شہزادی کی معاونت کریں۔بہت دنوں تک جب شہزادے کی بازیابی نہ ہوئی تو جہاں شہزادی کے لئے زندگی اجیرن ہوگئی۔وہیں رعایا اور اکابرین ملک بھی نڈھال ہوگئے۔تاہم انہوں نے شہزادی نور بخت کو سمجھایا بجھایا اور ملکہ کا خطاب دے کر تخت نشین کیا۔

ملکہ نور بخت کا دور بھی امن و آشتی کا زمانہ تھا۔ملکہ مادر مہربان کی طرح تھی۔چار سال حکومت کرنے کے بعد جب وہ چالیس سال کی ہوئی تو عمائدین سلطنت کو خیال آیا کہ تاج و تخت کا وارث نہیں ہے۔ملکہ کے بعد کیا ہوگا۔

اب اکابرین سر جوڑ کر بیٹھے۔وہ ملکہ کی دوسری شادی پر غور و خوض کر رہے تھے کہ

یکا یک بر سرِ دربار ایک پالتو مرغ نے اذان دی۔ آخر میں یہ جملہ اس بے زبان کی زبان پر آیا۔

''بلداس ٹھم ہئ (بروشسکی زبان میں اس کا مطلب ہے بلداس میں راجہ موجود ہے)۔

مجلس مشاورت کے لوگوں نے اس آواز کو سنا مگر کسی نے توجہ نہ دی عینِ گرمئ گفتگو میں اس مرغ نے دوبارہ اذان دے کر''بلداس ٹھم ہئ کے جملے کو پھر دہرایا''۔

اس دفعہ بھی اس آواز کو اہل محفل نے سنا مگر توجہ نہ دی۔ مگر جب تیسری بار بھی یہی جملہ اس نے ادا کیا تو اہل دربار چونک پڑے اور ایک بے زبان کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ کو غیبی اشارہ سمجھ کر چند ہوشیار آدمیوں کو تحقیق حال کے لئے بلداس بھیج دیا۔

آج کل اس چھوٹی سی بستی کو سکارکوئی کہتے ہیں۔ بعض سنیار باغ کا نام بھی دیتے ہیں۔ کیونکہ آبادی کی اکثریت سنار پیشہ افراد کی ہے۔

بہر حال اس زمانے جب یہ کہانی وقوع پذیر ہو رہی تھی یہاں صرف ایک ہی گھر تھا۔ صاحب خانہ کا نام زرگر گڈوس تھا۔ وہ سنار تھا اور طلاکشی کا کام کرتا تھا نیز کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔

جب لوگ وہاں پہنچے۔ انہوں نے ایک خوش رو نوجوان کو دیکھا جو قد آور اور قوی اندام تھا۔ اُس کے ساتھ چند اور بچے بھی تھے جو قد و قامت اور شکل وصورت کے اعتبار سے اس لڑکے سے مختلف تھے۔ صاحب خانہ باہر نکلا۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا ''یہ سب بچے میرے ہیں۔''

وفد اس لڑکے اور زرگر گڈوس کو لے آیا۔ جب وہ لڑکا وزراء و رؤساء کے سامنے پیش ہوا۔ باوجود صغیری کے ایسا تنومند اور طویل وعریض قامت رکھتا تھا کہ دیو پیکر شری بدد کی یاد تازہ ہوگئی۔ تاہم اس کی صورت میں جو زیبائی اور انداز میں رعنائی تھی وہ آذر جمشید کی یاد

دلاتی تھی۔

زرگر گڈوس صحیح بات بتانے سے منکر تھا۔اسے مارا گیا۔سخت دباؤ اور جبر سے کام لیا۔تب جا کر وہ صحیح بات بتانے پر راضی ہوا۔اس نے بتایا کہ آج سے بیس سال پہلے جس صبح شری بدوقتل ہوا وہ حسب معمولی مشینی جہاں دریائے ہنزہ ونگر کا اتصال ہوتا ہے۔سونا نکالنے میں مصروف تھا کہ اس نے یہ صندوق بہتے ہوئے دیکھا۔میں نے دریا میں اتر کر اسے پکڑا۔کھولا تو اندر ایک بچہ تھا۔سرہانے ایک پارچے میں تین سو تولہ سونا بندھا پڑا تھا۔تین شرائط درج تھیں۔میں نے تینوں پوری کیں اور میں اس کا مستحق ٹھہرا۔

ملکہ کو جب اس کا علم ہوا تو بچے کو بلایا۔اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی محبوب شوہر کا نقشہ سامنے آ گیا۔اپنے سینے سے لگایا۔دھواں دھار روئی۔

پھر تاج وتخت اُسے سونپ کر خود گوشہ نشین ہوگئی۔

جب یہ داستان ختم ہوئی اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔کسی کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔گھر والوں کے علاوہ ہمسائیوں کی خواتین بھی آ گئی تھیں۔

تھوشالنگ کا تہوار منانے کا اپنا لطف ہے۔سرفراز کی بہن بولی۔

دسمبر کے مہینے میں سردی کی شدت جب انتہا پر ہوتی ہے اس تہوار کو منانے کے لئے جس پیمانے پر اہتمام ہوتے ہیں وہ لوگوں میں لہو کو گرم رکھنے کا بہانہ بن جاتے ہیں۔

سرفراز کے دادا بولے۔

کوئی گھر ایسا نہیں ہوتا جہاں بکرا' بکری یا گائے ذبح نہ کی جاتی ہو۔غریب سے غریب گھرانہ بھی اس معاملے میں کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔تہوار دسمبر کے وسط میں منایا جاتا ہے۔مگر جانور نومبر کے پہلے ہفتے ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ذبح شدہ جانور کے سر اور انتڑیاں کچی حالت میں سنبھال لی جاتی ہیں۔تہوار کی رات بڑی انتڑیوں کو آٹے سے اور چھوٹی انتڑیوں کو گوشت اور چربی کے ٹکڑوں سے بھرا جاتا ہے۔بروشسکی زبان میں اسے

''جوقص'' کہتے ہیں۔ پھر انتڑیوں اور سر کو شلجموں کے ساتھ ایک بڑی دیگچی میں ڈال کر ساری رات پکاتے ہیں۔ صبح یہ ناشتے میں کھایا جاتا ہے۔

تبھی چوپال میں ڈھول بجانے والے ڈھول بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈھول کی آواز کانوں میں پڑتے ہی خوشی و انبساط کی لہریں ہر بچے و بوڑھے کے جسم و جان میں دوڑنے لگ پڑتی ہیں۔ مرد عورتیں ناچتے گاتے ہوئے گھروں سے نکل آتے ہیں۔ سرِ شام چراغ جل اٹھتے ہیں۔ چوپال کے وسط میں ایک گڑھا کھودا جاتا ہے۔ جلتی ہوئی لکڑیوں کو آوازوں کے شور کے ساتھ اس گڑھے میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ علامت ایک طرح شری بد کو جلا ڈالنے کے طور پر کی جاتی ہے کہ کہیں وہ بدبخت پھر نہ زندہ ہو جائے۔

☆☆☆

باب:18

وادی گلمت ۔ڈاکٹر شیر عزیز، اس کا گھر
طلاکشی

صبح بہت خوبصورت تھی۔ ہنزہ ہلکے نیلے دھوئیں کے غبار میں لپٹا ہوا تھا۔ ڈرائیور لڑکا وقت پر پہنچ گیا تھا۔ سفید ویگن اچھی حالت میں تھی۔ اگلی نشست پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ من وعین یونانی شہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ موٹی موٹی نیلی آنکھیں چمکتا دمکتا گلابی رنگوں ستواں ناک فراخ پیشانی باریک ہونٹ اور سنہری بال۔ سلیقے سے سنورے بالوں اور دیدہ زیب لباس سے غیر ملکی بھی نہیں جان پڑتا تھا۔ میں غیر ملکی سیاحوں کے اتنے مڑے تڑے حلیے دیکھ بیٹھی تھی کہ اب انہیں پہچاننا مشکل نہیں رہا تھا۔

''ڈاکٹر شیر عزیز'' ڈرائیور لڑکے نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتا ہے۔ میرا دوست ہے گلمت میں اس کا گھر ہے اسے وہاں جانا تھا میں نے اسے بٹھالیا ہے امید ہے آپ کو اعتراض نہیں ہو گا''۔

''ارے بھئی کیوں اعتراض ہو گا۔ اتنے خوبصورت اور پڑھے لکھے لڑکے کے ساتھ سفر کرنا تو دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یوں بھی گلمت کا رہنے والا ہے ہمیں ایک پیالی چائے پلانے اپنے گھر تو لے ہی جائے گا۔ کیوں بیٹے؟''

میں نے ہنستے ہوئے شیر عزیز کی طرف دیکھا۔

''ضرور ضرور آنٹی''۔شیر عزیز خوشدلی سے مسکرایا۔

ہمارے درمیان خالہ بھانجے کا رشتہ آناً فاناً ہی استوار ہو گیا تھا۔شفقت آگے بیٹھ گئی میں اور شیر عزیز پیچھے تھے۔

کریم آباد سے نظام آباد تک کا چالیس کلومیٹر فاصلہ کب اور کیسے طے ہوا؟ مجھے اسکا علم تک نہ ہوا۔ڈاکٹر شیر عزیز کی رفاقت حد درجہ معلوماتی اور دلچسپ تھی۔

گلمت اور عظیم آباد کے درمیان انسانی کاریگری کا منہ بولتا شاہکار پل کراس کرتے ہی خدائی کاریگری کے شاہکار نے آنکھوں کو ٹھنڈک دی۔

گاڑی میرے کہنے پر رُک گئی تھی۔ہم لوگ باہر آ گئے تھے۔آبشار دھواں دھار انداز میں بلندیوں سے پستیوں کی طرف بہہ رہی تھی۔

گلمت میں داخل ہوتے ہی میری زبان پر بے اختیار سورہ رحمٰن کی وہ آیت آئی ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

یہاں منہ کو نت نئے ذائقے دینے والی نعمتیں نصیب ہوئی تھیں۔آنکھوں نے حسین نظاروں سے روح کو سیراب کیا تھا۔پھسو کونز دیکھنے کی چیز ہیں۔کون کی شکل کے یہ پہاڑ ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے بنانے والے کی صناعی کے گیت گاتے ہیں۔ہم نے دیر تک ان کا نظارہ کیا۔

گلمت رقبے اور آبادی کے لحاظ سے خاصا بڑا گاؤں ہے۔بائیں ہاتھ دریا زور و شور سے بہہ رہا تھا۔دائیں ہاتھ سڑک کے ساتھ تھانہ اور بچوں کا سکول ہیں۔تھانے کی عمارت بھی نئی ہے اور سکول بھی حال ہی میں تعمیر ہوا تھا۔پیچھے آبادی ہے۔

گلمت کے اس حصے کو چمن گل کہتے ہیں۔

اس سے آگے وسطی گلمت ہے۔وسطی گلمت دراصل پرانا حصہ ہے۔نالہ گلمت دونوں حصوں کو الگ کرتا ہے۔نالے کو پار کرتے ہی دائیں طرف ہوٹل سلک روٹ لاج نظر

آیا۔بائیں طرف ہارس شوہوٹل ہے۔

ڈاکٹر شیر عزیز نے گاڑی رکوادی۔

''آجایئے۔چائے کا ایک کپ پیتے ہیں''۔

ہم لوگ سلک روٹ لاج میں داخل ہوئے۔یہ بیس' پچیس کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت ہوٹل ہے جو کرنل شاہ خان کی ملکیت ہے۔اندر کا ماحول خاصا خوابناک قسم کا تھا۔ دو میزوں پر چند غیر ملکی بیٹھے کولڈ ڈرنک سے دل بہلا رہے تھے۔تین میزیں ملکی لوگوں نے سنبھال رکھی تھیں۔ایک خاندان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔

بچوں کے شور وغل نے پرسکون فضا کو خاصا ہنگامہ خیز بنا رکھا تھا۔

چائے بہت مزیدار تھی۔زہر مہرہ کے وزنی کپوں میں دم دی ہوئی چائے نے طبیعت کو ہشاش بشاش کر دیا تھا۔بل کی ادائیگی میرے بے حد اصرار کے باوجود شیر عزیز نے کی۔بہتیرا کہا بھی کہ میاں تم تو خود ابھی اسٹوڈنٹ ہو۔چھوٹے بھی ہو۔تمہارا خرچ کرنا تو مناسب ہی نہیں۔مگر وہاں ایک ہی رٹ تھی۔

''ارے آنٹی'' آپ ہماری مہمان ہیں''۔

میرے اندر گھد بُد سی تھی۔پتہ نہیں شیر عزیز ہمیں اپنے گھر لے جانے کی دعوت دے گا یا نہیں۔لیکن یہ میں بھی دل میں طے کئے بیٹھی تھی کہ اس کی مہمان ضرور بننا ہے۔ چاہے ناخواندہ ہی سہی۔

مگر شیر عزیز بہت بیبا لڑکا ثابت ہوا۔سلک روٹ لاج سے نکلنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا:

''آنٹی آپ کو گلمت کی مشہور جگہیں دکھادیں پھر گھر چلیں گے''۔

بڑی سڑک سے دو کلومیٹر اندر پولو گراؤنڈ ہے۔مگر پولو گراؤنڈ سے پہلے ایک ہوٹل مارکو پولو ان ہے جسے راجہ بہادر خان اپنے دو بیٹوں کے ساتھ مل کر خود چلاتے ہیں۔گھر کے

ساتھ ہی انہوں نے چھوٹا سا لوک ورثہ میوزیم بنا رکھا ہے۔ کیا خاصے کی چیز تھی؟

انٹری ٹکٹ خرید کر اندر داخل ہوئے۔ برتن، کپڑے، کھیتی باڑی کے اوزار' کڑھائی کے مختلف نمونے' میوزیم کی سیٹنگ لوکل گھروں جیسی تھی۔

بہت لطف آیا اس میوزیم کی سیر سے۔ شیر عزیز نے تاریخی حوالوں سے بھی بہت کچھ بتایا۔

پولو گراؤنڈ کے سامنے جماعت خانہ ہے اور جماعت خانے کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت لائبریری ہے۔ اس میں کم و بیش ڈھائی تین ہزار کے قریب کتابیں ہیں۔

جماعت خانے کے داہنے ہاتھ اسکول اور ریسٹ ہاؤس ہیں۔ یہاں سے کچی سڑک گاؤں جاتی ہے۔ شیر عزیز نے ڈرائیور لڑکے کو اپنی وخی زبان میں کچھ کہا۔

گاڑی کچے پر بھاگی جاتی تھی۔ کھیتوں کے سلسلے دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے کہیں کہیں اکا دکا مکان بھی نظر آتے۔ تقریباً نصف کلومیٹر طے کرنے کے بعد آبادی کے آثار ملے۔ گاڑی گاؤں کے باہر رک گئی تھی۔

ہم لوگ اب پیدل مارچ کرتے ہوئے گلیوں میں سے گزرتے ہوئے دلگرم محلے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں شیر عزیز رہتا ہے۔ گھر کے لوگوں نے خوشگوار مسکراہٹوں سے استقبال کیا۔ گلے لگایا۔ رخسار چومے اور ہمیں بانہوں کے حلقے میں لئے آگے بڑھے۔ ایک خوبصورت گھر جس کے گیسٹ روم میں ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

میں نے پچاس سالہ صحت مند گھبرو مرد حکمت نذر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مجھے امید نہیں تھی آپ لوگوں نے گاؤں میں اتنے خوبصورت گھر بنا رکھے ہیں۔''

وہ اور ان کی حسین بیوی گل اندام ہنسے۔ دونوں اردو سے شُد بُد رکھتے تھے۔ یہ شیر

عزیز کے والدین تھے۔

''ان پختہ کمروں کے پیچھے ہمارا پرانا گھر ہے۔ ہمیں تو اسی میں راحت ملتی ہے۔ یہ حصہ آپ جیسے لوگوں کے لئے بنایا ہے'' اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔

شیر عزیز کے والد کی لمبی چوڑی فیملی ہے۔ والد کے بھائی، اپنے بھائی بہن اور اپنے بچے' سب لوگ اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ کھانا پینا بس الگ ہے۔

شیر عزیز کی دادی بہت دلچسپ خاتون تھیں۔ انہیں اردو نہیں آتی تھی اور ہم وخی زبان سے نابلد تھے۔ رابطے کا ذریعہ شیر عزیز تھا۔ ہنزہ کے بوڑھے لوگ بہت زندہ دل ہیں۔ ان کے چہرے جھریوں سے گھسے پٹے نہیں ہیں۔ ان کے منہ میں مصنوعی دانت بھی نہیں ہیں سچی بات ہے کہ ہنزہ کے بوڑھے جوانوں سے زیادہ قابل رشک تھے۔ سرخ و سفید ملائم ملائم رخساروں والے میٹھی زبان میں باتیں کرتے تو یوں لگتا جیسے پھول گر رہے ہوں۔

دوپہر کا کھانا بہت پر تکلف تھا۔ ہم نے قہوہ پینے کے بعد ظہر کی نماز پڑھی اور پھر شیر عزیز ہمیں سیر کروانے نکلا۔ ہماری سیر خوب لمبی رہی۔ قراقرم روڈ پر آئے۔ یہاں کوز محلّہ میں شیر عزیز کے چند دوست تھے۔ سب ملنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ پڑھے لکھے بے تکلف نوجوان جنہوں نے علاقائی مسائل پر خوب کھل کر باتیں کیں۔ شمالی علاقہ جات کی آئینی حیثیت بھی زیر بحث رہی۔

پولو گراؤنڈ کے دائیں ہاتھ میر کا پرانا محل دیکھا۔ محل اب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ پاس ہی آغا خان ہیلتھ سنٹر ہے۔ ہنزہ میں صحت اور تعلیم جیسے بنیادی مسائل کو اولیت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرح خواندگی تقریباً ۹۰% ہے۔

پانی کا انتظام گلمت میں بہت بہتر ہے۔ پینے کے پانی کے لئے پائپ لائنیں بچھائی ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے نالوں کی خاصی بہتات ہے۔

گلمت اپنے نام کی مانند اسم بامسمیٰ ہے۔یعنی پھلوں کا باغ۔سچی بات ہے وادی پریوں کا مسکن معلوم ہوتی تھی۔ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے،سرسبز و شاداب درخت،ان درختوں سے لٹکتے پھل،برف سے لدی پھندی چوٹیاں،پہاڑوں کے بلند و بالا سلسلے یہ بتاتے تھے کہ جنت بھلا اس سے زیادہ خوبصورت کہاں ہوگی؟

پھر ہم نے آبشار کا پانی پیا۔کیسا پانی تھا ٹھنڈا میٹھا؟ پیاس ہی نہیں بجھتی تھی۔

ہنزہ کے لوگ دراز عمر کیوں نہ ہوں گے کہ قدرت کا انمول عطیہ یہ پانی جانے اپنے اندر کون کون سی دھاتی معدنیات سمیٹے ہوئے ہے۔طاقتور اجزاء سے مالا مال یہ پانی انسانوں اور فصلوں کے لئے کیوں نہ حیات آفرین ہوگا۔

شیر عزیز نے ہمیں وہ جگہ بھی دکھائی جہاں پرانی شاہراہ ریشم کے آثار پائے جاتے ہیں۔اردگرد پہاڑیوں کھڑے تھے جیسے اونچی اونچی فصیلیں ہوں۔

''مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم پریاں ہوں اور جنوں و دیوؤں کی قید میں ہوں''شفقت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

''جان خود میں رہو۔ایسی خوابناک باتیں سوچنے کا فائدہ،ہمارے شہزادے ہمیں اس قید سے چھڑانے کی بجائے شکرانے کے نفل ادا کریں گے۔چلو جان چھٹی''۔

گھر جانے سے پہلے ہم نے درختوں سے کچے سیب توڑ کر کھائے۔خوبانیاں کھائیں۔نوکیلے چٹانوں والے پھسو کونز Passu Cones دوبارہ جی بھر کر دیکھے۔پھسو گلیشئر کا بھی نظارہ کیا۔ہارس شو ہوٹل سے چائے پی۔

''پھسو یہاں سے صرف پندرہ میل ہے۔کیوں نہ ہاں کا ایک چکر لگالیں''۔

میں نے شفقت کی طرف دیکھا۔اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا اور بولی:

''تم اول درجے کی کمینی عورت ہو۔آگے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہو۔تمہارا تو

مفاد ہے۔لکھنا ہے نا تمہیں۔میں یونہی پیسہ اجاڑ رہی ہوں۔آ گے کیا ہے؟ایسے ہی خوفناک ننگے بچے پہاڑ ہونگے۔ایسے ہی درخت اور وادیاں۔بس بہتیری دیکھ لیں۔واپسی کا سوچو اب''۔

''عجیب تلون مزاج ہو۔ابھی پری کی صورت میں جنوں اور دیوؤں کی قیدی بن رہی تھی اور اب''۔

شیر عزیز نے میری بات کاٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا

اگر آپ نے بتورہ گلیشر کا نظارہ نہ کیا اور پھسو کی تاریخ ساز شخصیات غلام ہنر بیگ اور ہمایوں بیگ سے نہ ملیں تو آپ کا یہاں تک آنا بیکار ثابت ہوا۔

شفقت تلملا اٹھی۔''کیوں بیکار ہوا؟جی بھر کر حسن فطرت سے لطف اندوز ہوئی ہوں میں۔خوب سیر کی ہے میں نے۔باقی مجھے کوئی کتاب نہیں لکھنی کہ میں کوہ پیمائی کی تاریخ ساز شخصیات سے ملتی پھروں۔

وہ میز سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔اس کے انداز قامت میں جو تناؤ تھا وہ مجھے بتا رہا تھا کہ وہاں لچک کی قطعی گنجائش نہیں۔

میں چپ چاپ بیٹھی عالم تصور میں برف کے اس دیس کو دیکھ رہی تھی جو سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔درہ خنجراب خوابوں کی وہ جگہ جسے دیکھنے کی ہمیشہ سے بڑی آرزو تھی۔مارکو پولو اور ہیون سانگ کی یہ گزرگاہ اب مجھ سے کچھ زیادہ دور بھی نہ تھی۔خیبر،مارخون،سوست کی وادیاں اور پھر سوست سے ۸۶ کلومیٹر پر خنجراب۔کہیں اندر سے میرے دل میں ایک تمنا نے سر ابھارا تھا۔

''کاش مجھے چودھویں صدی کے اس عظیم سیاح ابن بطوطہ کے دوستوں جیسے ساتھی میسر آسکتے۔میں گھر بار سے بے نیاز ہوسکتی۔''

اس وقت مجھے تھامس جے کرومی یاد آیا تھا۔سیاحت کی دنیا میں کرومی نے جو

نئے انداز اپنائے تھے۔انہوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ابن بطوطہ کو میں نے تھامس کرومی کے حوالے سے ایک مختلف انداز میں پڑھا تھا۔

ابن بطوطہ نے اپنی جہاں گردی کی وضاحت نہیں کی۔کیوں نہیں کی؟ یہ میں نہیں جانتی۔پر اپنے بارے میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔

میں نئی دنیاؤں کے اسرار میں اُسے کھوجنے کی متمنی ہوں۔حسن و رعنائی کے شاہکار آنکھوں میں سمیٹ کر اس سے باتیں کرنے کی آرزومند ہوں۔پیشانی کو اجنبی جگہوں پر رکھ کر روح کی گہرائیوں سے اسے پکارنے کی خواہش مند ہوں۔اے کاش میں آگے بڑھ سکتی۔بہت آگے۔کاشغر یارقند اور سنکیانگ کی سمت ہندوکش دروں سے نکل کر سمرقند و بخارا۔قرطبہ و غرناطہ جا سکتی۔مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمتوں کے نشان کھوج سکتی۔

میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

شام ڈھلے گھر آئے۔شیر عزیز کی والدہ شیر عزیز کی منگیتر کی باتیں کرنے لگیں۔کہیں کہیں شیر عزیز بھی لقمے دینے لگا۔

''آنٹی چار سال ہو گئے ہیں منگنی ہوئے۔دیکھئے کتنا ظلم ہے یہ؟میرا تو شادی کا چوغہ بھی پرانا ہو گیا ہے۔

''ہماری بھابھی بہت خوبصورت ہیں''۔

ڈاکٹر شیر عزیز کی چھوٹی بہن زین کلاس تھری کی سٹوڈنٹ ہے۔شیر عزیز کی منگیتر سوسن پشاور یونیورسٹی میں بی۔ایس۔سی آنرز کی طالبہ ہیں۔

شیر عزیز کا چھوٹا بھائی احمد بھی بھابھی کے ذکر پر بولے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''آنٹی آپ ہمارے بھائی کی شادی پر ضرور آئیں۔وخی شادی بہت دلچسپ ہوتی ہے''۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بھئی احمد ڈاکٹر شیر عزیز بلائے گا تو ضرور آئیں گے''۔

رات بے حد خنکی لئے ہوئے تھی۔

ہر گھر کیطرح یہاں بھی وہ بڑا کمرہ اپنے روایتی رنگوں سے سجا سنورا بہت اچھا لگا تھا۔کھانا یہیں کھایا گیا کمرے کے بیچوں بیچ آگ جلتی تھی۔اطراف میں افرادخانہ بیٹھے تھے۔ایک سمت دادی ماں بیٹھی تھیں۔سب سے پہلے کھانا ہمیں دیا گیا۔ہمارے بعد مردوں کی باری تھی۔عورتوں کو آخر میں ملا۔کھانے کے بعد قہوہ چلا اوراس کے بعد موسیقی کی محفل سجی۔

گوجال بالا کی یہ رات میری زندگی کی چند خوبصورت راتوں میں سے ایک تھی۔ وخی زبان کی یہ شاعری ہماری سمجھ سے بالا تھی۔پر آواز کا اُتار چڑھاؤ' تالیوں کا شوراورگانے والی کا دل کش چہرہ اورآواز سب نے مل جل کر سماں باندھ دیا تھا۔

میری رات خوابوں میں گزری۔کہیں درہ خنجراب میں گھومتے ہوئے۔کہیں کاشغر کی مسجدوں میں نماز پڑھتے ہوئے۔

اگلے دن کوئی گیارہ بجے واپسی کا سفر شروع ہوا۔مجھے گنوتی نہ دیکھ سکنے کاافسوس تھا کیونکہ یہاں بھی فصل ابھی پک رہی تھی۔ویگن تیزی سے پہاڑی موڑ کاٹ رہی تھی۔ ڈرائیور لڑکا بروشسکی گیت گا رہا تھا۔ہوائیں تیز تھیں۔سڑک پر چند بچے بھاگتے دوڑتے اورایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کرتے جارہے تھے۔

تبھی ڈرائیور لڑکے نے پوچھا

''آپ نے دریا سے سونا نکلتے دیکھا ہے کبھی؟''

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سونے کے نام پر چپ چاپ بیٹھی شفقت چلّا کر بولی۔

''کہاں نکلتا ہے؟ یہاں کہیں قریب ہی؟ ہائے دکھاؤ نا''۔

شفقت کا اضطراب قابل دیدنی تھا۔

لڑکے نے ویگن کا رخ ان کچے گھروں اور راونی خیموں کی طرف موڑ دیا جو کچھ فاصلے پر نظر آتے تھے۔

''یہ خانہ بدوش لوگ ہیں۔ان کا کام بس یہی ہے''۔

ویگن رکی اور جب اس میں سے دو خواتین نکل کر باہر آئیں تو خیموں اور گھروں سے بچے عورتیں اور مرد سب آناً فاناً ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔لڑکے نے کوجالی زبان میں ان سے بات کی اور ہماری متعلق بتایا۔مرد کچھ اردو سمجھ اور بول سکتے تھے۔شفقت اس وجہ بے چین تھی کہ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ دریا میں گھس کر سونا نکال لائے۔

سونا بھی کیا چیز ہے کہ اس کے پیچھے انسان پاگل ہوا پھرتا ہے۔کیمیائی تجربات دیسی اور ولایتی فارمولوں سے وہ اس پیلی دھات کو اپنا بنالینا چاہتا ہے۔مالامال ہو جانے کا متمنی رہتا ہے۔

آپ لوگوں کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ سونا کس جگہ ہے؟ میں نے پوچھا۔

''آبائی پیشہ ہے ہمارا۔تجربہ ہمیں سکھاتا ہے۔قسمت یاوری کرے تو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔بسا اوقات گلیشیروں کے نیچے سے بھی سونا نکل آتا ہے۔پھسو سے مشرق کی طرف شمشال ایک پرخطر وادی ہے۔اس کے نالہ شمشال سے کافی سونا نکلتا ہے۔ ویسے اس میں خواری بہت ہے۔بہت سے لوگ جو پہلے طلاگری کا کام کرتے تھے اب اسے چھوڑ گئے ہیں''۔

میں چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح ہمیں دریا سے سونا نکال کر دکھائیں۔فوٹوگرافی بھی مقصود تھی اور ذاتی مشاہدہ حاصل کرنا بھی تھا۔مگر مرد پس وپیش کر رہا تھا۔کچھ لڑکے نے زور دیا کچھ میں نے پیسوں کی پیشکش کی۔چنانچہ ان کی عورتیں اور بچے تمام سامان اٹھا کر دریا کی سمت چل پڑے۔

تقریباً ایک فرلانگ چل کر وہ ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں دریائے ہنزہ کا پاٹ چوڑا تھا اور پانی کا بہاؤ کناروں کی سمت سُست تھا۔مرد جوتے اتار کر پانی میں اترا۔عورت نے اپنے سر سے لکڑی کی ایک بڑی سی ٹرے نما چیز اتار کر پتھروں پر رکھی۔مرد نے کدال سے پتھر ہٹا کر اس ٹرے کو وہاں لٹکایا۔یہ لمبوتری صورت کا ایک ایسا اوزار تھا جو دہانے اور پشت سے تنگ پر اطراف سے خاصی کشادگی لئے ہوئے تھا۔عقبی ایک چوتھائی حصہ شہتوت کی شاخوں اور لوہے کی جالی سے چھت سی بنائے ہوئے تھا۔عورت نے سلور کے ایک بڑے سے کٹورے کے ساتھ جس کی چوبی مٹھ تھی دریا سے ریت نکال نکال کر اس جالی دار چھت پر انڈیلنا شروع کر دی۔پانی بہہ کر واپس دریا میں مل رہا تھا۔ریت ٹرے میں اکٹھی ہو رہی تھی اور کنکر پتھر چھت پر جمع ہوتے جا رہے تھے۔

پھر عورت رک گئی۔مرد نے ریت کو ہاتھوں سے پھرولا۔وہاں جا بجا ننھے ننھے چمکتے سنہری ذرے جگمگا رہے تھے۔

''یہ سونا ہے۔ہم اس میں ایک ایسا مادہ ملاتے ہیں جو ان ذروں کو یکجا کر دیتا ہے''۔

اس وقت ہم دونوں دم بخود ان چمکیلے ذروں کو دیکھ رہی تھیں۔جی چاہتا تھا دریائے ہنزہ میں چھلانگیں ماردیں۔ریت اور لہروں میں ملا ہوا سارا سونا باہر نکال لائیں۔کہیں ایسا ہو جائے تو کتنی ساری خواہش تکمیل پا جائیں۔میں نے بے اختیار سوچا تھا۔شفقت نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔پر اس کی نگاہوں سے چھلکتی گرسنہ سی چمک مجھے اس کے دل کا حال بتائے دیتی تھی۔

تھلپن میں چٹانی کتبے دیکھتے ہوئے میرا جی چاہا تھا کاش داسو کی اس عورت کی طرح مجھے بھی کوئی چودہ پندرہ کلو کا طلائی ہار یا کوئی زیور مل جائے۔مہاراجہ اشوک کے زمانے کا۔میں اسے اپنی چادر میں چھپا کر بھاگ جاؤں۔کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دوں۔ٹوٹے ٹوٹے

کر کے اس کو آہستہ آہستہ بیچوں اور بہت امیر ہو جاؤں ۔

''ہائے رے یہ سونا۔''

آخر ہم ان برازیلیوں سے کیونکر مختلف ہو سکتے ہیں جنہیں دریائے امیزن کے طاس میں سیرا پلادا نامی جگہ پر سونے کی چٹانوں کا علم ہوا تو انہوں نے کھرپیوں اور کدالوں سے زمین کھود کھود کر چھ سو فٹ گہرا اور نصف میل قطر کا گڑھا بنا ڈالا۔

واپسی کے سفر میں تھوڑی دیر خاموشی رہی ۔ شاید افسوس اور پچھتاوا تھا کہ سونا ہاتھوں کی مٹھیوں سے نکل کر دریا میں گر گیا ہے ۔ پھر شوخ و شنگ ڈرائیور لڑکے نے شاہ رستہ بانو کی عشقیہ داستان سنائی ۔

ماضی کے ہنزہ کی شاہ رستہ بانو اپنی ریاست کے ایک رعنا جوان شاہ قلندر سے محبت کرتی تھی ۔ پاؤں میں شاہی بیڑیاں تھیں ۔ پر وہ انہیں خاطر میں نہ لاتی تھی ۔ راجہ کو اس عشق کے بارے میں علم ہو گیا تھا ۔ اس نے شاہ قلندر کے باپ کو بلوایا اور اُسے بیٹے کو قتل کرنے کا حکم دیا ۔ دربار سجا ۔ درباری حفظ مراتب بیٹھے ۔ سازندوں نے ساز بجانا شروع کیا ۔ شاہ قلندر کے باپ نے رقص کا آغاز کیا ۔

باپ کے ہاتھوں میں بل کھاتی دلہراتی قدموں کی تھاپ کے ساتھ تڑپتی اور لشکارے مارتی تلوار میں شاہ قلندر کو اپنی موت نظر آ گئی تھی ۔ باپ ناچتا ناچتا پاس پہنچا ۔ بیٹا کھڑا ہوا ۔ نگاہوں کا تصادم ہوا ۔ شاہ قلندر کی آنکھوں میں رعد جیسے لشکارے تھے ۔

''گردن ایک ہی وار میں کٹ جانی چاہیے ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اپنی اور شاہ کی خیر منا لینا''۔

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا ۔ ساز بند ہو گئے ۔ ہر شخص دم سادھے بیٹھا تھا ۔ باپ نے تلوار گھمائی ۔ شاہ قلندر کی آدھی گردن کٹ گئی ۔

''بس''

اس نے ہاتھ لہرایا اور رجوا با ایک ساتھ دو گردنیں اتار دیں۔

میدان میں تین وجود ٹوٹے ہوئے بکھرے پڑے تھے۔شاہ رستہ بانو بین کرتی وہاں آئی اور شاہ قلندر کی گردن اٹھا کر جنگلوں کی طرف نکل گئی۔

''یہ کمبخت شاہ بھی کیسے خر دماغ ہوتے ہیں۔اپنی منجی کے نیچے کبھی سوٹا نہیں پھیرتے''۔شفقت نے تلخی سے کہا۔

ہوٹل میں پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔چائے پی۔مغرب کی نماز پڑھی۔جب اکبر حسین اکبر کے ہنزہ میں مقیم رشتے دار کا فون آیا۔

''آپ ہر طور کل نگر کے لئے روانہ ہو جائیں۔اکبر نلت میں آپ کا منتظر ہے''۔

کیسی پریشان کن صورت حال نے آ گھیرا تھا۔رانی آف ہنزہ سے دس بجے کا وقت طے تھا۔ادھر اکبر کا نگر دکھانے کے لئے بلاوا آ گیا تھا۔ایک طرف رانی کا وہ افسانوی کردار تھا جس کے متعلق بچپن سے کہانیاں سن سن اور قدرے بڑے ہو کر پڑھ پڑھ کر ذہن نے اتنے روپ تراش رکھے تھے کہ ملاقات کے تصور سے ہی ایک پراسرار سا اشتیاق میرے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔گو بدلتے ہوئے حالات اور وقت نے رانیوں کا وہ افسانوی طلسم توڑ دیا تھا۔مگر حقائق جاننے کے باوجود ذہن اس طلسم سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔

دوسری جانب گلگت کی ایک اہم وادی تھی جسے دکھانے کے لئے ایک اخبار نویس بذات خود موجود تھا۔جتنی تفصیلات اور سیر سپاٹا اکبر ہمیں کروا سکتا تھا اتنا کسی اور ذریعے سے ممکن ہی نہ تھا۔

اس وقت شفقت عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بستر پر آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی۔میں نے صورت حال اس پر واضح کرتے ہوئے اس کی رائے لینی چاہی۔

''عجیب ہو تم بھی۔اکیسویں صدی سر پر کوک رہی ہے اور تم مہارانیوں کے چکر میں پڑی ہوئی ہو۔اپنے جیسے لوگوں کو دیکھو۔نگر چلو۔ایک خوبصورت اور حسین سی صورت

دیکھنے کی بجائے نئے افق اور نئی زمینیں دیکھو۔

''وہ حسین سی صورت دیکھنا بھی ضروری ہے کہ تاریخ میں اس کا کردار ہے''۔

میں نے دھیرے سے کہنا ضروری سمجھا تھا۔

''تو پھر بیٹھی رہو یہاں''۔شفقت جل کر بولی۔

☆☆☆

باب:19

وادی ہلت

اکبر حسین اکبر سے ملاقات

''یہ ہلت ہے۔''

ویگن ہمیں ابھی اس آہنی سٹینڈ کے قریب اُتار کر آگے بڑھ گئی ہے۔جس پر خوبصورت انداز میں لفظ''ہلت'' لکھا ہوا ہے۔ہمارے قدموں کے نیچے شاہراہ ریشم ہے اور داہنے ہاتھ وہ ہرا بھرا گاؤں ہے جہاں ہمیں ابھی جانا ہے۔

ڈھلوانی راستے سے اُتر کر ہم گاؤں میں داخل ہو گئے ہیں۔سیبوں کے بار سے جُھکے درختوں نے ہمیں مسکرا کر دیکھا ہے۔زرد خوبانیاں درختوں کے سبز پتوں میں سے لشکارے مارتی ہمیں کھانے کی دعوتی دیتی ہیں۔ہولے ہولے چلتی ہواؤں نے خوش آمدید کہا ہے۔تنگ تنگ سی دو گلیاں پار کرنے کے بعد ہم کھلی جگہ آ گئی ہیں۔یہاں مویشیوں کے باڑے میں بھیڑ بکریاں بول رہی ہیں۔مرغیاں کٹ کٹ کرتی پھر رہی ہیں۔ایک معمر مرد ہمارے آگے آگے چل رہا ہے۔

''اکبر کا گھر کہاں ہے؟'' جیسا سوال پوچھنے پر اس نے خود ہی رضا کارانہ طور پر ہمارا گائیڈ بننا پسند کر لیا ہے۔

اس وقت جب سورج کی سنہری کرنیں اکبر کے گھر کی منڈیروں سے نیچے اتر رہی تھیں ہم اس کے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہم ایک دورافتادہ پہاڑی علاقے کی ایک وادی کے گھر میں بیٹھے ہیں۔

چھ فٹ سے بھی نکلتی قامت والا اکبر کا باپ ہم سے محو گفتگو تھا۔انہیں اکبر سے

شکایت تھی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر جا بسا ہے۔میرے کان ان کی باتیں سنتے تھے۔مگر نگاہیں دیوار پر آویزاں اس تصویر پر جمی تھیں جس میں اکبر حسین اکبرشنا زبان میں سیرت النبی کی کتاب پر مرحوم جنرل ضیاء الحق سے ایوارڈ وصول کر رہا تھا۔اپنی زمینوں سے اپنے جانوروں اور اپنی اس محدود سی دنیا سے پیار کرنے والا باپ یہ نہیں جانتا تھا کہ ہیرے اگر کانوں سے نکل کر جوہریوں کے پاس نہ پہنچیں تو محض پتھر کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔

ناشتے سے فراغت کے بعد اکبر کے خوبصورت گل کوتھنے سے بیٹوں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔اس کی ایرانی نژاد بیوی غنچہ بانو سے باتیں ہوئیں۔اکبر تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔اس کی بہنیں اور چچیرے بھائی ملنے کے لئے آئے۔

گھر کے درختوں کے رسیلے شہتوت کھانے کے فوراً بعد نلت کے ان پہاڑی مورچوں اور قلعہ نلت کو دیکھنے کا فیصلہ ہوا جہاں نگر کے حریت پسندوں نے انگریزوں کے خلاف ایسی جنگ لڑی جسے آج بھی ''جنگیری لٹی'' کا نام دیا جاتا ہے۔گو اس جنگ میں انگریز فاتح رہے مگر نگر کے جیالوں کی دلیری اور شہ زوری کا خوف ہمیشہ ان پر مسلط رہا۔

اکبر اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لینا چاہتا تھا۔اس کا کزن مارٹن کنوے کی طرح کوہ پیما پارٹیوں کی قیادت کا بڑا شوقین ہے۔کھیتوں اور پھلوں کے باغات سے گزر کر جب ہم پتھروں اور گارے کے بنے ہوئے اس گھر کے دروازے تک پہنچے تو سحر زدہ سی ہو کر وہیں رک گئیں۔کیسا منظر تھا؟

سامنے پہاڑوں کا ایک سلسلہ اندر کی طرف پھیلتا نظر آتا تھا۔ہمارے قدموں سے چار فٹ آگے وسیع وعریض جھیل کے سبزی مائل پانی کی لہریں پہاڑوں کے دامنوں سے ٹکراتی تھیں۔جالو (مقامی کشتی) میں بیٹھے پانچ چھ مرد شنا کا ایک گیت گا رہے تھے۔رحمت ملنگ جان کا گیت

دفتر ہن ملنگ بانئ، شروع تھیوں تھی داستانئ

مئی ہونگ ہن ہرا ستائی' عاشق نوش تو پورس جائی

میری محبوبہ تیری یاد میں' میں نے دفتر کھول رکھا ہے اور تمہاری محبت کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ اگر تجھے اعتبار نہیں تو میں متبرک قسم کھانے کو تیار ہوں۔

گھر کے دروازے پر رسیوں میں پروئی پالک دھوپ میں خشک ہو رہی تھی۔ زمین پر ٹماٹر سوکھتے تھے اور درمیانی عمر کا ایک مرد نیم پختہ بالکونی میں بیٹھا جھیل کے پانیوں کو دیکھتا تھا یا گانا سننے میں ڈوبا ہوا تھا۔

گھر کی عورتیں ہماری آمد کا سن کر کمرے سے باہر آئیں۔ ایک نوجوان عورت نے ایسی فصیح و بلیغ اردو میں گفتگو شروع کی کہ میں گنگ سی رہ گئی۔ یہ اہل لکھنؤ جیسی زبان یہاں ان پہاڑوں میں کیسے؟ پتہ چلا کہ خاتون بیس سال سے کراچی میں رہ رہی ہے۔ بیوہ ہوگئی ہے اور بھائی کے گھر آئی ہوئی ہے۔

ہم لوگ کمروں میں گھومے پھرے۔ چولہے پر پکتے پھلکے دیکھے۔ پتلی سی لکڑی کے پلٹے کے ساتھ لمبے چوڑے پھلکوں کو پلٹا دینے کا ماہرانہ انداز قابل ستائش تھا۔

کمرے میں لٹکتی اس تاریخی بندوق کا دیدار کیا جس نے کئی انگریزوں کو جہنم رسید کیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ اس گھر میں گزارنے کے بعد ہم شاہراہ ریشم کے پار کے پہاڑوں پر چڑھ رہے تھے۔

سانس پھولتا تھا۔ ٹانگیں ہانپتی تھیں اور جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ مچھلی کے جائے کو بھلا کون تیرنا سکھاتا ہے۔ اس ضرب المثل کی سچائی اکبر حسین اکبر کے چھوٹے سے بھانجے کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ چھ سالہ بچہ کس پھرتی اور مہارت سے دائیں بائیں کا خیال کئے بغیر چڑھتا چلا جاتا تھا۔

راستے میں پن چکی چلتی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں آٹے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چشمے کا منہ زور پانی اژدھے کی مانند پھنکارے مارتا تھا۔ انسان نے بھی عناصر فطرت کو کس

طرح اپنی اغراض کے لئے نتھ ڈال دی ہے۔

اور یہاں چڑھائی رُک گئی۔زمین کا یہ حصہ سپاٹ تھا۔درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔گھاس اور جنگلی پھلوں کی بہتات تھی۔درخت کے نیچے بیٹھ کر دائیں طرف کے پہاڑوں کے سینوں پر جابجا گولیوں کے نشانات دیکھنے کو ملے۔

اکبر نے انگشت شہادت سے ان چوٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔جو ہمارے سامنے تھیں۔

یہاں سے نگر کے جیالے انگریزی فوجوں پر پتھر اور چٹانیں پھینکتے تھے۔میں نے نیچے جھانکا۔خوف کی ٹھنڈی لہروں نے مجھے منجمند سا کر دیا۔اپنی ٹانگوں میں درد کی شدید ٹیسوں کا احساس ہوا۔نیچے خوفناک کھائیوں تھیں۔پرلی طرف دریائے ہنزہ بہتا تھا۔

اکبر نے دُوربین مجھے تھمائی اور کہا میون قلعہ دیکھئے۔لڑائی کی تفصیل مجھ سے سنیئے۔اکبر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ میں دوربین کے زوایے درست کرتی گئی۔نلت نالہ بہت گہری خندق سے گزرتا ہے۔اس کے عین بالمقابل بہت اونچی پہاڑی ہے۔

دوربین ایک مقام پر جیسے رُک گئی۔میرے ہاتھ اور سارا وجود ساکت ہو گیا۔
شفقت اپنی باری کے انتظار میں تھی چلائی۔

''دم لو''

میں نے غصے سے کہا۔راکاپوشی کے جلوؤں نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے''۔
شفقت چھینا جھپٹی پر اتر آئی تھی۔دوربین اس کے ہاتھوں میں پٹختے ہوئے میں اکبر کی طرف متوجہ ہوئی۔جائے وقوع میں سمجھ بیٹھی تھی اس لئے اکبر کی باتیں میری کھوپڑی میں سما رہی تھیں۔

نگر والوں نے نلت نالہ کے دوسری طرف دریا کے کنارے سےلیکر راکاپوشی کے دامن تک پہاڑی پر مورچہ بندی کی تھی۔انگریزوں نے نلت نالہ پار کرنے کی کئی بار

کوشش کی۔مگر نا کام رہے۔جونہی نگر والوں کو ذرا سا شک پڑتا۔وہ بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں اوپر سے لڑھکا دیتے۔رات کو روغنی لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو آگ لگا کر دشمن کی خندقوں میں پھینکتے۔محاصرہ بہت طول پکڑ گیا تھا۔

بالآخر انہوں نے قاسم خان نامی ایک شخص کو خریدا اور اسے نگر والوں کے خفیہ مورچوں تک پہنچنے کا کام سونپا۔قاسم خانے نے ایک پہاڑی پگڈنڈی تلاش کی۔آٹے کا تھیلا لیا۔اُس تھیلے کے نچلے حصے میں سوراخ کیا۔اسے کمر پر لادا۔وہ جہاں جہاں سے گزرا۔تھیلے سے آٹا نکل کر زمین پر گرتا گیا۔راستے کی نشان وہی کے ساتھ ہی انگریز فوج کے دستے نگر والوں کے سر پر پہنچ گئے۔

ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر اکبر نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''بہت خوفناک لڑائی لڑی گئی۔دست بدست۔اکثریت نہتوں کی تھی اور جب کچھ بن نہ پڑا تو وہ جیالے دشمن کے ایک ایک فوجی کو ساتھ لے کر چوٹیوں سے کھائیوں میں کود گئے۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا جیسے میرے سینے میں مچلتا جذبات کا بھانبڑ مجھے پاگل سا کئے دے رہا ہے۔میں کھڑی ہوگئی تھی۔میرے انداز میں اضطراب سا تھا۔میری وہ نگاہیں شاکی سی تھیں جنہوں نے کوہساروں وکھائیوں اور ان دشوارگزار راستوں کو آخری بار دیکھا۔

اور جب میں نیچے آرہی تھی میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

آخر میں یہ کیوں چاہتی ہوں کہ کسی نہ کسی طرح ان سب بے حس لوگوں کو کھینچ کر یہاں لے آؤں۔انہیں یہ سب دکھاؤں۔انہیں جو ہماری تقدیروں کے مالک بن کر ہماری معصومیتوں سے کھیل رہے ہیں۔انہیں کون سمجھائے کہ آزادی حاصل کرنا کس قدر مشکل تھا؟اس کے لئے کتنی قربانیاں دی گئیں؟

تین بجے گھر پہنچے تو معلوم ہوا سب لوگ کھیتوں پر گئے ہوئے ہیں۔چند روز تک

گندم کی کٹائی ہونے والی تھی۔

یہاں گنوتی کا تہوار نہیں منایا جاتا۔ میں نے اکبر کی طرف دیکھا۔

شاہراہ ریشم کی تعمیر نے بہت سی معاشرتی اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہاں زندگی اب بہت تیز ہے۔ یوں بھی نگر شیعہ مسلک سے منسلک ہے۔

کھانے میں پلاؤ اور مرغی کا شوربہ تھا۔ زمانوں بعد میں نے مرغی کو کھال سمیت کھایا تھا۔

نماز پڑھی۔ چائے پی۔ ذرا دم کو آنکھیں بند کیں۔

باہر کوئی بولتا تھا۔ آواز بتاتی تھی کوئی بوڑھا ہے۔ زبان سمجھ نہ آنے کے باوجود ناراضگی کے اظہار کو نمایاں کرتی تھی۔

اس وقت جب شفق پھولتی تھی۔ پچھمی ہوائیں سیبوں اور خوبانیوں کے پیڑوں کے پتوں کو گدگداتی پھرتی تھیں۔ میں اکبر کی بیوی کے پاس بیٹھی اُس سے اس اونچی اور غصیلی آواز کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

بڑے سے چولہے میں لکڑیاں جلتی تھیں۔ ان کی تپش غنچہ خانم کے گلابی رخساروں کو اور گلابی کیئے ہوئے تھی۔ میرے سوال پر اُس نے نگاہیں اٹھائیں۔ مجھے اداس نظروں سے دیکھا اور بولی "میری بیٹی بیٹوں سے زیادہ دودھ پیتی ہے۔ چھوٹی ہے نا۔ سُسر جی کو غصہ ہے کہ میں اسے جلد جوان کر رہی ہوں"۔

عین اس لمحے مجھے اپنے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ اپنے بچپن کی یادداشتوں میں ارتعاش سا محسوس ہوا۔ یوں جیسے گھر کے کسی کونے میں پڑے خاموش ستار کے کسی تار پر کوئی اچانک انگلی پھیر دے اور وہ بج اٹھے۔

وادی نلت کے گھر کا وہ باورچی خانہ جس کے چولہے کے سامنے بیٹھی غنچہ خانم اکبر لکڑی کے بڑے سے چوکور ڈبے میں آٹے کی پنی کو خشکے میں مسل مسل کر گوندھ رہی تھی۔

میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ایک کچے آنگن میں کھڑی تھی۔ جہاں میری خوبصورت زیتونی رنگ والی دادی دہی بلوتی تھی۔اس کی رنگین مدانی میں گھنگھرو بجتے تھے۔ سڈول کلائیوں میں ہاتھی دانت کا چوڑا لشکارے مارتا تھا۔مہندی رنگے بال شفق کی لالی کو مات کرتے تھے۔

مکھن کے بڑے بڑے پیڑوں کو چاٹی میں سے نکال کر ہاتھوں میں اچھال اچھال کراس کی جذب شدہ لسی کو خارج کرتے کرتے وہ ڈلارسے اپنے پوتے کو آوازیں دیتی جاتی۔

''اٹھ جا شہزادیا۔اٹھ جا پتر۔اٹھ میرے چناں' اٹھ میرے سوہنیا۔اٹھ میرے مکھناں''

اور یہ شہزادۂ یہ سوہنا کسلمندی سے کروٹیں بدلتا رہتا۔پر آنکھیں نہ کھولتا۔دھوپ بنیروں سے نیچے آنے لگتی۔بکائن اوروں کے درختوں میں چڑیوں کی چہکار کم ہوجاتی۔تب کہیں وہ اوں آں کرتا پاؤں دھرتی پر رکھتا۔منہ دھونے میں سونخرے کرتا۔اور جب وہ رنگین پایوں کی پیڑھی پر بیٹھا باسی روٹی پر مکھن کا پیڑا رکھے کھا رہا ہوتا۔میں حریص نظروں سے اُسے تکتی۔میرا جی جھپٹا مار کر اپنے بھائی کے ہاتھوں سے وہ چنگیر اڑا لینے کو چاہتا۔پر مجھے اپنی دادی سے ڈر لگتا تھا۔میری دادی جو ہر وقت میرا سیاپا کرتی رہتی تھی۔

میری ماں نے اگر میری آنکھیں پڑھ کر مجھے کبھی گھی مکھن دینے کی کوشش بھی کی تو یہی سنا

''چھوٹ کوئی لڑکیوں کو بھی یہ چیزیں کھانے کو دیتا ہے''۔

لہٰذا میرا بچپن بیچاری لسی میں کلوریاں کرتے گزرا۔نہانے دھونے میں لسی پینے میں لسی روٹی کھانے میں لسی سرد مزاج لسی جو لڑکیوں کو جلد جوان ہونے سے روکتی ہے۔پر میں نے بھی گیارھویں سال میں ہی جوان ہوکر ان احتیاطی تدابیر پر پانی پھیر دیا تھا۔

میں نے غنچہ خانم کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔میری بولتی آنکھوں اور بولتے ہاتھوں نے کسی حد تک اُسے وہ سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی جو میرا تجربہ تھا۔زبان کو زحمت اس لئے نہیں دی کہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر اکبر کی بڑی بہن آکر بیٹھ گئی تھی۔

اس نے تو اچڑھایا۔خشکے میں گوندھے آٹے سے روٹیاں پکانی شروع کر دیں۔ آٹا گوندھنے کا یہ نیا طریقہ تھا جو میں نے یہیں دیکھا تھا۔گاؤں میں مرگ ہوگئی تھی اور رواج کے مطابق ہر گھر سے دو آدمیوں کا کھانا وہاں جانا تھا۔غنچہ نے سب پہلے سوگ والے گھر کا کھانا نپٹایا۔

پورے گھر کے لئے روٹیاں پکنی تھیں۔رات تیزی سے اتر آئی تھی۔شفقت اور میں دونوں روٹیوں کی سینکائی میں جت گئیں۔

اکبر کی بڑی بہن ادھر ادھر کے چکر کاٹتی پھرتی تھی۔میں قدرے متعجب تھی کہ وہ بھاوج کے ساتھ اس کا ہاتھ نہیں بٹا رہی ہے۔میں نے غنچہ کی طرف دیکھا۔میری آنکھوں میں جھلکتے سوال کو اس نے سمجھا اور دھیرے سے بولی۔

''کچھ بیمار رہتی ہے۔کھیتوں پر کام کر آئے تو پھر گھر کا کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے''۔

دھان پان سی اکبر کی بیوی کے لئے گرمیوں کی چھٹیاں عذاب تھیں۔

''ابھی گندم کی کٹائی کرنی ہے۔پھر اسے سمیٹنا ہے۔سیب درختوں سے اتار کر محفوظ کرنے ہیں۔ان تین ماہ میں جان ہلکان ہوجاتی ہے''۔

اس کی بڑبڑاہٹ بڑی مدھم تھی۔پر مجھے یہ مدھم اور بے ربط ہونے کے باوجود پوری پوری سمجھ آرہی تھی۔آخر کیوں نہ آتی۔کبھی میں بھی اسی کشتی کی سوار تھی۔پانچ سال تک سسرال نے مجھے جس جس انداز میں مانجھا پھیرا اور رگڑائی کی۔اُس نے چھٹی کا دودھ یاد آنے والے محاورے کا عملی نقشہ دکھا دیا تھا۔

رات کا کھانا ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے کھالیا۔عشاء کی نماز پڑھی ۔سونے کے لئے جس کمرے میں آئے ۔ وہ بڑا فینسی ٹائپ کا تھا۔ ڈبل بیڈ جس کا اخروٹ کی لکڑی کا لشکارے مارتا کراؤن نظروں کو مسحور کرتا تھا۔پائنتی پر دھرے ایرانی کمبل ایسے نرم گرم اور گداز کہ جونہی اوپر لئے یوں محسوس ہوا جیسے ماں کی گود میں سمٹ گئے ہیں ۔دیدہ زیب قالین نے پورے فرش کو ڈھانپا ہوا تھا۔نیلی دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز جلوہ افروز تھیں ۔

خوابگاہ تو جیسے مہاراجہ ہری سنگھ نلوہ کی لگتی ہے ۔

شفقت نے بیڈ پر تین چار پینترے بدلتے ہوئے کہا۔

اکبر حسین اکبر نے زندگی کی دوڑ میں جدو جہد سے نہ صرف نام اور دام کمائے ۔ بلکہ زندگی کو سلیقہ سے گذارنے کا انداز بھی سیکھا۔اچھا شوہر'اچھا باپ'ایک اچھا بیٹا اور ایک اچھا انسان اس کی شخصیت کے خوشگوار پہلو تھے ۔

سونے سے قبل اکبر ہمیں بتا گیا کہ پو پھٹنے سے قبل گاڑی آجائے گی ۔کل نگر خاص چلنا ہے ۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سکون اور اطمینان کا لمبا سانس بھرا تھا۔

☆☆☆

باب:20

نگر خاص جانا ۔ راکاپوشی کے جلوے
دانیال شو ۔ محبتوں کے چند پھول
کیپٹن بابر کے حضور

یہ نکہت و نور میں ڈوبی ہوئی ایک دل آویز سحر تھی۔صبح صادق کا اجالا ابھی پھیلا ہی تھا۔جب میں چھت پر چڑھ گئی تھی اور اس وقت کائناتی حسن کے عشق میں پور م پور غرق تھی۔ ہمارے نصیب میں شیشے جیسی چمکتی ایسی صبحیں بھلا کہاں تھیں؟ ہواؤں میں پھلوں اور پھولوں کی رسیلی باس گھلی ہوئی تھی۔درختوں کی ہریالی اور طراوت دل کو سکون اور طمانیت بخشتی تھی۔میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ہریالی کو جذب کرنا چاہتی تھی کہ شاید آنکھوں کا گدلا پن دور ہو جائے۔ناک اور منہ کھول کر ہواؤں کو اپنے اندر گھسیڑ رہی تھی کہ پھیپھڑوں میں جمی غلاظتیں خارج ہو جائیں۔

''انسان بھی کیسی کمینی شے ہے۔ہر جگہ اور ہر حالات میں وہ صرف اپنی ذات اور مادی فوائد کی گھمن گھیریوں میں ہی الجھا رہتا ہے۔

قہوے کی مسحور کن خوشبو میرے نتھنوں میں گھسی

''اے کاش اس وقت مجھے چائے کا ایک کپ مل سکتا''۔میں نے طلب کے ہاتھوں مغلوب ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

غنچہ خانم شائد چائے بنا رہی تھی۔چائے کی اس ذلیل لت نے مجھے بہت ندیدہ بنا دیا ہے۔میری آنکھیں بلا وجہ ہی پرائے گھروں کے چولہوں کی تاکا جھانکی میں خوار ہوتی رہتی ہیں کہ کب ان پر دیگچی چڑھے؟ کب قہوہ بنے؟ کب پیالہ میرے ہاتھ میں آئے؟

دنیا کی سیاحت میرا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر شاید کبھی حاصل نہ ہو۔ یوں یہ اور بات ہے کہ میں رک سیک اپنی پشت پر لٹکائے ترکی کے محلوں، غرناطہ کی گلیوں اور قرطبہ کے بازاروں میں گھومتی پھرتی رہتی ہوں۔ پو پھٹتی کسی خوبصورت سی صبح یا کسی ملگجی سی شام میں گلیوں میں چکر کاٹتے ہوئے میرے قدم رک جاتے ہیں کہ کسی گھر کے باورچی خانے کی جالی سے قہوے کی خوشبو نے مجھے بے بس کر دیا ہے اور میں بے اختیار تھڑی پر بیٹھ کر اپنا کشکول نیم کھلے دروازے سے اندر بڑھا دیتی ہوں کہ میں چائے یا کافی کے چند گھونٹ لئے بغیر بغیر آگے جا ہی نہیں سکتی ہوں۔

میں نیچے آ گئی۔ خنک ہواؤں نے میرے لوں لوں میں ٹھنڈک رچا دی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشگوار حرارت کا احساس ملا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر کمبل سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا۔ شفقت باتھ روم میں تھی۔ پانی کے شل شل گرنے کی آواز مجھے جانے کیوں بری لگ رہی تھی؟ جی چاہتا تھا ٹونٹی فوراً بند کر دوں۔ شفقت نے باہر نکل کر مجھے خفگی سے دیکھا اور بولی۔

''کمال ہے۔ اُٹھا دینا تھا۔ نماز ہی پڑھ لیتی''۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں جانتی ہوں وہ نیند کی دھنی ہے۔ لاکھ ٹکریں مارو۔ مجال ہے ''ہوں ہاں'' کے سوا کوئی جواب دے جائے۔

اکبر نے ناشتہ تیار ہونے اور جیپ آ جانے کی اطلاعات اکٹھی پہنچائیں۔

ناشتے سے فارغ ہوئے اور جیپ میں بیٹھے۔ خدا کا شکر تھا۔ غنچہ خانم ہمارے ساتھ جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''کیسے'' میرے پوچھنے پر اس نے اپنا پورا دہانہ کھول دیا۔ آنکھوں کو معنی خیز انداز میں گھمایا۔

جواباً میں ہنس دی۔

سونا لٹاتی کرنوں والی اس البیلی صبح کو ہم ۲۵۵۵۰ فٹ بلند راکاپوشی چوٹی کے دامن میں پھیلے علاقے جو دریا کے بائیں کنارے پر پھنس گہ سے ہسپر گلیشیر تک اور دریا کے دائیں کنارے کوج بالا سے خضر آباد تک ہیں کی سیاحت کے لئے نکلے تھے۔

''آیت الکرسی پڑھ کر پھونک لیں۔خانم ہنسی تھی۔بہت پر خطر راستے ہیں۔''

''ان کے لئے نئے نہیں''۔

اکبر نے یہ کہتے ہوئے شاہراہ قراقرام پر گاڑی چوتھے گیر میں ڈال دی۔

دریا کے ایک طرف ملت کی وادی ہے پار چھلت کا گاؤں ہے۔کبھی چھلت کی وادی ہنزہ اور گلگت کے درمیان سرحدی چوکی کا کام دیتی تھی۔چھلت سے گلگت کا فاصلہ ۲۶'۲۵ میل کا ہے۔چھلت کے ساتھ چھپروٹ کا گاؤں ہے۔

اکبر کو یہاں کچھ کام تھا۔یہ گاؤں پولو کے بہترین کھلاڑیوں کے لئے بہت شہرت رکھتا ہے۔وزیر سرور خان ،غلام عباس ،داؤد خاں اور درویش جیسے مایہ ناز کھلاڑی اسی گاؤں کے ہیں۔

محکمہ زراعت کی کوششوں نے رہن سہن میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔شاہراہ قراقرم کے دائیں بائیں پھلوں کے باغات ہیں۔مدرسے اور ڈسپنسریاں کام کر رہی ہیں۔

خضر آباد کی وادی حسن و رعنائی کے گہنوں سے لدی پھندی دامن دل کو بار بار کھینچتی تھی۔

شاہراہ قراقرم کے داہنے ہاتھ وہ معلق پل ہے جسے پار کرنے پر نگر خاص کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔یہ گلگت سے ۵۷ میل کے فاصلے پر ہے۔

راکاپوشی کی برف پوش چوٹی پر دھوپ کی تپش دھوئیں کے بادل اُڑا رہی تھی۔ان بادلوں کو دیکھتے دیکھتے میرے ذہن جانے کیوں بھٹکنے لگا تھا؟

جانے کتنے انقلاب اس راکاپوشی نے دیکھے ہونگے؟ عروج و زوال کی کتنی

داستانیں اس کے دامنوں میں محفوظ ہونگی؟ جانے یہ کب سے یونہی کھڑی دنیا کو اپنے پیچھے پاگل کیے ہوئے ہے؟اور خوداس کا اپنا وجود بدلتے وقت کے ساتھ کتنا بدلا ہوگا؟

جیپ کی رفتار خاصی تیز تھی۔چاروں طرف سر بفلک پہاڑوں کا احاطہ تھا۔

''یہاں دھوپ کم نکلتی ہے۔اکبر بتا رہا تھا۔سورج کا رخ نہ ہونے کی وجہ سے سردی کی شدت زیادہ ہے۔نگر ۱۴۰۰ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی وادی ہے۔جہاں لوگوں کی اکثریت شیعہ مسلک سے متعلق ہے۔سیدھے سادھے مخلص اور مہمان نواز لوگ جو نہ شراب پیتے ہیں اور نہ کشید کرتے ہیں جو سادہ زندگی بسر کرتے ہیں مگر اپنے مذہبی تہوار محرم دعیدین اور نوروز بڑی شان وشوکت اور دھوم دھام سے مناتے ہیں۔

محرم کی عزاداری کے لیے بلتستان سے ذاکرین اور علماء آتے ہیں۔امام بارگاہوں میں نوحہ خوانیاں دسینہ کوبیاں اور زنجیر زنی بھی کی جاتی ہے۔جلوس دعلم بڑی شان وشوکت سے نکالے جاتے ہیں۔چہلم امام تک سوگ میں رہتے ہیں۔نوروز کی عید بھی تزک و احتشام کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔آفتاب اپنے بارہ برجوں سے گزر کر جس گھڑی پھر پہلے برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔اس وقت وظائف پڑھے اور تعویزات لکھے جاتے ہیں۔مرغ ذبح کر کے مٹھائیاں اور پھل تقسیم ہوتے ہیں۔

یہاں بہت پس ماندگی ہے مگر ہنزہ کی نسبت تعلیمی اور معاشی لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔اکبر کسی قدر افسردگی سے بولا۔

وادی بڈہ لس میں اکبر ہمیں اس گرم چشمے پر لے گیا جس کی شہرت اندرون ملک کم اور بیرون ملک زیادہ ہے۔جلدی بیماریوں اور جوڑوں کے درد کے لئے یہ پانی اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔قدرت نے جانے کون سی معدنیات کا اس میں رچاؤ کر دیا ہے کہ زندگی سے مایوس لوگ یہاں آتے ہیں اور شفایاب ہو کر جاتے ہیں۔

اس گرم چشمے کی کراماتی کہانیوں میں سے جس کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا۔وہ

اس انگریز کی تھی جو چھ فٹی قامت پر نو کیلے نقش و نگار کے ساتھ مشرقی کلچر سے خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ کپتان تھا اور جالندھر چھاؤنی میں تعینات تھا۔ شادی کر کے نئی نویلی دلہن کو انگلینڈ سے لایا تھا۔ اس کے یہ دن مرادوں کے تھے جس کے ہر ہر لمحے پر اُسے جنت کا گمان ہوتا۔ یہ جنت جہنم میں بدل گئی۔ جس دن اس کے جسم پر پھنسیاں نمودار ہوئیں۔ خارش شروع ہوئی اور کھال اترنے لگی۔ وہ ڈاکٹروں کے پاس بھاگا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اس کی وہ جان جگر جو ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھاتی تھی۔ انگلینڈ بھاگ گئی اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ چھوت کی بیماری اسے نہ چمٹ جائے۔ اپنے کسی تجن بیلی سے اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا

''یار یہ یورپی عورت تو بڑی تھڑ دلی، بے مہر اور انسانیت سے عاری ہے۔ دیکھو تو کیسے چھوڑ گئی ہے مجھے؟''

وہ تھک گیا تھا۔ پھر کسی نے اسے بڑھ دلس کا پتہ بتایا۔ وہ یہاں پہنچا۔ ہفتوں یہاں رہا۔ صحت یاب ہوا۔ اس کی سفارشات پر یہاں آنے والوں کے لئے ایک ریسٹ ہاؤس تعمیر ہوا۔

بعدازاں اس انگریز نے گجرات کاٹھیاوار کی ایک گجراتی عورت سے شادی کی اور اسے لے کر انگلینڈ چلا گیا۔

چشمے کے قریب پتھروں پر بیٹھی بھاپ کے مرغولوں کو اوپر فضاؤں کی طرف پرواز کرتے ہوئے دیکھ کر میں نے بے اختیار اپنے آپ سے کہا تھا۔

''کسی کتاب، کتابچے، پی ٹی ڈی سی کے کسی پمفلٹ میں اس چشمے سے متعلق کوئی بات نہیں لکھی گئی۔ کاش اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہوجاتا تو میں اپنی بیٹی کو ساتھ لے آتی۔ اس کے صحت افزا پانی میں اسے نہلاتی۔ اس کی خارش زدہ گردن جو آئے دن زخموں سے لہولہان رہتی ہے۔ شاید ٹھیک ہی ہوجاتی۔

میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پر فوراً نکال لیا۔ پانی میری برداشت سے زیادہ گرم تھا۔

غنچہ کا بڑا بیٹا پانی دیکھ کر نہال ہوا جاتا تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح آگے تک چلا جائے۔ ماں نے ڈانٹ ڈپٹ سے روک رکھا تھا۔ اکبر نے کہا بھی کہ نہلا دو اس کے لئے اچھا ہے۔

پر وہ نہیں مانی۔ پانی گرم تھا۔ ہوائیں ٹھنڈی تھیں اور بچہ پہلے ہی نزلے زکام سے سُوں سُوں کرتا تھا۔

میں نے اپنی زنبیل میں ہاتھ ڈال کر پڑیوں میں بند چینی پتی دودھ نکالا۔ چھوٹی تھرماس نکالی۔ خانم نے میرے ارادے بھانپتے ہوئے چلا کر کہا۔"ارے ارے کیا کرنے لگی ہیں۔ پانی بے شک بھاپیں چھوڑ رہا ہے۔ مگر سلفر جیسی معدنیات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تو بس جلدی امراض کیلئے ہی اکسیر ہے۔

اکبر ریسٹ ہاؤس کی طرف گیا ہوا تھا۔ وہ جب آیا تو اس نے بیوی کی بات کی تائید کی۔

یہ وادی خالص آفتابی سلاجیت کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔

ریسٹ ہاؤس سے ہم نے چائے بنوائی اور پی۔ اس خوبصورت ماحول میں چائے کے ایک کپ نے کیسا لطف دیا۔ یہ شاید الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

ولی آباد میرے لئے بہت بابرکت وادی ثابت ہوئی۔ مقامی کلچر کے جو مختلف رنگ دیکھنے کے لئے میں یہاں وہاں بھاگی پھرتی تھی۔ اس کی ایک جھلک یہاں دیکھنے کو ملی۔

وادی میں کوہ پیاؤں کی ایک ٹیم آئی تھی۔ جاپان، اٹلی، سویڈن، یوگوسلاویہ، اسپین اور امریکہ کے مہم جوؤں کا یہ ٹولہ دنیا کے ستائیسویں بڑے پہاڑ راکاپوشی کو سر کرنے کے لئے

یہاں پہنچا ہوا تھا۔

''لیجئے آپ کے من کی مراد پوری ہوگئی ہے۔''

اکبر جو گاڑی روکے کسی مقامی مرد سے باتیں کر رہا تھا۔ ہنستے ہوئے میری طرف آیا۔

''ایک خوبصورت شو آپ کا منتظر ہے۔''

میرے اندر جیسے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

اکبر گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا پولو گراؤنڈ کے پاس کھلی جگہ آ گیا۔

گاؤں کے تمام لوگ وہاں جمع تھے۔ سامنے سٹیج بنی ہوئی تھی۔ مہمانوں کے لئے اگلی قطار میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ دریوں پر بیٹھے تھے اور اکثریت پتھریلی زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔

اسسٹنٹ کمشنر جناب داؤد صاحب بھی دورے پر اس طرف آئے ہوئے تھے۔

داؤد صاحب سے میری اچھی علیک سلیک ہے۔ شگر میں میرا قیام ان کے پاس تھا۔

''تو آپ یہاں بھی پہنچ گئی ہیں''۔

''یہاں تو آنا چاہیے تھا۔ آپ کی جائے پیدائش ہے یہ''۔

داؤد صاحب خوشدلی سے ہنسے اور ہمیں اکبر کے ساتھ لے کر آگے بڑھے۔

دائیں ہاتھ سازندے اپنے اپنے سازوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ غنچھپ میں تھی۔

میں اور شفقت اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔

یہ تقریب دانیال کے سلسلے میں تھی۔

دانیال شمال علاقہ جات کا ایک ایسا کردار ہے۔ جو جب جنوں کے عالم میں ہو تو پریاں اور جن اس کے پاس آتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں واقعات پُراسرار کہانیاں اور مختلف النوع چیزوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

''اللہ انسان کس قدر سیماب فطرت ہے۔اپنے کل کو جاننے کے لئے کیا کیا ڈھونگ رچاتا پھرتا ہے؟دور افتادہ پہاڑوں میں رہتا ہویا ماڈرن بستیوں کا مکین ہو۔کل کے بارے میں جاننے کیلئے مرا جاتا ہے۔کبھی رمل کے ذریعے' کبھی جوتش' نجوم' علم ہندسہ' سرودھا (سروں کا علم جس سے قسمت کا حال معلوم کیا جاتا ہے) کے واسطے سے قسمت کا حال جاننا چاہتا ہے۔

ایک بار میں اپنی ایک دوست کے گھر گئی۔سارے فیملی ممبر پورچ میں مٹی کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے تھے۔گندی مندی سی جینز اور ٹی شرٹ پہنے ایک ہپی ٹائپ نوجوان عامل کا کردار ادا کر رہا تھا۔میری دوست کی والدہ آنکھیں بند کئے مٹی کے ڈھیر پر انگلی سے لکیریں لگا رہی تھیں۔ان لکیروں سے وہ قسمت کا حال بتاتا تھا۔سارے گھر والے دم سادھے بیٹھے تھے۔

نوجوان نے کچھ سال یونان میں گزارے تھے۔جہاں اس نے جیومینسی کا علم سیکھا تھا۔اور اب اسی علم کو بروئے کار لا کر وہ لوگوں کو کل کے بارے میں بتاتا تھا۔

پتہ نہیں یہ سچ تھا یا جھوٹ

اور اب جب ہم ایک ایسا ہی تماشہ دیکھنے والے تھے میں نے اکبر سے پوچھا۔

کہیں یہ دانیال حضرت دانیال علیہ السلام بننے کی کوشش تو نہیں کرتے جنہیں علم رمل عطا ہوا تھا جو بہر حال ایک مسلمہ امر ہے۔

''اس کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

سٹیج سے قدرے فاصلے پر پتھر کے چولہے پر ایک برتن میں چیلی کے پتے گھی میں تلے جا رہے تھے۔

''زمانہ بدلتا جا رہا ہے۔اب ان باتوں کی وہ اہمیت نہیں رہی جو کبھی تھی۔ماضی میں حکمران اپنے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ دانیال اور سازندوں کو بلایا کرتے تھے''۔

داؤد صاحب بتا رہے تھے۔

چیلی کے تلے ہوئے پتوں پر انگارے ڈال دیئے گئے۔فضا میں عجیب سی باس کا دھواں پھیل گیا۔

تبھی ایک سمت سے ایک لمبا اونچا کھلے ہاتھ پاؤں والا شخص جھومتا گاتا آیا۔وہ جیسے مدہوش سا تھا۔اسی مدہوشی میں وہ بازوؤں کو اُوپر نیچے جھولے جُھلاتا دھوئیں کے غبار میں چلا گیا۔کبھی کبھی وہ اپنے اردگرد لپٹی ہوئی چادر میں دھوئیں کو گھیر گھیر کر اپنے جسم میں داخل کرنے کی کوشش کرتا۔سازندوں نے بڑی تیز دھن بجانی شروع کی۔ساتھ ہی تماش بینوں نے سیٹیوں اور تالیوں سے فضا میں ہلچل مچا دی۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔خوفناک اور ڈراونی سی۔ہمارے وہم وگمان سے بھی بالا۔

دانیال تیزی سے چلتا ہوا ہماری طرف آیا۔اس نے اپنا داہنا پاؤں زور سے زمین پر مارا۔شفقت کے عین سامنے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جنگلی بھینسے کی طرح ڈکرایا۔

بوہ بوہ (جاؤ جاؤ) کہتے کہتے یوں دھاڑا کہ سارے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔سازندوں کے ساز خاموش ہو گئے۔مجمع میں کسی آواز کی بھنبھناہٹ تک نہ تھی۔وہ انگشت شہادت سے شفقت کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ہمارے سانس سینے میں کہیں رک گئے تھے۔چہروں کے رنگ فق اور سارا سراپا جیسے کانپتا تھا۔

''اوہو''

اس شو کے منتظمین میں سے دو تین بھاگتے ہوئے اکبر کے پاس آئے۔شنا زبان میں اس سے چند باتیں کیں۔اکبر ہنس پڑا۔شفقت کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

''گھبرایئے مت دراصل مجھے بھی خیال نہیں رہا۔دانیال کی محفل میں کوئی فرد سرخ

کپڑے نہیں پہن سکتا اور آپ سرخ جوڑا پہنے ہوئے ہیں''۔

وہ اُسے لے کر جیپ کی طرح چل پڑا۔خدا کا شکر تھا۔سازندوں کے ساز پھر شروع ہوئے۔دانیال وجد میں تھا اور ڈانس کر رہا تھا۔لوگوں کی تالیوں کا شور دھیرے دھیرے پھر بڑھنے لگا۔

دانیال نزدیکی پہاڑ کی طرف دیکھ رہا تھا۔پھر وہ خوبصورت درختوں اور پھولوں کی طرف اشارے کرنے لگا۔سٹیج پر چکر لگاتے لگاتے بانسری بجانے والے کے پاس رک کر اسے ''اور تیز بجاؤ'' کا اشارہ دینے لگا۔

اس کے چہرے پر ہنسی تھی۔وہ درختوں اور پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑابڑا رہا تھا۔

''اسے درختوں اور پہاڑوں پر پریاں اور جن نظر آ رہے ہیں''۔

مجمع میں لوگوں نے اپنے متعلق باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔دانیال ہاتھ اور سر ہلا ہلا کر جواب دیتا رہا۔کسی نے کوہ پیماؤں کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ راکاپوشی کو سر کرنے میں کامیاب رہیں گے یا ناکام۔

دانیال کا جواب نفی میں تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ یہ تماشا ہوتا رہا۔پھر دو مضبوط نوجوان وہاں آئے۔دانیال ان کے کندھے پر بیٹھا اور محفل سے چلا گیا۔

جیپ میں بیٹھ کر میں نے اکبر سے پوچھا۔

''ان پیشین گوئیوں میں کچھ سچائی بھی ہوتی ہے یا نری فراڈ بازی ہے۔

اکبر نے گاڑی سٹارٹ کی۔

''میں ان توہمات پر یقین نہیں رکھتا۔دل لگی اور دل بہلاوے کے لئے یہ کھیل تماشے ٹھیک ہیں۔اس سے زیادہ نہیں''۔

شفقت کا موڈ سخت خراب۔ وہ میرے اوپر خفا ہو رہی تھی۔

''کمبخت دہشت سے جو مجھے ہارٹ اٹیک ہو جاتا تب۔ کیسے مزے سے وہاں بیٹھی رہیں؟ پلٹ کر ایک بار نہ پوچھا کہ زندہ ہے یا مرگئی''۔

وہ تو دانیال کو بھی بے بھاؤ کی سنا رہی تھی۔

اکبر کی رسیلی باتوں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

''آپ جب گلگت واپس جائیں۔ وہاں کسی دانیال عورت سے ضرور ملیں۔ دلچسپ باتیں سننے کو ملیں گی اور کچھ منتروں سے بھی آگاہی ہو جائے گی۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اکبر بھائی'' شفقت کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔

''وہ تو ویسے ہی آگ ہے۔ اس نے میری طرف آنکھوں سے اشارہ کیا اور آپ اس پر تیل ڈال کر مزید بھڑکا رہے ہیں۔ نہ اس نے جنتر منتر سیکھ کر کیا پیری مریدی کا اڈا کھولنا ہے''؟

''کھول لینے میں ہرج بھی کیا ہے۔ چٹے ان پڑھ جاہل اور فراڈیئے یہ کاروبار دھوم دھڑکے سے کر رہے ہیں۔ مجھ جیسی تو کچھ خدا خوفی بھی کرلے گی''۔

اکبر اور خانم ہماری نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ننگے پتھریلے پہاڑ۔ سرو قد درخت۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک۔ شور مچاتا دریائے نگر۔

''بھوک لگ رہی ہے''۔

شفقت اپنا سارا غصہ بھول کر میرے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ میں نے غصیلے انداز میں اُسے گھورا۔

''اتنی جلدی ہاضمہ ٹھیک ہو گیا ہے''۔

پِسن اور مناپن کے خوبصورت میدانی گاؤں کی دلفریبی موہ لینے والی تھی۔ مناپن وہ وادی ہے جہاں سے مہم جو راکاپوشی کی چوٹی سر کرنے کے لئے پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ سب چہرے آ گئے تھے جنہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اپنے پیچھے چھوڑ کر آئی تھی ۔نوجوان، خوبصورت، امنگوں اور ولولوں سے لدے پھندے وجود کچھ کر گزرنے کے خواہاں، تاریخ میں اپنا نام محفوظ کرنے کے آرزومند۔ان سے رخصت ہوتے سمے میں نے ان کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ان کی کامیابی کے لئے دعا مانگی تھی ۔یہ جرمن قراقرم کوہ پیماؤں کی ایک پارٹی تھی ۔

مناپن کے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر میرے دل نے ان جیالوں کے لیے دعا مانگی۔

''خدایا ان کی یہ مہم سلامتی سے تکمیل کو پہنچے ۔''

وادی مناپن کی زرخیزی دیکھ کر میں حیرت زدہ تھی ۔لوگ جفاکش اور محنتی نظر آتے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے لے کر دریا کے کناروں تک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جسے آباد نہ کیا ہو۔ناشپاتی، خوبانی اور سیب کے درختوں کی بہتات تھی۔

ہم ایک چھوٹے سے گاؤں سے گزر رہے تھے۔

''تو شوٹ''۔

اکبر نے گاڑی چلاتے چلاتے کہا۔

''یہ بابر کا گاؤں ہے اور بابر کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی''۔

میں نے باہر دیکھا۔چالیس پچاس گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی وادی۔جنگ آزادی گلگت بلتستان کے ہیرو کرنل مرزا حسن خان کے دست راست دکشپو شہزادے بابر کا گاؤں ''تو شوٹ''

''گاڑی کیوں بھگائے لئے جاتے ہو۔رکونا یہاں۔اس ہیرو کو خراج عقیدت دیئے بغیر ہی گزر جائیں گے''۔

مجھے اکبر کے یوں بگٹٹ بھاگے جانے پر پہلی بار غصہ آیا تھا۔شہتوت کے درختوں

تلے گاڑی رک گئی۔

میں جس بیتابی سے باہر نکلی تھی شاید مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔لیکن غنچہ خانم نے محسوس کیا تھا اور جب میں اپنے گردوپیش کی ان فضاؤں میں کھوئی ہوئی تھی جن میں اس جیالے کے سانسوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔اس نے میرے قریب آ کر کہا تھا۔

''آپ کو اس شخصیت سے بہت پیار لگتا ہے''۔

میں نے فقط اسے دیکھا۔جواب نہیں دیا۔کچھ لمحوں کو گونگا رکھنے میں ہی ان کا حسن مضمر ہوتا ہے۔میں بھی چمکتی دھوپ میں لہراتے بل کھاتے فضاؤں میں ناچتے اچھلتے ان لمحوں کو اپنے جذبات کی کوئی زبان دینا نہیں چاہتی تھی۔

پر یہ حقیقت تھی۔

شمالی علاقہ جات پر لکھنے کے لئے جب میں نے اس علاقے پر لکھا گیا لٹریچر پڑھا۔جنگ آزادی کے جیالوں کی داستانوں کا مطالعہ کیا۔ان کے بارے میں لوگوں سے سنا تب مجھے احساس ہوا تھا کہ میں مرزا حسن بابر اور شاہ خان سے بہت متاثر ہوں۔

پر بابر کی تصویروں نے مجھے لوٹ لیا تھا۔اس کی خوبصورت آنکھوں سے پھوٹتی چمک تصویروں سے باہر آ رہی تھی۔اس کی فراخ پیشانی پر رقم اس کا عزم،اس کے چہرے کا بانکپن،ہونٹوں کے خوبصورت خم،اور ان پر گھنیری مونچھیں۔سچ تو یہ تھا کہ وہ قرون اول کے ان ہیروں جیسا تھا جن پر نسیم حجازی نے معرکتہ الآرا ناول لکھے تھے۔

''یہاں آپ نے کیا کرنا ہے؟ فاتحہ پڑھ لیں اور چلیں۔میں آپ کو نگر کے راجہ کا محل دکھانا چاہتا ہوں جو قدیم ہونے کے باوجود فن تعمیر کا نادر شاہکار ہے۔وہاں بھی وقت چاہیے اور واپسی بھی کرنی ہے''۔

اکبر میرے جذبات نہیں سمجھ سکتا تھا۔

میری نظریں پہاڑوں،درختوں،راستوں اور گھروں پر تھیں جن میں اس کا بچپن

اور جوانی گزر رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دوشیزاؤں کے دل اس کے نام پر دھڑکتے ہوں گے۔ پر جانے ان میں وہ خوش نصیب کون سی ہوگی؟ جس نے اس کی روانگی کو نم آلود آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ جب وہ فوجی وردی پہن کر میان میں تلوار لٹکا کر اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر وادی سے جہاد کے لئے نکلا ہوگا۔

اور اُجالے لاتی صبحوں اور تاریکیاں لاتی شاموں کے جلو میں جانے کتنی بار اس کے ہاتھ اس کی عافیت کے لئے اٹھے ہوں گے اور جب وہ غازی بن کر آیا ہوگا تب جانے کس والہانہ انداز میں اس نے اس کا استقبال کیا ہوگا؟ اور کیسے اس کے سینے سے چمٹی ہو گی۔ خوشی کے کتنے آنسو اس کی آنکھوں سے بہے ہوں گے؟

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میری آنکھیں بند تھیں جب میں اس جیالے کے لئے فاتحہ پڑھ رہی تھی جو راجوں کی اولاد تھا۔ وہ راجے جنہیں ڈوگرہ حکومت سے بے شمار مراعات حاصل تھیں اور جن کی اکثریت پاکستان سے الحاق کی حامی نہ تھی۔ مگر اس نے مفادات کے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ دلیری اور بہادری کی نئی داستان کو رقم کیا تھا۔ قرونِ اول کے مسلمانوں کے نقشِ پا کو اپنایا تھا۔

''بابر ہم تم پر نازاں ہیں''۔

میں جیپ میں بیٹھ گئی۔ میری آنکھیں نم تھیں جنہیں میں نے اپنی پوروں سے صاف کیا تھا۔

توشوٹ سے آگے زیادہ اونچائی کا سفر تھا۔ جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہ تھی۔ بھوک زوروں پر تھی اور اکبر کہتا تھا کہ اسکردو اس چل کر کھانا کھائیں گے۔ شفقت مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی تھی اور میں بھوک پیاس دونوں سے بے نیاز سیاحت کے مزے لوٹ رہی تھی۔

پھکر کے میدانی گاؤں کے بعد کھوچہ کا گرم پانی کا چشمہ دیکھا۔ یہ چشمہ انتہائی

خوفناک جگہ پر واقع ہے۔ہم اسکرداس کی خوبصورت وادی میں داخل ہو رہے تھے۔گھڑیاں ساڑھے بارہ کا اعلان کر رہی تھیں اور وادی دن کے ڈھلنے کا۔اسکرداس میں تکر پانی کے لئے جس گھر میں جا کر اترے۔ماشاءاللہ وہاں مہمانوں کا ایک جمِ غفیر پہلے ہی موجیں مار رہا تھا۔ برآمدے میں سرخ سبز چادروں والی عورتیں ہی عورتیں اور آنگن میں بچے ہی بچے۔ مہمانوں اور میزبانوں میں تمیز کرنا مشکل تھی۔باورچی خانے سے مصالحوں اور گوشت کی خوشبوئیں پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔شفقت سانس زور زور سے کھینچتے ہوئے کسی قدر مایوسی سے بولی۔

خوشبوئیں تو پاگل کئے دے رہی ہیں۔بوٹی کوئی نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔اللہ جانتا ہے۔

''شانتی رکھو۔ایک بڑے عالم دین کے مہمان ہوئے ہیں۔گھر والے خود بھوکے رہ لیں گے پر ہمیں بوٹیاں ضرور دیں گے۔

میں نے تسلی دی۔

اسکرداس اور اس سے ملحقہ گاؤں سمائر عالم دین' مبلغین اور مشائخ پیدا کرنے میں خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔انہوں نے اسلامی علوم کی مختلف اصناف میں تحقیقی کام سے بہت نام پیدا کیا ہے۔

میزبانوں کی اب کچھ کچھ پہچان ہونے لگی تھی۔دو نوجوان عورتیں جن کا زیادہ وقت باورچی خانے میں گزر رہا تھا۔تو بہ شکن حسن کی مالک تھیں۔سبز آنکھوں سے پھوٹتی روشنی براہ راست دل پر اثر کرتی تھی۔

ظہر کی نماز پڑھنے کا وقت ہو رہا تھا۔ہمارے کہنے پر فوراً جائے نماز بچھا دیئے گئے۔پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔وضو کرنے کے ساتھ تھوڑا پیا بھی۔حلق سے پیٹ تک ٹھنڈک کا خوشگوار احساس ملا۔

کسری فرض ادا کرنے کے بعد دعائیں مانگنے میں کچھ وقت لگا۔ جب فارغ ہوئے۔ کھانا چن دیا گیا تھا۔ گھر میں آنے والے مہمان دو قسم کے تھے۔ ایک نیچے کے۔ دوسرے اوپر کے۔ اوپر کے مہمان ہسپر گاؤں سے آئے تھے اور نیچے والے پنجاب سے۔ دونوں کو کھانا ان کے رواج کے مطابق دیا گیا۔

دو بڑی پراتوں کے گرد عورتیں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ روٹی کی بُرکیاں اور شوربہ پراتوں میں اور بوٹیاں ہاتھوں میں کھانے کے ساتھ ساتھ ''شنا'' میں باتوں کا سلسلہ بھی زور و شور سے جاری تھا۔

ہمارے لئے کھانا کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ آلو گوشت کا شوربہ۔ بڑی بڑی تنوری روٹیاں۔ پیاز کھیرا اور ٹماٹر کٹے ہوئے۔

ہم تینوں نے گرسنہ انداز میں چیزوں کو دیکھا اور پل پڑے۔ بھوک کی شدت کا وہ عالم تھا کہ شفقت نے ڈونگے سے بوٹیاں نکالنے میں جب ذرا دیر کی۔ مجھ سے صبر نہیں ہو سکا بے اختیار بول پڑی۔

''کچھ باقیوں کا بھی خیال کرو۔ ساری اچھی بوٹیاں تمہیں چاہیں۔ ہاں ذرا جلدی کرو۔ کسی اور نے بھی سالن ڈالنا ہے''۔

سیانے سچ کہتے ہیں۔ انسان کی پرکھ کے دو بڑے ذریعے سفر اور کھانے کا دستر خوان ہے۔ بندے کا اندر ننگا ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

سالن بہت لذیذ تھا۔ بھوک زوروں پر تھی۔ ڈٹ کر کھایا۔ سونے کے رنگ جیسے قہوے نے بہت لطف دیا۔

خوبصورت میزبان عورتیں ہمارے پاس بیٹھی ٹکر ٹکر ہمیں دیکھتی تھیں۔ ہم چاند جیسے انکے چہروں کو دیکھتے ہوئے پیدا کرنے والے کی صناعی کی داد دے رہے تھے اور سوچے جاتے تھے کہ آخر حسن جیسے انمول عطیات سے ہم کیوں محروم رہے۔ خانم مترجم کے فرائض سر

انجام دے رہی تھی۔ کیونکہ ہسپر گاؤں سے مہمان اور اسکر داس کے میزبان دونوں اردو کا ایک لفظ بھی نہ بول سکتی تھیں اور نہ سمجھ۔

شفقت نے یونانی خدوخال والی فزا کی طرف دیکھتے ہوئے خانمسے کہا ذرا پوچھو۔ تو میاں اسے دیکھنے کے لئے گھر کے کتنے چکر لگاتا ہے؟

''یا اللہ فزا! شرمائی اور لجائی۔اس کے چہرے پر قوس وقزح کے دھنک رنگ بکھرے۔سچی بات ہے کہ فزا اور بتول فاطمہ حسن و رعنائی کے وہ شاہکار تھے کہ جنہیں بندہ سامنے بٹھا کر دیکھتا رہے اور جی نہ بھرے۔

خانمنے بتایا کہ ہسپر گاؤں کی خواتین وہاں آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔

''لوخودتو مہمان بنی بیٹھی ہیں''۔میں ہنسی۔

باہر سے بلاوا آ گیا تھا۔اس وقت جی چاہتا تھا کہ پھولوں والے نمدے پر دراز ہو جائیں۔تکیہ سر کے نیچے رکھیں اور اس دنیا میں پہنچ جائیں۔جسے خوابوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔کسی نئی جگہ کو دیکھنے کی تمنا نہیں تھی۔تھکن اور نیند دونوں غالب تھیں۔

سب سے فرداً فرداً گلے ملے۔ان کے رخساروں پر پیار کیا ورجواباً پیار لیا۔جب گھر میں داخل ہوئے تھےتو کسی قدر بیگانگی اور اجنبیت نے خیر مقدم کیا تھااور جب رخصت ہو رہے تھے'محبت اور خلوص کی چمک دامن گیر تھی۔

اسکر داس سے حیدر خان حیدر ہمارے ساتھ شامل ہوا۔اکبر کا دوست اس کا ہم عمر' نوجوان اٹھائیس تیس کے سن میں۔علاقے کے چپے چپے سے واقف۔

جیپ میں بیٹھتے ہی بولا۔

''آپ کے لئے بہتر ہو گا کہ رات نگر خاص میں قیام کریں۔صبح ہسپر وادی دیکھیں۔ہسپر دیکھے بغیر نگر آنے کا فائدہ! یقین کیجئے میرے پاس الفاظ نہیں جو ہسپر کے حسن کو بیان کر سکیں''۔

میں نے شفقت کی طرف اور شفقت نے میری طرف دیکھا۔

میرا خیال تھا وہ کہے گی ''دفع کرو۔ایسے ہی ننگے بچھے پہاڑ وہاں ہوں گے۔ بہتیرے دیکھ لئے ہیں۔''

پر میری حیرت کی انتہا تھی جب وہ بولی

''چلو دیکھ لیتے ہیں۔اتنا پینڈا مارا ہے۔حسرت تو نہ رہے گی کہ اتنے قریب پہنچ کر یونہی واپس لوٹ آئے''۔

ہم ایک خوبصورت جامع مسجد کے سامنے تھے۔عالیشان مسجد پچی کاری و چوب کاری کے بہترین کام سے مزین و آنکھوں اور دل کو طمانیت بخشتی کچھ ایسا ہی حال امام باڑے کا تھا۔گھنٹہ یہیں لگ گیا۔

اتنی شدید تھکن تھی کہ نمدے پر بیٹھی تو پتہ ہی نہ چلا کہ کب نیم دراز ہوئی اور کب سو گئی؟ جب آنکھ کھلی کمرے میں لالٹین جلتی تھی اور دسترخوان بچھا ہوا تھا اور شفقت اشتیاق بھری نظروں سے کھانے کو دیکھتی تھیں۔

خاتون خانہ نوجوان تھی۔چار بچوں کی ماں پر ایسے متناسب جسم کی مالک تھی کہ ایک کی بھی ماں نہیں لگتی تھی۔

بڑا لذیذ پلاؤ تھا۔کھا کر لطف آ گیا۔

میں تو چائے پیئے بغیر ہی دوبارہ لیٹ کر سو گئی۔صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔میں باہر جانا چاہتی تھی۔مگر سب لوگ سو رہے تھے۔بیرونی دروازے کا بھی نہیں پتہ تھا کہ کس طرف ہے؟بہر حال چپکی لیٹی رہی۔کمرہ اوسط درجے کی فیملی کا نمائندہ تھا۔

اس وقت بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہوئی جب ناشتہ ہمارے سامنے لا کر رکھا گیا۔چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں پگھلا ہوا گھی معلوم ہوتا تھا۔پلیٹوں میں موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔نمکین چائے کے پیالے تھے۔

اکبر ہنسا اور بولا

''خالص مقامی ناشتہ ہے یہ۔کھایئے۔''

''اسے درم پھٹی کہتے ہیں۔'' حیدر خان نے وضاحت کی۔

گندم کو پانی میں بھگو کر دھوپ میں رکھنے سے کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔اسے سکھا کر آٹا بنایا جاتا ہے اس آٹے میں بہت مٹھاس ہوتی ہے۔ان پیالیوں میں گھی وی نہیں ہے۔اخروٹ کا تیل ہے۔لقمے توڑیئے اس تیل میں ڈبویئے اور کھایئے۔

پہل حیدر خان نے کی۔ہم بھی پیچھے چلے۔سچی بات ہے۔بہت لطف آیا۔ چائے پی اور شاد ہوئے۔

نگر خاص سے ہی ہماری واپسی ہوگئی۔صاحب خانہ بتا رہے تھے۔راستہ بہت خراب

ہے۔وہ حصہ تو یوں بھی ان دنوں نگر سے کٹا ہوا ہے۔کچی سڑک بہت تنگ اور جابجا ٹوٹی پھوٹی ہے۔اکبر کو بہت افسوس ہوا۔وہ اپنے اخبار کے لئے کچھ فوٹوگرافی کرنا چاہتا تھا۔پر سب سے زیادہ افسوس تو ہمیں ہو رہا تھا۔حیدر خان نے ہسپر کے بارے میں جس انداز میں ہم سے باتیں کی تھیں۔اس نے بہت مشتاق کر دیا تھا اور اب کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے پیاسے انسان کو شربت کا گلاس تھما کر اس سے گلاس چھین لیا جائے۔

واپسی کے سفر میں ہسپر ہی زیر بحث رہا۔

ایک انوکھی اور منفرد وادی برف کے پہاڑوں سے گھری ہوئی۔دامن سے چوٹی تک برف ہی برف، نام کو کوئی درخت نہیں۔

حیدر کا کہنا تھا اگر ورڈز ورتھ کا کہیں ادھر سے گزر ہو جاتا تو وہ اس پر اتنا لکھتا کہ پوری دنیا میں ہسپر گونج جاتا۔یہاں Golden Mountain کو دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے آتے ہیں۔یہ پہاڑ چوٹی سے دامن تک سنہرا ہے۔

دریائے نگر کا منبع بھی یہی گاؤں ہے اور بلتستان کی وادی شگر میں بھی اس کے برفانی پہاڑوں پر سے جایا جاسکتا ہے۔

کاش میں مسپر جاسکتی کاش میں گلیشیروں پر سے ہوتی ہوئی شگر پہنچ سکتی۔

☆☆☆

باب:21

تیرا نام لکھوں اور عقیدت کی شمع جلاؤں ۔
قلم قبیلہ سے ملاقات
دانیال خاتون

میونسپل پبلک لائبریری کے دروازے پر جن دو اصحاب نے استقبال کیا ان میں سے ایک معمر اور دوسرا نوجوان تھا اول الذکر محمد اشرف اور موخر الذکر شیر باز علی برچہ تھے۔ پبلک لائبریری کے گیسوؤں کی آرائش و زیبائش کسی طرح دار الھڑ ا ماڈرن نازنین جیسی نہ تھی ۔ بلکہ یہ انداز سادہ لوح گھریلو خاتون کا سا تھا۔

دو کمروں ایک بڑے اور دوسرے چھوٹے پر مشتمل یہ لائبریری جتنی پرانی ہے۔ اشرف صاحب کی خدمات کی تاریخ اس سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ ایک نوزائیدہ بچے کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتے ہوئے انہیں نے اسے بلوغت کی حدوں میں داخل کر دیا ہے۔ اگر اوپر والوں نے ان کی خواہشات کے مطابق انکی شنوائی کی تو ممکن ہے اس کی جوانی خاصی اثر انگیز ہو۔

بڑے کمرے میں سادہ نمدہ بچھا ہوا تھا۔ اطراف میں شیشے کی الماریوں میں کتابیں سجی تھیں ۔ ملحقہ چھوٹے کمرے میں بڑی میز کے گرد چند کرسیاں تھیں ۔

چائے اور بسکٹوں سے تواضع ہوئی ۔ شیر باز گورا چٹا ، خوبصورت نقش و نگار والا ، درمیانی قامت کا نوجوان ہے ۔ لکھنے پڑھنے سے گہری دلچسپی رکھتا ہے اور دو تین کتابیں بھی تخلیق کر چکا ہے۔

پرانے رسائل اور کتابوں کی ورق گردانی کرتے کرتے دفعتاً میں نے سر اٹھا کر

شیر باز کی طرف دیکھا۔

شیر باز فاتح گلگت کے بارے میں اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ۔

اور میں نے محسوس کیا تھا شیر باز کی آنکھوں کی چمک فاتح گلگت کے ذکر پر دوچند ہو گئی تھی۔ کرنل مرزا حسن خان تاریخ گلگت کے صفحات پر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نام کی رعنائی و دلکشی نے مجھے بار بار کچھ جاننے پر مائل کیا تھا۔ میں نے سر کو جھکا دیا تھا اور شیر باز کہیں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے گویا اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا۔

وہ دن بڑا سرد تھا۔ برفیلی ہواؤں میں جارحانہ کاٹ تھی۔ گلگت کے رونو خاندان کے ایک گھرانے میں اس روز جو بچہ پیدا ہوا وہ خاصا کمزور تھا۔ رشتہ دار خواتین فکرمند تھیں کہ کہیں کوئی بے احتیاطی نہ ہو جائے۔ بچہ موسم کی شدت کا شکار نہ ہو جائے۔ مرزا تاج محمد نے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ وجدان نے جیسے سرگوشی کی۔ یہ بچہ غیر معمولی ہے۔

بچپن میں جب بھی باپ سے کہانی کی فرمائش کی۔ تاج محمد نے بیٹے سے چمٹا کر خالد بن ولید کے کارنامے سنا ڈالے۔ حضرت علی شجاعت اور دلیری کی کہانیاں کانوں میں انڈیل دیں۔ بس تو معمول ٹھہرا تھا کہ جب رات ڈھلتی وہ باپ کی ٹانگوں سے چمٹ کر انہی کہانیوں کی فرمائش کرتے۔ یوں بچپن ہی سے ان کے کان تلواروں، اسلام کے دشمنوں، جنگوں، جنگ کی حکمت عملی اور پسپائی جیسے الفاظ سے آشنا ہو چکے تھے۔

وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے اور چلاتے۔

اے میں خالد بن ولید بنوں گا۔ میں اسلام کا سپاہی بنوں گا۔

ابتدائی تعلیم گلگت میں ہوئی۔ ہر امتحان میں اول آنا انہوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ مڈل کے بعد میٹرک پونچھ سے کیا۔ پونچھ مجاہدوں اور غازیوں کی سرزمین ہے۔ اسلام سے محبت یہاں کے لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ پیدائشی سپاہی، بے پناہ جوشیلے، مہمان نواز اور سادہ لوح لوگ حسن خان کی شخصیت پر بہت اثر

انداز ہوئے۔

میٹرک بہت امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔پونچھ کے چاروں ہائی سکولوں میں سرفہرست رہے۔فسٹ ائیر کے لئے سری نگر آنا پڑا۔سری نگر کو بار بار دیکھا اور اس کے گرویدہ ہو گئے۔اور تھرڈ ائیر تک بہت نمایاں رہے۔درجہ دوم ان کے لئے کبھی قابل قبول نہ تھا۔ابھی فورتھ ائیر میں تھے کہ فوجی بننے کا جنون سر میں سما گیا۔

''بی اے کرلو''۔کسی خیر خواہ نے مشورہ دیا۔

''میں کشمیر کو ڈوگروں سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔''

اور جب مہاراجہ کے سامنے انٹرویو کے لئے پیش ہوئے۔اس نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ریاست کی بجائے انڈین آرمی میں کیوں نہیں گئے؟

کمال ذہانت سے انہوں نے کہا۔

''ہز ہائی نس کا اقتدار اعلیٰ گلگت پر بدستور ہے۔عارضی طور پر اسے دہلی کے زیر اثر کیا گیا ہے۔ہمارے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ان کے کشمیر کی ریاستی فوج میں شمولیت سے فرعون وموسیٰ کے واقعے کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

کچھ ہی ماہ بعد انہیں مزید تربیت کے لئے انڈین آرمی میں بھیج دیا گیا۔تربیت مکمل ہوئی برما کے محاذ پر جانے کا حکم ملا۔یہاں کئی معرکوں میں بے مثل جرأت کا مظاہرہ کیا۔جاپانی فوجی مقابلے پر تھی۔اور قم رم پر قبضہ کرلیا۔

اسی رات کی بات ہے۔پیٹ کے دائیں جانب سخت درد ہوا۔ڈاکٹر نے اپنڈکس کے شبے میں A.D.S بھیجا جہاں بیمار لوگوں کا علاج ہوتا تھا۔وہاں امیر عبداللہ نیازی (لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ) بھی تھے۔انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان انگریز افسر زخمیوں اور بیماروں کی عیادت کے لئے آیا۔وہ میجر تھا۔اس کی شان آن نرالی تھی۔اس کے سینے پر ملٹری

کراس جگمگاتا تھا۔ہر بیڈ پر لیٹے ہر انگریز اور ہندوستان افسر اور جوان کی نگاہیں اس کے سینے پر تھیں۔تب انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

میں زندہ رہوں یا مر جاؤں مگر یہ تمغہ ضرور سینے پر سجاؤں گا۔بھلا اس کے بغیر کیا لطف؟

اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ سے کیا ہوا یہ وعدہ خوب پورا کیا۔ کینڈی پیک پر قبضے کے بعد تلیل ایئر پورٹ پر قبضہ کیا۔مکٹیلا کا معرکہ جس انداز میں سر ہوا یہ ان کی عسکری زندگی کا ایک درخشاں کارنامہ تھا۔ایسے کئی اور معرکے سر کرنے پر بالآخر انہیں ملٹری کراس سے نوازا گیا۔

دوسری عالمگیر جنگ اپنے اختتام پر پہنچی۔وطن واپسی ہوئی۔جموں توی ریلوے اسٹیشن پر انہوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کا رویہ دیکھا جو کشمیر انفنٹری بٹالین کو خوش آمدید کہنے کے لئے بذات خود وہاں موجود تھے۔مسلمان فوجیوں کے لئے مہاراجہ کا انداز استقبال روایتی سا تھا۔مگر ڈوگروں کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھلے جا رہے تھے۔کرنل مرزا حسن خان سے جب مصافحہ ہوا سرد مہری کی ایک منجمد لہر ان کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

''میں اسکا انتقام لوں گا''۔انہوں نے یہ اپنے دل میں کہتے ہوئے دانت پیسے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ہندوستان دو آزاد مملکتوں کی صورت میں وجود میں آئے۔حکومتی سطح پر کوئی ردعمل نہیں تھا۔مرزا حسن خاں مضطرب تھے۔کسی کام کے سلسلے میں وہ گلگت آئے۔اس وقت گلگت میں واحد مسلمان افسر کرنل سعید درانی تھے۔حسن خان نے انہیں مچھلی کے شکار کی دعوت دی۔دونوں گھوڑوں پر سوار کارگاہ نالہ چلے گئے۔یہاں تنہائی میں انہوں نے سعید درانی سے برصغیر کی سیاسی صورت حال اور خصوصاً جموں وکشمیر کے پاکستان سے الحاق کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے اس وقت مجاہدانہ کردار ادا نہ کیا تو تاریخ ہمیں معاف

نہیں کرے گی۔تب انہوں نے جیب سے قرآن پاک نکالا۔سعید درانی سے کہا۔

''آؤ درانی ہم قسم کھاتے ہیں کہ اپنی زندگیاں جموں وکشمیر کے پاکستان سے الحاق کی خاطر قربان کریں گے۔''

کارگہ نالہ سے واپسی پر وہ اور سعید درانی کرنل غلام حیدر اور میجر محمد خان سے ملے اور ان سے تبادلہ خیال ہوا۔کرنل غلام حیدر نے فوراً قسم اٹھائی کہ وہ عہد کرتے ہیں کہ اگر مہاراجہ کشمیر نے ریاست کا ہندوستان سے الحاق کرنے کی کوشش کی تو ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ایسا ہی عہد محمد خان نے بھی کیا۔

اگلی صبح گلگت سکاوٹس کے انچارج کیپٹن بابر سے ملاقات کی۔بابر اصلاً نسلاً راجہ فیملی سے تھا۔ان کی توقع کے برعکس بابر نے فوراً تعاون کی حامی بھری اور قسم بھی کھائی کہ وہ ہر صورت انقلاب کی راہ ہموار کرے گا۔

ابھی عہد و پیمان کے یہ مراحل طے ہو رہے تھے جب کیپٹن بابر خان نے گلگت سکاوٹس کے ذمہ دار افراد کی طرف یہ فیصلہ تحریری صورت میں مرزا حسن خان تک پہنچایا کہ گلگت سکاوٹس کے سب سردار پاکستان سے الحاق کریں گے۔گروپ کے افسران نے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔ابتدائی مرحلہ پر ہی یہ بابر کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔کیونکہ مقامی سیاسی رقابت جو مختلف ریاستی حکمرانوں کے درمیان پائی جاتی تھی سکاوٹوں کی کارکردگی پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔

انقلاب کونسل کا قیام عمل میں آیا۔فیصلہ ہوا کہ مرزا حسن خان کی کمانڈ میں بونجی اور گلگت میں کارروائی عمل میں لائی جائے۔

بونجی تاریخ اہمیت کا محاذ تھا۔یہ ایک طرح جنگ آزادی کا سنگ میل تھا۔زمانوں سے بونجی جنگی نقطہ نگاہ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔یہ چار دروں کا سنگم ہے۔اس کے جنوب مشرق کی طرف وادی استور جنوب کی طرف وادی یاغستان ، شمال مشرق کی طرف

وادی حراموش ، بلتستان اور شمال مغرب کی طرف وادی گلگت کے درے واقع ہیں ۔ اسکے پہاڑوں اور وادیوں میں صدیوں پرانی تہذیب کے آثار ملتے ہیں ۔ کورو پانڈو کی لڑائیوں میں بھی بونجی اہم تھی ۔ انگریزوں اور ڈوگروں کی مہموں میں بھی بونجی چھاؤنی اہمیت کے لحاظ سے سرفہرست تھی ۔

بونجی پہنچ کر کرنل حسن خان نے چند سرکردہ لوگوں سے ملاقات کی ۔ انہیں آزادی کے متعلق بتایا نیز ان پر یہ بھی واضح کیا کہ سب سے زیادہ لڑائی کا خطرہ بونجی میں ہی ہو گا ۔ آخر میں ان سے پوچھا کہ کیا وہ اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں؟ ۔

سرکردہ عمائدین کا جوش وجذبہ قابل دیدنی تھا ۔

''مرزا حسن خان قدم اٹھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں ۔'' انہوں نے بیک آواز کہا ۔

مسلمانوں کے وسائل محدود تھے ۔ دشمن طاقتور اور جدید جنگی ساز و سامان سے لیس تھا ۔ مگر مسلمان افسروں نے ذہانت سے منصوبہ بندی کی ۔ جوانوں اور عوام نے اس جہاد میں سرفروشی سے حصہ لیا اور یوں مرزا حسن اس خطے کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو گئے ۔

اس جہاد میں شاہ خان، صفی اللہ بیگ، غلام مرتضیٰ، احسان علی، مجاہد بختاور، اسلم خان کے کردار بہت نمایاں رہے ۔ گلگت ، بلتستان آزاد ہو کر پاکستان کے زیر انتظام آ چکے تھے اور جنگ کا دائرہ گریز تک پھیل چکا تھا اور حسن خان فتوحات میں مصروف تھے ۔ جب ہائی کمان کی طرف سے انہیں تراگبل میں پیغام پہنچا کہ فوراً پنڈی رپورٹ کرو ۔

یہ سنگین غلطی تھی ۔ حسن خان کے اس محاذ سے جانے کے فوراً بعد تراگبل دشمن کے قبضے میں چلا گیا ۔ ہماری بدقسمتی کہ سینیئر افسران اس سازش کا شکار ہو گئے کہ حسن خان سری نگر تک پہنچ کر جنگ کا سارا کریڈیٹ خود لے گا ۔ شخصی ٹکراؤ نے بیڑے کے پیندے میں سوراخ کر دیئے تھے ۔

ایک بج رہا تھا۔اشرف صاحب نے آ کر کھانا کھانے کے لئے کہا۔

میں سرفروشوں اور جیالوں کی دنیا میں سانس لے رہی تھی۔

سری نگر فتح ہوسکتا تھا۔جموں پر پاکستان کا پرچم لہرا سکتا تھا۔فتح تو چند قدموں پر تھی پر حسن جیسے کئی جری جوانوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔جنگ کشمیر کو فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہی نہیں ہونے دیا گیا۔

کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ کس لئے؟

میرے سارے وجود میں ان الفاظ کی بچوں جیسی بالک ہٹ کی اتھل پتھل تھی۔

سر پر سر سے پاؤں تک اس شور میں ڈوبا ہوا تھا۔ایسے میں اشرف صاحب کی پکار سنائی دیتی۔

انہوں نے قریب آ کر پھر کہا تھا۔

''اٹھیے ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

شیر باز برچہ کھڑا ہوا۔شفقت کھڑی ہوگئی۔تب کہیں میں نے کرسی چھوڑی۔

چھوٹے سے دسترخوان پر قیمہ آلو اور تنوری روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔کٹا ہوا موٹا موٹا پیاز اور ٹماٹر موجود تھے۔اچار کی شیشی بھی تھی۔

کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔

قہوہ پینے کے بعد میں نے شیر باز سے مختلف کتابیں اور رسائل لے جانے کی بات کی۔کتابوں کے پلندے کے ساتھ جب ہم عثمان صاحب کے گھر پہنچے۔اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔برآمدے میں مسز عثمان کے بھائی ایک پیچیدہ گتھی سلجھانے میں مصروف تھے۔

بچیوں نے ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے شور مچایا۔مسز عثمان گلے ملیں۔بڑی بیٹی بولی

''اللہ ہم تو اتنے فکرمند تھے۔حالات ویسے بھی پرسکون نہیں۔''

میں ہنس پڑی۔

''ادیبہ ہم محبتوں کے سفیر ہیں۔ہمیں کسی نے کیا کہنا ہے؟''

مسز عثمان کی والدہ کا حج کے لئے قرعہ اندازی میں نام نکل آیا تھا۔ان کے بھائی انہیں رخصت کرنے پنچے تک جا رہے تھے۔وہ بہن کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔عثمان صاحب سے اجازت کا مرحلہ درپیش تھا۔ایک بار وہ انکار کر چکے تھے۔

''ارے یہ کون سی مشکل بات ہے؟اتنے جوان بچوں کی ماں۔سارے بچے بیک آواز باپ سے کہیں۔بھلا کیسے نہیں مانیں گے وہ''؟

میں نے رئیس اور ادیبہ کی طرف دیکھا۔

دونوں عثمان صاحب کے جواں سال بچے تھے۔

رئیس نے میری طرف صرف خاموش نظروں سے دیکھا۔مگر ادیبہ نے بولنا ضروری سمجھا۔

''آنٹی ہم ابو کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتے''۔

''یا اللہ''میں نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

''کمبخت میرے بچوں جیسے۔''

جب بچے چھوٹے تھے اور ہم میاں بیوی کسی گھریلو مسئلے یا کسی فضول اور نکمّی بات پر جھگڑ پڑتے۔تب اس لڑائی کا اختتام ہمیشہ میرے آنسوؤں پر ہوتا۔چھم چھم بہتے پانی کے اس پردے کے پیچھے مجھے ہمیشہ اپنے بچوں کی صورتیں نظر آتیں جو جیسے مجھے دلاسا دیتی ہوں کہ ہمیں بڑا ہونے دو۔

اور پھر وہ بڑے ہو گئے۔

جب یونہی ایک دن پانی پت کا میدان گرم ہوا۔میں نے بچوں کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھا۔وہاں خاموشی تھی۔بے رخی اور بے نیازی تھی۔ایک جامد سناٹا تھا۔ہمیشہ کی طرح پسپائی کے بعد میں نے انہیں کوسنے دیتے ہوئے کہا۔

''کم بختو تمہیں میری حمایت میں کچھ کہنا نہیں چاہیے تھا۔تمہارا باپ صریحاً زیادتی پر تھا۔

''پلیز امی آپ ہمیں فریق مت بنائیں''۔بیٹی نے بے اعتنائی سے کہا۔

''آخر آپ بحث کیوں کرتی ہیں۔تھوڑی سی دیر کے لئے خاموش نہیں رہ سکتیں''۔بڑا بیٹا بولا۔

میں نے توقعات کے اس بت کو جسے میں جانے کب سے گھڑتی چلی آئی تھی۔اٹھا کر فرش پر پٹخا اور چکنا چور کر دیا۔

بھلا مجھ میں اور مسز عثمان میں کیا فرق تھا؟

شام پانچ بجے قراقرم رائٹرز فورم کے ساتھ ایک نشست تھی۔میں نے شفقت کو بھی چلنے کے لئے کہا۔

''معافی دو مجھے''اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیئے۔

کھال کے پانی سے نہائے۔سچی بات ہے نہا کر لطف آیا۔ایسا ٹھنڈا ٹھار پانی کہ انگ انگ سرشار ہو گیا۔سفر کی تھکاوٹ اور گلگت کی گرمی دونوں کافور ہو گئیں۔چائے نے حقیقی معنوں میں لطف دیا۔

''ادیبہ بہت اچھی چائے بناتی ہے''۔

شفقت نے ستائشی انداز میں اسے دیکھا۔

اب بازار کی دوکانیں تھیں۔شفقت کی حریصانہ نظریں تھیں۔بس نہیں چلتا تھا وگرنہ گلگت بازار اٹھا کر اپنے اٹیچی کیس میں بند کر لیتی۔پونے پانچ بجے میں اسے اور ادیبہ کو بازار میں ہی چھوڑ کر خزانہ روڈ کی طرف نکل گئی۔جہاں گلگت کے لکھاری اور دانشور گولڈن پیک میں اکٹھے ہو رہے تھے۔

گولڈن پیک ایک گھریلو ٹائپ ہوٹل ہے۔

جناب غلام محمد بیگ (مرحوم لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے) ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ لئے پیشوائی کے لئے بڑھے۔فرداً فرداً سب سے تعارف ہوا۔محمد اکرم خان ؔ گلگت ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر بہت نمایاں تھے ان کی شخصیت کے ساتھ بہت سے خوش لگائے جاسکتے ہیں' خوش شکل' خوش لباس اور خوش گفتار وغیرہ وغیرہ۔

محمد امین ضیاؔ قراقرم رائٹرز فورم کے سیکرٹری ہیں۔شنا زبان کے بہت اچھے شاعر ہیں۔جب تعارف ہوا میں نے ہنس کر کہا۔

''میں آپ سے متعارف ہوں۔آپ کا کلام میں نے پڑھا ہے۔بہت خوب صورت لکھتے ہیں۔''

عباس کاظمی سے میرا غائبانہ تعارف تھا بلتستان پر کتاب لکھتے ہوئے ان کی ''بلتی لوک گیت'' نے میری کافی رہنمائی کی تھی۔

''میں آپ کی بہت ممنون ہوں''۔

ہدایت اللہ اختر سے بھی غائبانہ تعارف تھا۔ان کی کتاب آئینہ دردستان مجھے پنجاب یونیورسٹی کے کسی طالب علم نے دی تھی۔بہت معلوماتی کتاب ہے۔اختر پنجاب یونیورسٹی سے ہی ایم بی اے ہیں۔کتاب پر چھپی ہوئی تصویر سے زیادہ جوان اور زیادہ وجیہہ نظر آئے تھے۔

شیر باز برچہ اور محمد اشرف صاحب سے میونسپل پبلک لائبریری میں صبح ہی تفصیلی ملاقات ہوچکی تھی۔دونوں نے پورا تعاون کیا تھا۔اور میں ان کی شکر گزار تھی۔

منظوم علی سے بھی غائبانہ متعارف تھی۔جب پہلی بار گلگت کا چکر لگایا تھا ان کی کتاب قراقرم ہندوکش ہی میرے ساتھ گئی تھی۔گلگت سے میرا پہلا کتابی تعارف اسی کتاب اور اسی مصنف کے حوالے سے ہوا تھا۔

اس وقت Who is Who کا کتابچہ میرے سامنے ہے اور گولڈن پیک کی

وہ سنہری شام تصور میں ابھری ہوئی ہے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے چہرے بھی سامنے ہیں۔ کچھ نام بھول بیٹھی ہوں۔ کچھ نام یاد ہیں۔ پر چہروں کی شناسائی متاثر نہیں ہے۔

عبدالخالق تاج' سید فاضل شاہ جلالی' گوہر علی گوہر' ڈاکٹر ثابت رحیم' فضل الرحمٰن عالمگیر' فقیر محمد خان' حشمت اللہ خان' غلام کریم مطرب' عبداللہ ملنگ'

فضل الرحمٰن عالمگیر بلند پایہ نقاد ہیں۔ شنا شاعری پر انہوں نے خوبصورت تحقیقی کام کیا ہے۔ اخوند مہربان' ارجی الرحمت نظر' غلام النصیر چلاسی' اخوند محمد رضا' گوہر علی گوہر' عبدالخالق' تاج اور ڈاکٹر بہرام خان شاد کے عارفانہ کلام کو انہوں نے اردو میں پیش کیا ہے۔ جان علی ایک اچھے شاعر ہی نہیں۔ فن موسیقی کے ماہر بھی ہیں۔ اپنا کلام خود گاتے ہیں۔ دو گھنٹے کی یہ نشست دلچسپ تھی۔ پر لطف باتیں ہوئیں۔

امین ضیا کو گلگتی عورت کی مظلومیت پر بڑا شکوہ تھا۔ اس کے خیال میں نیچے کی عورت بڑی دلیر اور دبنگ ہے کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔

''ارے کہاں دلیر ہے؟ نیچے مردوں کی کوئی دوسری مخلوق تھوڑی ہے۔ تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ پڑھی لکھی عورت زیادہ پس رہی ہے۔ دہری ذمہ داریاں نبھا رہی ہے۔ ملازمت بھی کرتی ہے۔ گھر اور بچے بھی سنبھالتی ہے۔ اور مرد کا نخرہ بھی اٹھاتی ہے''۔

مغرب کے بعد کہیں واپسی ہوئی۔ عثمان صاحب کے گھر پہنچی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ شفقت کی خریداری کے پٹارے کمرے میں دلہن کے جہیز کی مانند نمائش کر رہے تھے۔ اور عثمان صاحب کی بیٹیاں ان پر تبصرے کر رہی تھیں۔

''ادیبہ پلیز چائے کا ایک کپ نہیں پلاؤ گی!''

''کیوں نہیں آنٹی۔ ابھی لیجئے''۔

لطیف سی خنکی لئے ہوئے رات کا پہلا پہر دستاروں سے بھرا ہوا گلگت کا آسمان حد

نظر میں؛ خوشگوار ہواؤں کے جھونکے جسم و جان پر اور ہاتھ میں پکڑا ہوا مزیدار چائے کا کپ۔

''زندگی کس قدر خوبصورت ہے۔''

میں نے گھونٹ گھونٹ چائے پی اور ادیبہ کو دعائیں دیں۔

رات کے کھانے کے بعد مسز عثمان ہمیں اپنے نمبر دو بیٹے کی سسرال لے گئیں۔ یہ ایک مشہور وکیل کا گھر تھا۔ گھر کیا تھا؟ محل تھا۔ ایسا سجا سنورا کہ بندہ حیرت زدہ ہو جائے۔ پتہ چلا تھا کہ صاحب خانہ کسی پلازہ کے مالک ہیں۔

''بس تو پھر حیرت کی کیا بات ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''پیسہ بولتا ہے خواہ پہاڑوں میں ہو یا میدانوں میں''۔

اگلے دن صبح نو بجے میں ریڈیو اسٹیشن گلگت میں تھی اور شفقت بازار میں۔ جناب اکرم صاحب نے کل شام ریڈیو پر انٹرویو کے لئے کہا تھا اور صبح گاڑی بھی بھیج دی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن دینور میں ہے۔

انٹرویو کو ریکارڈ ہونے میں کوئی آدھ گھنٹہ لگا۔ اس کے بعد جناب اکرم خان تھے اور میری قینچی کی طرح چلتی زبان تھی۔ اکرم صاحب بہت مہربان اور دھیمے سبھاؤ کے آدمی ہیں۔ شنا لوک گیتوں کی تاریخ اور ان کی اقسام پر انہوں نے تفصیلی گفتگو کی۔ مختلف نغموں پر گائے جانے والے لوک گیتوں کی کیسٹ سنوائیں۔

ایک بجے جب میں نے ڈائری بند کی۔ پنسل قلم سنبھالے اور جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ انہوں نے شام کی چائے گھر پر پینے کی دعوت دی۔

''اللہ کا نام لیجئے اکرم صاحب ابھی چائے کی کسر باقی ہے۔ بھیجا تو میں نے آپ کا چاٹ لیا ہے۔ شام کو پھر بلا رہے ہیں تا کہ جو تھوڑا بہت بچ بچا ؤ ہو گیا ہے وہ بھی میری بکواس کی نذر ہو جائے''۔

''ارے نہیں تو'' انہوں نے خوشدلی سے مسکرا کر کہا۔

وہ احمد ندیم قاسمی کے پرستار ہیں۔ اشفاق احمد اور بانو آپا کے مداح ہیں۔

''ان سے کہئے نا ہم چشم براہ ہیں۔ ایک چکر تو لگائیں''۔

میرے ساتھ باہر آتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''میں آپ کی دعوت ان تک ضرور پہنچادوں گی۔''

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے الوداعی ہاتھ ہلایا۔ ماہر ڈرائیور نے پل جھپکتے میں میرے اور ان کے درمیان فاصلہ حائل کر دیا۔

وعدہ کے مطابق شفقت غلام محی الدین صاحب کے گھر پر آرام فرما رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور کھانا باہر چل کر کھانے کے لئے کہا۔

''لو گھر والے آج الوداعی کھانا دے رہے ہیں اور تم ہوٹلوں کی بات کرتی ہو۔''

اس شام ہم چائے پینے کی دعوت پر جس گھر میں داخل ہوئے اس کے آنگن میں کھڑے ہو کر زور زور سے چیخیں مارنے کو جی چاہتا تھا۔ بین کرنے پر طبیعت مائل تھی۔ شدت جذبات سے دل سینے میں پھڑک پھڑک جاتا تھا۔

داخلی بڑے دروازے پر مخنی جسم کی مالک مسز محمد اشرف موجود تھیں۔ وہ مسکراتی ضرور تھیں مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ جیسے زبردستی کسی نے لب کھولے ہیں۔ ساتھ من موہنی سی صورت والی ایک نوخیز بچی بھی کھڑی تھی۔ جناب محمد اشرف بھی ان کے عقب میں موجود تھے۔ گھر خاصا بڑا اور خوبصورت نظر آتا تھا۔ پھولوں پھلواری کی بھی بہتات تھی۔ نفاست اور سلیقہ بھی بولتا تھا مگر پھر بھی در و دیوار پر ایک یاس سا بکھرا ہوا تھا۔ جسے فوراً محسوس کیا جاسکتا تھا۔

نشست گاہ کی سجاوٹ کشمیری انداز کی تھی۔ باتیں ہوئیں۔ شفقت نے گھر دیکھنا چاہا۔ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک ایسے کمرے میں داخل ہوئے۔

جہاں دو بستروں پر دو بچے جن کی عمریں علی الترتیب گیارہ اور بارہ سال کی ہوں گی لیٹے ہوئے دیواروں کو تکتے تھے۔ چپ چاپ' کمرے میں سناٹا تھا۔ دو بچے اور وہ بھی لڑکے۔ دھینگا مشتی کرنے کی بجائے یوں خاموش تھے جیسے کسی خوفناک چیز کو دیکھ بیٹھے ہوں۔

میری آنکھوں میں حیرت تھی۔ تعجب تھا۔

اشرف صاحب نے میری طرف دیکھا اور دردناک آواز میں بولے۔

''یہ بچے موت کا انتظار کر رہے ہیں''۔

''خدایا'' ہم دونوں لرز اٹھیں۔ میں نے دیکھا تھا۔ شفقت کی آنکھوں کا پھٹاؤ خوفناک حد تک تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری آنکھوں کی بھی ہو گی۔

''کیوں؟ کیوں؟'' ہم دونوں چلائیں۔

مسز اشرف نے ٹی وی لگایا۔ اشرف صاحب ہمیں لے کر باہر آ گئے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے میں ہم نے جتنے قدم اٹھائے ان میں شکستگی تھی۔ دل جیسے منوں پتھروں کے نیچے تھا۔

مسز اشرف ہمارے سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔ غم کی ایک تصویر۔ میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

''بس بڑا بیٹا ٹھیک ہے۔ اس کے بعد جتنے بچے پیدا ہوئے سوائے لڑکیوں کے سب اس بیماری کا شکار ہوئے۔ بچپن میں ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ اچھلتے کودتے بھاگتے ہیں۔ شرارتیں کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر نارمل ہوتے ہیں۔ لیکن دس سال کے بعد ٹانگیں جواب دینا شروع ہو جاتی ہیں۔ دھیرے دھیرے چلنا ختم ہو جاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر تک زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

''یا اللہ''۔ آنسو میری آنکھوں سے ایک تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔

''تو اپنے بندوں کو کیسی کیسی آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ پروردگار اس ماں کا کلیجہ

گوشت پوست کا ہے۔پتھر کا نہیں ۔''

چائے بمعہ لوازمات کے دستر خوان پر سج گئی تھی۔مسز اشرف اوراشرف صاحب کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

میرا جی چاہ رہا تھا میں ان سب چیزوں کو تہس نہس کرتی کہیں جنگلوں بیابانوں میں بھاگ جاؤں ۔

میرے سینے میں بھی ایک ممتا بھرا دل تھا۔

چائے کا کپ میرے ہاتھ میں پکڑایا گیا۔ایک گھونٹ لے کر میں نے پوچھا

''اس بیماری کا کوئی علاج!''

''پاکستان میں نہیں ہے۔باہر جانے کی توفیق نہیں ۔کراچی میں بہت عرصہ خوار ہوئے ۔حکومت کو بھی بہتیری درخواستیں بھیجیں ۔مگر کون سنتا ہے؟

اشرف صاحب کے لہجے میں آزردگی تھی ۔

یہ میری زندگی کی افسردہ ترین شاموں میں سے ایک تھی ۔سونے تک میں غم کے اس حصار سے باہر نہیں آسکی تھی۔

صبح آنکھ کھلی ۔نماز کے لئے باہر نکلے دیکھا آسمان ابر آلود تھا۔

''یا اللہ ۔''میں ساری جان سے لرزی تھی ۔

آسمان کا ابر آلود ہونا ہمارے لئے برا شگون تھا۔گلگت میں ہمارا آخری دن تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد دعا کی۔

پروردگار بہت دن ہوگئے ہیں یہاں ۔اب واپسی میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

مجھے آج دانیال عورت سے ملنا تھا۔اس ملاقات کا اہتمام ڈاکٹر ہدایت علی اور جناب غلام محمد نے کیا تھا۔ناشتے سے فراغت ملتے ہی میں نکل پڑی۔شفقت آج جیولری کے چکر میں تھی ۔

جٹیال کی طرف کہیں گھر تھا۔ پوچھتے پوچھتے مطلوبہ جگہ جا پہنچے۔ دروازہ کھلا۔ گورے چٹے رنگ کی ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ غلام محمد صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے شنا میں بات کی۔ چہرے پر تذبذب کی کیفیات ابھریں۔ موٹی موٹی آنکھوں سے میرا بغور جائزہ لیا گیا۔

یقیناً میری آنکھوں میں کچھ ایسے احساسات نمایاں ہوئے ہوں گے جن میں التجا تھی ایک درخواست تھی۔ جنہوں نے کہا ہوگا۔ دیکھو مایوس نہیں کرنا۔ بہت دور سے آئے ہیں۔ تمہارے درشن کرنے ہیں۔ تمہارا کام دیکھنا ہے۔ تم سے باتیں کرنی ہیں۔

وہ ایک طرف ہٹی، یہ اندر آنے کے لئے ایک اشارہ تھا۔ کچا آنگن خاصا کشادہ تھا۔ سامنے کے رخ پر چار بکریاں بندھی تھیں۔ دو کمروں اور دائیں بائیں برآمدوں پر مشتمل یہ نیم پختہ گھر تھا۔

آنگن میں بچھی چارپائی پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ہی وہ بھی بیٹھ گئی۔ چہرہ طباق جیسا چوڑا تھا۔ آنکھیں موٹی اور لالی لئے ہوئے تھیں۔ ہونٹوں کا رنگ قدرے سیاہی مائل تھا۔ ڈاکٹر ہدایت علی نے مترجم کے فرائض سنبھالے۔

''دانیال عورت کیسے دانیال بنی؟''

میں چھوٹی سی تھی۔ بس یہی کوئی سات آٹھ سال کی عمر ہوگی۔ ہر روز میں اپنی بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ کھلی پہاڑی چراگاہوں کی طرف جایا کرتی تھی۔ ایک دن جب میں بھوج پتر درخت کے نیچے بیٹھی ایک گیت گا رہی تھی۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میری آواز میں مٹھاس ہے اور جو گیت میں گا رہی ہوں یہ کوئی جادوئی اثر رکھتا ہے۔ گاتے گاتے میرے نگاہ یونہی اوپر اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا ایک حسین وجمیل پروں والی عورت چیلی کے درخت کی شاخ پر بیٹھی بکری کی طرح اس کے پتے کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی تھیں۔ بہت زیادہ چمک تھی ان میں۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے

درخت سے اتری اور میری طرف آئی ۔ڈر سے میرا برا حال تھا۔قریب آ کر اس نے کہا۔

’’ڈرتی ہو۔مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی ۔چلو آ ؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں ۔میرا گھر سونے کا بنا ہوا ہے‘‘۔

جونہی مجھے پکڑنے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا ۔ میں بیہوش ہوگئی ۔ جب ہوش آیا ۔ دیکھا کہ ندی کے کنارے گری پڑی ہوں ۔ میں شدید زخمی تھی ۔ مجھ سے ہلا نہیں جاتا تھا۔میرے ساتھی دوسرے چرواہے بچے جو ادھر ادھر اپنی اپنی بھیڑ بکریاں چرا رہے تھے ۔میرے اردگرد کھڑے تھے ۔انہوں نے مجھے اٹھایا اور گاؤں لے گئے ۔میرے والد نے ساری باتیں سنیں ۔انہوں نے فوراً ایک بکری کو ذبح کیا ۔وہ جاننا چاہتے تھے کہ کہیں ایسا پریوں کی وجہ سے تو نہیں ہوا۔

جب بکری ذبح ہوئی میں نے اس کا خون پینے کی خواہش ظاہر کی ۔میرے والد نے منع کیا۔ مگر جیسے میں پاگل ہو رہی تھی ۔میں نے اپنے بال نوچ ڈالے ۔

’’مجھے خون دو ۔مجھے یہ خون پلاؤ ۔میں پیاسی ہوں‘‘۔ میں چیخی ۔

میں نے سارا خون پی لیا جو میرے والد نے ایک برتن میں جمع کیا تھا۔ دس دن مجھ پر بیہوشی طاری رہی ۔اناج کی ایک کھیل بھی میرے اندر نہ گئی ۔اس دوران بہت سے جن اور پریاں جو تعداد میں سولہ تھے میرے پاس آتے رہے ۔ان کی ملکہ ہندو تھی ۔اس کے بالوں کا اپنا ایک انداز تھا ۔وہ میرے لئے بہت سی چیزیں لاتے ۔روٹی' پھل' مٹھائیاں لیکن کھانے کو کچھ نہ دیتے ۔

میں اگر سو رہی ہوتی وہ مجھے اٹھا لیتے اور رائی (ایک طرح کا رقص) کرنا سکھاتے ۔ انہوں نے مجھے ’’گنو‘‘ اور ’’دیبو‘‘ جیسے منتر سکھائے ۔

’’گنو‘‘

گنگ گنم ترا خانیۓ زولی گنم' زولی حارولی گم' یونیۓ گنولی گنم' پاییۓ پروتی

گنم؛ جن دو لوک گنم۔ میں باندھونگی میں باندھونگی؛ تارا خان (گلگت کا ایک حکمران) کی زولی کو۔ میں باندھوں گی زولی کی بیٹی جزولی کو۔ میں باندھوں گی گنولی کو۔

''دیبو''

متی متی ترا خا بیئے زولی موتی۔ زوئی ضرولی موتی وغیرہ وغیرہ

ترجمہ۔ میں تو کھولونگی میں کھولونگی ترا خان کی زولی کو۔ جزولی کی بیٹی جزولی کو۔

میں نے اسے ناٹی کرنے کے لئے کہا۔

''ارے ایسے تھوڑی کی جاتی ہے۔ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔''

''کچھ تھوڑا سا دکھلا دو۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ بڑی آس لگا کے آئے ہیں۔ میں بھی شاعرانہ موڈ میں تھی۔'' جونہی ڈاکٹر ہدایت علی نے میرے جذبات سے اسے آگاہ کیا۔

وہ انہی قدموں پر کھڑی ہوگئی۔ ایسا زبردست رقص کیا۔ کیا ناہید صدیقی کریں گی۔ میں تو عش عش کر اٹھی۔ دروازے پر لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔

جناب غلام محمد بتا رہے تھے کہ بڑے بوڑھے بزرگوں کا خیال ہے کہ وہ افراد جو دانیال بن جاتے ہیں انہیں پریاں اور جن اٹھا کر نانگا پربت، راکاپوشی اور حراموش کی چوٹیوں پر لے جاتے ہیں۔ انہیں وہاں رکھتے ہیں۔ آنے والے واقعات یہی جن اور پریاں انہیں بتاتے ہیں۔

گلگت کی علاقائی شاعری میں دانیال شاعری کا بھی مقام ہے۔ گو اس میں قافیہ اور ردیف وغیرہ کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ مگر چونکہ اس میں سچ کی جھلک ملتی تھی۔ اس لئے دانیال قسم کے لوگوں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔ کیونکہ جب یہ بھاگ جاتے تھے تو انہیں واپس لانا مشکل ہو جاتا تھا۔

کہتے ہیں علاقہ بگروٹ میں ایک دانیال ناچ رہا تھا۔ کسی طرح وہ بھاگ گیا۔ اور

باوجود کوشش بسیار کے نہ ملا۔ایک سال گزر گیا۔لوگ تقریباً اس بات کو بھول بھال گئے۔
اگلے سال ایک دوسرا دانیال ناچ رہا تھا۔فضا میں بانسری و ڈھول اور شہنائیوں کا شور تھا۔
دفعتاً لوگوں نے دیکھا کہ وہی گزشتہ سال والا دانیال جو غائب ہوگیا تھا بالکل ننگا 'حراموش کی
بلند ترین چوٹی سے نیچے دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔آناً فاناً وہ مجمع میں پہنچ گیا۔

''اس میں کس حد تک حقیقت ہے۔''میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہدایت علی مسکرائے اور بولے

''ففٹی ففٹی بھی ہوئی تو کافی ہے۔''

بہت سا شکریہ ادا کیا دانیال عورت کا۔ڈاکٹر ہدایت علی اور جناب غلام علی کا کہ
جن کے توسط سے میں مقامی ثقافت کے حامل ایک دلچسپ کردار سے ملی۔

میری شام گلگت بازار میں گزری۔مگر کتابوں کی خریداری میں۔

رات جناب راجی الرحمت نظر' گوہر علی اور ڈاکٹر حلیم کی اردو شاعری پڑھنے اور
سونے میں گزاری۔صبح روشن اور چمکدار تھی۔ایئرپورٹ پر جہازوں کی آمد و رفت کا
سلسلہ جاری تھا۔ٹیرس پر کھڑے میں نے گلگت پر الوداعی نظریں ڈالیں۔کہیں میری روح
سے آواز اٹھی تھی۔

تاابد مہکیں ترے سرو سمن　　　　یونہی اڑتا رہے چاند تارے کا یہ علم

میں کہیں بھی اجنبی نہیں تھی۔گھروں میں بازاروں میں' تفریح گاہوں میں'
میرے اپنے لوگ' میری اپنی جگہیں' خوبصورت رعنائی سے بھری ہوئیں۔

تاہم پھر بھی جیسے کوئی کہتا ہو:

Through pleasures and palaces though
We may roam there is nothing
Like home.sweet home-

میرا گھر
میرا اپنا گھر
میرے کل کا ایک جز۔

حرف آخر۔
15 جولائی 1986
سلمیٰ اعوان